

”میری طبیعت الٹ رہی ہے۔“

”کوئلے مٹکاؤ، تالیاں بجاؤ، اور ان لوگوں کو کوسو، جنہوں نے یہ سب کچھ ہے۔“ میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یار بہت بے درد انسان ہو۔ ہم برے لوگ ضرور ہیں، لیکن یہ بتائی بربادی۔“

”آؤ۔“ میں نے کہا اور ہم بستی کے یہ دردناک مناظر دیکھتے آگے بڑھتے رہے پھر ہم بستی سے باہر نکل آئے۔ یہاں لاتعداد پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ ان ٹیلوں میں غار کے دہانے نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک دم ہمارے قدم رک گئے۔ یہ ایک آوا تھی۔ غالباً کسی بچے کے رونے کی آواز۔



قاسم خان نے بھی یہ آواز سن لی تھی اور ادھر ادھر گردن گھما رہا تھا پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ یہ کسی بچے کے رونے کی آواز تھی۔“

”ہاں۔ تجھے قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے قاسم خان سے کہا۔

”لیکن بچہ۔ اوہو۔ یہ شاید پہاڑی غار ہیں، خدا کی پناہ ہم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے لیکن جو کچھ اب دیکھ رہے ہیں، اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

”فضول باتوں سے گریز کرو۔“

”یار تندور۔ تو بچ بچ ہر وقت جلا ہی رہتا ہے“ میں کہتا ہوں کبھی انسانوں کی طرح

بات بھی کیا کرو، میں تمہارا دوست ہوں۔“

”اے میرے پیارے دوست، کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تو اپنی چونچ بند رکھے؟“

”چلو ٹھیک ہے تم اپنی چونچ کھلی رکھو۔ میرے اوپر کیا فرق پڑتا ہے۔“ قاسم خان روٹھے ہوئے لہجے میں بولا اور مجھے ہنسی آ گئی، حالانکہ جن مناظر سے ہم گزر کر آئے تھے، انہیں دیکھنے کے بعد ہنسنے کی گنجائش بالکل نہیں تھی، ایک عجیب دکھن دل میں پیدا ہو رہی تھی، پھر ہم اس بچے کی تلاش میں ٹکاہیں دوڑانے لگے اور ہمیں بالکل نہیں پتہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ آواز بھی دوبارہ نہیں آئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی اچانک ہلکی سی آواز دوبارہ ابھری اور اس بار ہم نے اس کی سمت کا اندازہ لگا لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہمیں یہ احساس بھی ہوا تھا کہ جیسے کسی نے بچے کا منہ ایک دم دبا لیا ہو۔ قاسم خان نے انگلی سے اشارہ کیا اور ہم آہستہ سے اس پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے جس میں ایک غار کا دہانہ تھا اور اس دہانے کے اندر یقینی طور پر کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، قاسم خان نے کہا۔

”اور یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی ہمیں کہ یہاں جو بھی آکر چھپا

وہ اپنے حواس قائم کرتی چلی گئی۔ پھر اس نے ہمیں دیکھا اور غالباً اسے یہ احساس ہوا کہ ہمارے نقوش ان سے مختلف ہیں ویسے میں نے عورت کی صورت دیکھی تھی اور یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا کہ یہ کون سے علاقے کے نقوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان نقوش میں دلکشی تھی۔ ویسے ہم نے اس قبیلے میں کچھ لاشیں دیکھی تھیں، ان کے چہرے صاف ستھرے، رنگ گندمی اور نقوش تھیکے تھے۔ پتہ نہیں کون سی جگہ تھی یہ وادی سحر اور کہاں اس کا جائے وقوع تھا۔ عورت آہستہ آہستہ ہوش میں آتی چلی گئی، وہ ہمیں گھورتی رہی اس کی آنکھوں میں خون لہرا رہا تھا، میں نے آہستہ سے کہا۔

”اندر اور کوئی بھی ہے؟“

”کوئی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو تم ہمارے دشمن نہیں ہو دوست ہو۔ دوست ہو تم ہمارے؟“

”ہاں، ہم تمہارے دوست ہیں اور ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے بستی میں یہ تباہی مچائی ہے۔“

”تو پھر تم کون ہو؟“

”تم اس کی بالکل فکر نہ کرو، جو کوئی بھی ہیں کم از کم تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا اور آہستہ آہستہ وہ اعتدال پر آتی گئی، پھر اچانک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ پڑیں اور اس نے ہلکتے ہوئے کہا۔

”اندر میرا بچہ ہے، میرا بچہ ہے، باقی کوئی اور نہیں ہے اندر، صرف میں تھی اور میرا بچہ تھا۔ اب، اور اب یا تو مجھے قتل کر دیا مجھے پناہ دے دو۔ مجھے پناہ چاہئے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ تم ہماری پناہ میں ہو، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچنے دیں گے۔“ بمشکل تمام عورت کو ہم نے اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے اور اس کے بعد ہم اس کے بچے کو بھی باہر لے آئے، قاسم خان نے اس خوبصورت بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم یہ بتاؤ بہن کہ کیا تمہارے پاس اس کے کھانے پینے کا کوئی بندوبست ہے؟“

”بہن کے لفظ نے غالباً اسے مطمئن کر دیا تھا ویسے یہ انسانی زبان عجیب چیز ہوتی ہے،

ہے یہ ان میں سے ایک ہے، جن پر یوں ظلم کیا گیا ہے۔“

”اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی شخص مسلح بھی ہو اور ہمیں دشمن کا آدمی سمجھ کر حملہ کر دے۔“

”یار کبھی کبھی تو اتنی شاندار بات کر جاتا ہے کہ مجھے تیری عقل پر حیرت ہوتی ہے۔“

”قاسم خان میں نے تجھ سے کہا ہے کہ جب حالات سنسنی خیز ہوں تو زیادہ بکواس سے گریز کیا کر۔“

”تو نے تو مجھے اپنا غلام بنا رکھا ہے خیر یہی سہی۔ اب کیا کریں بول۔“

”ہم اسے آواز دیتے ہیں۔“ اور پھر میں نے زور سے چیخ کر کہا۔

”تم جو کوئی بھی ہو باہر نکل آؤ۔ ہم تمہارے دشمنوں میں سے نہیں ہیں ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ تم جو کوئی بھی ہو باہر نکل آؤ۔“ لیکن آواز نہ ابھری تھی، ویسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا ہمیں کہ اندر کوئی موجود ہے۔ ایک بار پھر میں نے وہی جملے دوبارہ دہرائے اور پھر اس کا جو رد عمل ہوا، واقعی اگر ہم اس کے لئے پہلے سے تیار نہ ہوتے تو یقینی طور پر ہمیں شدید نقصان اٹھانا پڑتا۔ وہ ایک نوجوان عورت تھی، مقامی لوگوں کا مخصوص لباس پہنے ہوئے، ہاتھ میں نیزہ لئے وہ ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ باہر نکلی تھی اور اس نے ہمارے رخ کا اندازہ لگاتے ہی نیزہ ہم پر کھینچ مارا تھا۔ میں اور قاسم خان دونوں بیٹھ گئے اور نیزہ ہمارے اوپر سے گزرتا ہوا دور چلا گیا، اس کے ساتھ ہی عورت ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ ہم پر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے، وہ بری طرح چیخ رہی تھی اپنا سر بری طرح میرے سینے پر مار رہی تھی، میں نے اس کی کلاہیوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم دوست ہیں، دشمن نہیں ہیں، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اپنے آپ کو قابو میں کرو۔ اگر ہم تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں تو دوستوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش تم خود بھی نہ کرو۔ اور اگر تم نے بہت زیادہ جدوجہد کی تو میں تمہیں گردن دیا کر بے ہوش کر دوں گا۔ ہوش میں آؤ۔ ہوش میں آؤ۔ ہوش میں آؤ۔“ میں نے عورت کو پوری قوت سے جھنجھوڑا اور آہستہ

زبان کی ایک جنبش انسان کو زندگی بخش دیتی ہے اور دوسری جنبش اسے موت، ہمکنار کر دیتی ہے۔ عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ جو کچھ بھی ہے بستی میں رہ گیا ہے۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ میں ادھر۔۔۔۔۔ ادھر نہیں
سکتی۔ میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی میرا پورا بھرا گھر تباہ کر دیا گیا۔“

”تم یہاں روکو شہباز میں وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر کے لاتا ہوں میں نے قاسم خان کو اس بات سے نہیں روکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد قاسم خان تھا۔“

سے دوڑتا ہوا آبادی کی طرف چلا گیا تھا۔ ویسے قاسم خان میں یہ خوبی تھی کہ اگر ہو
و حواس میں ہوتا تو ہر کام میں بڑی مستعدی دکھاتا اور اس وقت اس پر کوئی خوف

نہیں طاری ہوتا تھا، بہر حال تھوڑی دیر کے بعد قاسم خان واپس آیا تو کھانے پینے، کافی انبار ساتھ لایا تھا، بھری پری بستی تھی، غالباً وہ جو کوئی بھی تھے، صرف اس بستی

تاراج کرنا چاہتے تھے، لوٹ مار انہوں نے ممکن ہے کی ہو لیکن کوئی قیمتی چیز انہوں نے نہیں لوٹی تھی، غرضیکہ ہم لوگ اس عورت کو سمجھانے بھگانے میں کامیاب ہو گئے،^{۱۱}

کا نام رعایہ تھا اور پھر رعایہ نے ہمیں ایک دردناک کہانی سنائی، لیکن کہانی سننے۔ پہلے ہم اسے اس کے بچے کے ساتھ بہت دور لے آئے تھے، یہ بات ہم نے اس۔

بعد کی تھی، جب اس نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر اس کا باپ، اور اس کے شوہر کا باپ سب قتل ہو چکے ہیں، وہ صرف اپنے گھر میں تنہا بچی ہے، باقی اور اس بستی میں اس

کوئی بھی نہیں ہے، ہم رعایہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے آگے آگئے، اور پھر ا فاصلہ طے کرنے کے بعد انتہائی احتیاط کے ساتھ ہم نے ایک مزید پہاڑی غار میں ق

کیا تھا، قاسم خان نے عقلمندی سے کام لے کر کھانے پینے کی بے شمار اشیاء اپنے ہاں جمع کر لی تھیں اور ایک پوری گٹھری باندھ کر لے آیا تھا، اس گٹھری سے اس -

کھانے پینے کی اشیاء نکالیں اور بمشکل تمام ہم نے عورت کو اس بات پر راضی کیا کہ کچھ کھائی لے۔ کھانے پینے سے اس کے بدن میں جان آئی۔ ادھر ہم لوگوں نے!

کھا پی کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا تھا، اسکے بعد رعایہ نے ہمیں اپنی بقیہ کمائی سنائی تھی^۱ وقت رات ہو چکی تھی اور تاحد نظر سناتا پھیلا ہوا تھا، ہمارے کان آہٹوں پر لگے ہو۔

تھے۔ میں نے رعایہ سے پوچھا۔

"

کوئی بھی نہیں ہے، ہم رعایہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے آگے آگئے، اور پھر کھانہ فاصلہ طے کرنے کے بعد انتہائی احتیاط کے ساتھ ہم نے ایک مزید پہاڑی غار میں قیام کیا۔

کیا تھا، قاسم خان نے عقلندی سے کام لے کر کھانے پینے کی بے شمار اشیاء اپنے ہاں جمع کر لی تھیں اور ایک پوری گٹھری باندھ کر لے آیا تھا، اس گٹھری سے اس -

کھانے پینے کی اشیاء نکالیں اور بمشکل تمام ہم نے عورت کو اس بات پر راضی کیا کہ کچھ کھا پی لے۔ کھانے پینے سے اس کے بدن میں جان آئی۔ ادھر ہم لوگوں نے؟

کھاپی کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا تھا، اسکے بعد رعایہ نے ہمیں اپنی بقیہ کمائی سنائی تھی،^۱ وقت رات ہو چکی تھی اور تاحد نظر سناتا پھیلا ہوا تھا، ہمارے کان آہٹوں پر لگے ہو۔

تھے۔ میں نے رعایہ سے یو چھا۔

ماتا رہا، پھر میں نے ہنس کر کہا۔

”قاسم خاں“

”ہوں۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔“

تھے۔ میں نے رعایہ سے پوچھا۔

”یہ وادی سحر ہے۔“
 ”ہاں۔“
 ”یعنی جادو کی وادی۔“
 ”بالکل۔“

”کیا اس وادی میں خیالات کا تبدیل ہو جانا ممکن ہے؟“
 ”کیا مطلب؟“

”ہم لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی گہری باتیں سوچی ہیں؟“
 ”کبھی نہیں۔“ قاسم خان بھی مسکرا دیا۔
 ”لیکن اب سوچ رہے ہیں۔“
 ”تو کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں؟“ قاسم خان نے کہا۔
 ”نہیں۔“

”ایک نیگیٹو، ایک پوزیٹو۔ نیگیٹو راستے میں خطرات ہیں اور پوزیٹو میں بھی خطرات ہیں، نیگیٹو راستے میں یہ خطرات ہیں کہ پولیس سے مقابلہ ہو جائے کسی کو قتل کرتے ہوئے خود بھی قتل ہو جاؤ یا کوئی اور حادثہ پیش آ جائے، لیکن پوزیٹو راستے بھی ان خطرات سے خالی نہیں ہیں۔“
 ”وہ کیسے؟“

”بیماریاں، بھوک، بے روزگاری، افلاس، تنگ دستی۔ یہ تمام چیزیں مل کر زندگی کو کھا جاتی ہیں، بس بہت مشکل ہے فیصلہ کرنا۔“
 ”ٹھیک کہتے ہو۔“ قاسم خان نے گردن ہلائی۔
 ”تم کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم دولت کے حصول کے لئے سرگرداں رہے ہیں۔“
 ”قاسم خان میں تمہیں دل کی بات بتاتا ہوں، دولت میرے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی ہے۔“
 ”کیا واقعی؟“
 ”ہاں۔“

”لیکن خواہش مند تو ضرور ہو گے کہ تمہارے پاس دولت ہو، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو تم۔“
 ”ہاں، اس سے کس احمق کو انکار ہے۔“

”یہ جلی ہوئی بستی، بے گور و کفن پڑی ہوئی لاشیں، یہ معصوم بچہ جس کی ہلاکت اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی، یہ دونوں اسی غار میں دم توڑ دیتے، اب اس کا کلام بھی نہیں ہے، اس دنیا میں کیا زندگی اتنی ہی معمولی سی چیز ہے۔“

”وہ تو ہے۔“
 ”تم نے پہلے کبھی اس بارے میں سوچا تھا؟“
 ”بہت کم۔“
 ”یعنی سوچا تھا۔“

”ہاں۔“
 ”کیا سوچا تھا مجھے بتاؤ؟“

”یہ قاسم خان کے ہم جو کام کر رہے ہیں اس میں عیش و عشرت بھی ہے، حکمران

”میرا بھی بس اتنا ہی مطلب ہے لیکن یہاں آنے کے بعد نجانے کیوں دل سے یہ احساس مٹا جا رہا ہے۔“ میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش ہونے کے بعد قاسم خان نے کہا۔

”لیکن اس کے باوجود تم دیکھو کہ یہ ایک نئی دنیا ہے، ہماری دنیا سے بالکل مختلف، پتہ نہیں بوڑھا لٹکونا کیا چاہتا ہے اور یہاں بھیجے سے اس کا کیا مقصد ہے۔“ اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی، تھوڑی دیر کے بعد عورت کی آواز سنائی دی۔

”بھائی بچہ سو چکا ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں یا تم اگر چاہو.....“ قاسم خان نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہم آ رہے ہیں تمہارے پاس۔“ میں نے قاسم خان کے بگڑے ہوئے موڈ کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔ ”کیا ہو گیا“

”اس نے ایک بہت برا لفظ استعمال کیا ہے۔“

”عورت نے؟“

”ہاں۔“

”کیا؟“

”بھائی کہا ہے اس نے ہمیں۔“

”تو پھر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، شاید میرے اور تمہارے ذہن میں یہی فرق ہے شہباز، شاید میں اس پوری دنیا کا اتنا برا انسان نہیں بن سکا ہوں، جب کوئی کسی کو بھائی کہہ دیتا ہے، خاص طور سے ایک بے بس اور مجبور لڑکی، تو بھائی کے شانوں پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے ان سے گریز بہت مشکل ہو جاتا ہے، بہت ہی مشکل۔“

میں نے حیرت سے قاسم خان کو دیکھا بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ہر شخصیت کے دو روپ ہوتے ہیں، لیکن اس وقت ہم اس پر غور کرنے کے

لئے نہیں آئے تھے۔ ہم عورت کے پاس پہنچ گئے، اس نے کہا۔

”بچہ سو چکا تھا، میں نے سوچا کہ تم لوگ انتظار کر رہے ہو گے۔“

”تم ہمیں بتاؤ یہ سارا قصہ کیا ہے، کیا ہوا ہے یہ؟“

”میں زیادہ تفصیل تو کیا بتاؤں، بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا براہ راست مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ صرف سنی باتیں ہیں اور انہی سنی سنائی باتوں کو میں تمہارے سامنے دہرا سکتی ہوں۔“

”ہاں، ہاں جو کچھ بھی ہے ہمیں کام کی بات بتاؤ، کام کی بات بتاؤ۔“ قاسم خان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

لڑکی کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئی تھیں، اس نے کہا۔

”ہاں بات بہت پرانی ہے، بہت پرانی، جس تاراج بستی کو تم نے دیکھا ہے، کیا تم اس کا نام جانتے ہو؟“

”نہیں۔“

”اس کا نام ہمولیہ تھا۔“

”ٹھیک آگے بڑھو۔“

”ہمولیہ پر ایک شخص حکومت کرتا تھا اس کا نام اگستا تھا، اگستا کے خلاف بغاوت ہو گئی اور اگستا اور اس کے اہل خاندان کو قتل کر دیا گیا، صرف اگستا کا بیٹا بھا۔۔۔ زندہ بچا، جو کچھ افراد کو ساتھ لے کر پہاڑیوں میں گم ہو گیا اور اس کے بعد بستی ہمولیہ پر زوران کی حکومت قائم ہو گئی، زوران فطرتاً زراعت پیشہ تھا اور اسے صرف اس بات پر غصہ تھا کہ اگستا نے بستی ہمولیہ کو فاقہ کشی پر مجبور کر دیا ہے وہ نہ خود کچھ کرتا ہے اور نہ کسی اور کو کچھ کرنے دیتا ہے، چنانچہ اس نے کام شروع کر دیا اور ہمولیہ کے نواحی علاقوں میں جہاں پتھر ملی اور بنجر زمین پڑی ہوئی تھی، زوران نے تمام نوجوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو زمین کی کھدائی میں مصروف کر دیا۔ پھر اس زمین میں دور دراز سے لائی ہوئی مٹی شامل کر کے اسے قابل کاشت بنایا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمولیہ کے چاروں طرف کا علاقہ سرسبز ہو گیا، یہاں باغات لگائے گئے اور اس علاقے پر ایسا نکھار آیا کہ ہر طرف سبزہ زار لہرانے لگے، کھیت، باغات، ترکاریوں کے بڑے بڑے قطع، یہ بستی

”میری بستی کے لوگو! اس لڑکے کو پہچانتے ہو؟ یہ ہبا ہے، اگستا کا بیٹا ہبا، یہ وہ لڑکا ہے جو اگستا کی موت کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا میری بستی کے پانچ معزز بوڑھے سامنے آئیں اور مجھے مشورہ دیں، ہبا سے پوچھیں یہ کیوں مسلح افراد کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں اس بستی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر یہ جواب نہ دے تو جواب میرے پاس ہے اور جواب یہ ہے کہ یہ مجھے اور میرے اہل خاندان کو قتل کر کے بستی کی سرداری حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

پانچ معزز بوڑھے سامنے آئے اور انہوں نے ہبا سے سوال کیا۔
 ”اے لڑکے کیا یہ سچ ہے جو سردار زوران کہہ رہا ہے؟“ ہبا نے نفرت بھری نگاہوں سے زوران کو دیکھا اور پھر بے باکی سے بولا۔
 ”ہاں! یہ سچ ہے۔“

”یہ افراد جو تیرے ساتھ آئے تھے ان کی تعداد کتنی تھی؟“
 ”میرے علاوہ انتیس، مجھے ملا کرتیں۔“
 ”کیا یہ سب مسلح تھے؟“

”ہاں، ان کے پاس ہندوقیں تھیں اور یہ پوری ہمولیہ کو آگ اور خون میں لپیٹ دینا چاہتے تھے۔“
 ”کیوں؟“

”زوران سے انتقام لینے کے لئے۔“
 ”اس کے بعد تو کیا کرتا؟“

”اس کے بعد میں صبح کو زوران اور اس کے اہل خاندان کے سر اس بستی کے سرحدی علاقے میں لٹکا دیتا اور میرے آدمی پوری بستی کو محاصرے میں لے لیتے، پھر میں ان لوگوں کو ختم کرتا جنہوں نے اس وقت جب وہ میرے باپ کے غدار تھے، زوران کی مدد کی تھی۔“

”اس کے بعد تو کیا کرتا؟“

”اس کے بعد میں ساری بستی کو لوٹ لیتا، ان کا سارا خزانہ چھین لیتا اور پھر میرے یہ آدمی بستی پر حکمرانی کرتے، لوگوں کو ایک ایک روٹی کے لئے ترسلیا جاتا۔“

قدرت کی دولت سے مالا مال ہو گئی ہر گھر میں خوراک کی قلت ختم ہو گئی، مویشیوں کے لئے چراگاہیں تیار ہو گئیں اور دودھ اور ادن کی ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زوران کی حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گی اور ہمولیہ کے محنت کش اپنی محنت کا پھل پانے لگے، ہر شخص خوش تھا، ہر ایک کو سہولتیں حاصل تھیں اور سب زوران کے گن گانے لگے تھے، لیکن زوران نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ ہبا اس کے قبضے میں نہیں آسکا ہے وہ نکل گیا ہے، چونکہ زوران یہاں کا ہر دل عزیز سردار تھا اس لئے ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اگستا کا بیٹا ہبا، راتوں رات اس پر شب خون مار کر اس کے اہل خاندان کو قتل کر دینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان کا بدلہ لینے کا خواہش مند ہے، زوران جہاں زراعت پیشہ تھا وہیں تمام تر معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے ہوشیاری بھی حاصل کر لی تھی، سرداری کرنا آسان کام نہیں ہوتا، چنانچہ رات کو جب پوری بستی سوئی ہوئی تھی، تیس گھوڑے بستی ہمولیہ کی سرحدوں سے اندر داخل ہوئے۔ سوئی ہوئی بستی پر حملہ کر کے ہبا زوران کو قتل کر دینا چاہتا تھا اور اس کے بعد ہمولیہ پر اپنی سرداری کا اعلان، لیکن سرحد سے کافی دور بڑے پہاڑی ٹیلوں کے درے میں زوران کے پوشیدہ افراد نے ان کا استقبال کیا اور ان کی ہندوقیں جو چلنے بھی نہیں پائی تھیں ان سے جدا ہو گئیں، آٹھ افراد گرفتار ہوئے، باقی بائیس افراد وہیں ڈھیر ہو گئے، گرفتار ہونے والوں میں ہبا بھی تھا، ہندوقوں کی آواز نے سوئی ہوئی بستی کو جگا دیا تھا اور سب حیران تھے کہ سردار زوران کی آواز ابھری۔

”بستی والو یہ سونے کا وقت نہیں ہے اپنے گھر روشن کر لو، سونے والے سب کچھ کھو دیتے ہیں، جاگو جاگتے رہو، یہ جاگنے کے لمحات ہیں اور پھر بستی والے جاگ گئے اور صبح کے سورج نے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہبا اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا، ہبا کی گردن جھکی ہوئی تھی جس وقت اس کا باپ قتل ہوا تھا اور وہ فرار ہوا تھا تو ہبا کی عمر زیادہ نہیں تھی، اب وہ ایک بھرپور نوجوان تھا اور اس کے انگ انگ سے جوانی نکلتی تھی۔ بڑے چوک میں کھڑا ہوا تھا اور سردار زوران نے ساری بستی کو جمع ہونے کا حکم دیا تھا جب بستی جمع ہو گئی تو سردار زوران نے بستی کے لوگوں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔

”کیا کہہ رہا ہے تو سردار زوران؟“ بوڑھوں میں سے ایک نے کہا۔

”ہم تم نے دیکھا کیا کڑیل جوان ہے، جوانی اس کے انگ انگ سے نپک رہی ہے، کتا بے باک اور جواں مرد ہے یہ، کتنی دلیری سے اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے اور اپنے آگے کے مقاصد بتائے ہیں، میرے معزز بوڑھو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو، اتنا ہلوار جوان اگر ہماری بستی کا وفادار ہو تو کیا ہم اسے اپنی فوجوں کا سالار نہیں بنا سکتے، میں سردار ہوں تم لوگوں نے مجھے اتنا حق دیا ہے کہ کبھی کبھی میں تمہارے فیصلوں سے اختلاف کر سکوں بولو کیا تم مجھے اس اختلاف کی اجازت دو گے؟“

”لیکن زوران، یہ اختلاف تیرے لئے خطرناک ہے۔“

”زندگی اور موت دیوتاؤں کے فیصلے کی محتاج ہوتی ہے، ہم اپنے لئے کوئی راستہ طے نہیں کر پاتے، دوستو، معزز بزرگوں میں تمہارے فیصلے سے بس اتنا سا اختلاف کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہبا کو سزائے موت نہ دی جائے بلکہ انتظار کیا جائے، اسے سمجھایا جائے اور کہا جائے کہ وہ ہمولیہ کا وفادار بن کر جیئے، دیکھو بستی والو انہیں قتل کر دینا بہت آسان ہے لیکن اگر تم کسی کو زندگی دینے کی اہلیت رکھتے ہو تو اپنا فرض پورا کرو، میں یہی فرض پورا کرتے ہوئے فی الحال انہیں قید خانے میں پہنچا رہا ہوں، اس کے بعد میں کوشش کروں گا کہ انہیں سمجھا سکوں۔ ایک اعلان اور میں تمہارے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔“ سردار زوران نے کہا۔

”میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور اگر پہاڑی قبیلے کے اصولوں کے مطابق میں اپنے لوگوں میں ایک پسندیدہ شخصیت کا حامل رہا ہوں تو سرداری میرے کسی بیٹے کو ملے گی اور اس کے لئے میرا بڑا بیٹا حقدار ہے لیکن دوستو یہ سرداری میں نے ہبا کے باپ اگستا سے حاصل کی ہے اس کی برائیوں اور بدعنوانیوں کے نتیجے میں اگر ہبا ایک اچھا انسان بن جاتا ہے اگر وہ ہمولیہ کے لئے وہی سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے جو بستی کے اچھے لوگ کیا کرتے ہیں تو آج میں آپ کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں یہ سرداری اپنے بیٹوں کے بجائے ہبا کو دوں گا، میرا ہبا سے یہ وعدہ ہے۔“ چنانچہ بستی والوں کی گردنیں لٹک گئیں، سردار نے اپنے حق کو استعمال کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا تھا اس لئے اب کسی کے بولنے کی گنجائش نہیں تھی اور ہبا کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ

”ایسا تو کیوں کرنا چاہتا تھا؟“

”اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لئے، اپنی ماں اور اپنے اہل خاندان کی موت کا انتقام لینے کے لئے۔“

”لیکن تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”ہاں۔“

”اب تیرے ذہن میں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”صرف یہ کہ جب کامیابی کی امید نہ رہے تو انسان کو حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہئے اب یہ شخص جو کچھ بھی کرنا چاہے۔“ ہبا نے جس انداز میں ان تمام سوالات کے جواب دیئے تھے اس نے بستی کے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا، وہ حیران تھے اور پریشانی کے عالم میں سردار زوران کو دیکھ رہے تھے، بستی کے بوڑھوں نے سردار زوران سے کہا۔

”یہ آٹھ افراد بھی خطرناک ہیں زوران، تم نے ان کا ارادہ دیکھ لیا، اب بھلا بستی میں کون ہے جو ان کا ہمدرد ہو، انہیں فوری طور پر سزائے موت دی جائے۔“

سردار زوران نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔

”معزز بزرگوں تم نے ایک بات کہی ہے۔“

”کیا؟“

”تم نے کہا ہے کہ اس وقت اس بستی میں ان کا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔“

”ہاں۔ پوری بستی والوں سے پوچھ، کیا ایسا کوئی ہے جو ان تمام باتوں کو سننے کے

بعد ان سے ہمدردی رکھتا ہو۔“

”ہاں ہے۔“ سردار زوران نے کہا۔

”کون؟“

”میں۔“ زوران بولا۔ اور بستی کے لوگ شدت حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے تھے۔

نے کہا۔

”تو اپنے باپ کو ایک مقدس انسان سمجھاتا ہے ہبا! یہ وہ شخص تھا جس نے پوری بستی کو موت کی نیند سلانا چاہا تھا! سردار زوران! اسے اسی وقت سزائے موت دے دو! ورنہ تم یہ سمجھ لو کہ تم اپنے لئے ایک سانپ پالو گے! یہ شخص برے باپ کا برا بیٹا ہے! اسے زندگی دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم نے بستی کے لئے موت قبول کر لی ہے۔“

سردار زوران سوچ میں ڈوبا رہا اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر اس نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں! میں اسے قتل نہیں کروں گا! مجھے خوف نہیں ہے اس سے! ہاں آخری فیصلہ میں یہ کر رہا ہوں کہ ہبا اپنے آٹھ ساتھیوں کو لے کر ہولیہ سے اتنا دور نکل جائے کہ ہواؤں کے ساتھ اس کی خوشبو ہولیہ تک نہ پہنچ سکے اور یہ بات بھی ہبا کو بتائی جا رہی ہے کہ اگر دوبارہ کبھی اس کے قدم بستی ہولیہ کی جانب اٹھے تو اسے زندگی نہیں دی جائے گی پھر ہولیہ کی سرحدوں پر اس کا سر لٹکا ہو گا! گھوڑے مہیا کرو ان لوگوں کو ہاتھ باندھ کر یہاں سے روانہ کر دو۔“

اور پھر یوں ہوا کہ آٹھ گھوڑے لائے گئے! ہبا کو گھوڑے کی پشت پر بٹھایا گیا اور اس کے بعد ان گھوڑوں کو چابک مار دیئے گئے! آٹھ گھوڑے ہولیہ کی سرحدوں سے مخالف سمت دوڑنے لگے۔



قید خانے میں پہنچا دیا گیا! البتہ زوران نے قید خانے پر محافظوں کی تعداد بڑھاتے ہوئے ہبا سے کہا تھا۔

”اور ہبا! یہ بات میں تجھے بتائے دے رہا ہوں کہ اگر اس کے دوران تم نے کوئی خطرناک قدم اٹھانے کی کوشش کی تو پھر میں تیری زندگی نہیں بچا سکوں گا۔“ ہبا نے اسے نفرت سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ سردار زوران ہبا کو مستقل طور پر سمجھانے لگا! اس نے کچھ بزرگوں کو اس بات پر متعین کیا کہ وہ ہبا کو سمجھائیں اور پھر ان لوگوں نے زوران سے کہا کہ ہبا مکمل طور پر خاموش رہتا ہے! وہ کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا! یہاں تک کہ اکیس دن کے بعد سردار زوران نے وعدے کے مطابق ہبا اور اس کے ساتھیوں کو میدان میں طلب کیا اور سردار زوران نے تمام لوگوں کو جمع کرنے کے بعد ہبا سے ایک سوال کیا۔

”ہبا اس دوران بڑے بڑے بزرگ تمہیں سمجھاتے رہے ہیں! میں نے بھی تجھے زندگی کے سچائی کے راسخ دکھائے ہیں اب بول! بتا! کیا تو ہمارے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کے لئے تیار ہے؟“ تو ہبا نے کہا۔

”بستی والو! سردار زوران! تو میرے باپ کا قاتل ہے! تو میرے گھرانے کا قاتل ہے! سن میں تیری تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس کے لئے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بستی والوں کو بھی معاف کر دوں گا! لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے سردار زوران!“

”کیا؟“ زوران نے پوچھا۔

”مجھے تیرا اور تیرے اہل خاندان کا سر چاہئے! تجھے معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کے خون کو معاف کر دیا ہے اور میں نے ایسا نہیں کیا! میں تجھے اور تیرے خاندان کو اسی طریقے سے قتل کرنے کا خواہش مند ہوں! جس طرح تو نے میرے خاندان کو قتل کیا تھا اور اس خون کو میں بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوں! خون کا بدلہ خون بس! یہی میرا اصول ہے اور یہی میرا ایمان۔“

بستی کے لوگ بھڑکے ہر شخص نے کچھ نہ کچھ کننا شروع کر دیا ان میں سے کسی

اس خونیں رات کی صبح رات کی تاریکیوں سے زیادہ تاریک تھی۔ چاروں طرف سے آہ و زاری کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور آہن پوش پوری بستی میں پھیل گئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے، کھل سے آئے تھے اب تک کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ خذ سردار کو بھی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا تھا۔

آہنی لباس والوں نے بستی کے تمام افراد کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا، ان لوگوں کی حالت بے حد ابتر تھی، اور تمام لوگ اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کی موت پر گریہ و زاری کر رہے تھے۔ ان تمام لوگوں کے بھی ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ غرضیکہ ایک ایسی عبرت ناک فضا تھی کہ اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

پھر ان آہن پوشوں کا سردار سامنے آیا اور اس نے اپنا تعارف ہبا کے نام سے کرایا۔ مجمعے میں کئی ایک لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ہبا کے خلاف رائے دی تھی کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بہر حال ہبا ایک اونچی جگہ پر چڑھ گیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”پہچانو مجھے! ہولیہ کے کتو، مجھے پہچانو، میں کون ہوں، ہبا ہوں میں سمجھے، میں وہ ہوں جسے تم لوگوں نے بستی بدر کیا تھا۔ آج میں اپنی تمام قوتوں کے ساتھ واپس آیا ہوں اور آج میں زوران سے اپنا بدلہ لوں گا، اور سناپ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بستی کے کسی گھر سے رونے کی آواز نہ ابھرے، اگر کسی گھر سے بھی آہ و بکا سنائی دی تو پورے گھر کو فنا کر دیا جائے گا۔“ ابھی ہبا نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زخمی بچہ شدت تکلیف سے رو پڑا اور جانتے ہو ہبا نے اس کے ساتھ کیا کیا۔“ دعائیا نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور میں اور قاسم خان اس کی صورت دیکھنے لگے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد دعائیا نے آنکھیں کھولیں جن میں نمی تیر رہی تھی، وہ پھر گویا ہوئی۔

”ہبا نے اس بچے کو مجمعے کے درمیان بلا کر اپنی بندوق سے پے در پے فاز کئے اور نتیجے میں اس بچے کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ یہ منظر پورے مجمعے کے لئے ناقابل برداشت تھا، لیکن سب کے سب اس لئے خاموش تھے کہ کہیں ہبا کی اٹلی گولی ان کے سینوں کے پار نہ ہو، پھر بستی کے گرد پہرہ بٹھا دیا گیا اور لوگوں کے ہاتھ پیر کھول کر بستی میں چھوڑ دیا گیا۔ لوگ زور سے سانس لینا بھی بھول گئے تھے۔ ہر شخص

پھر کافی عرصہ گزر گیا، بستی کے لوگ ہبا کو بھول گئے تھے کسی کو یہ یاد نہیں تھا کہ ہبا نامی کسی شخص نے زوران کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور زوران نے بے شک اگاستا اور اس کے خاندان کو قتل کر کے سرداری حاصل کی تھی، لیکن اس نے بستی والوں کے لئے بہت کچھ کیا اور یہی وجہ تھی کہ بستی والے اپنے سردار سے بے انتہا خوش تھے اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ پھر ایک رات جب تمام لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے بیرونی ماحول میں برف کے ننھے ننھے ذرات سیاہی میں سفیدی پیدا کر رہے تھے کہ بستی کی سرحدوں میں کچھ آہن پوش داخل ہوئے جو م سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے اور ان کے پاس بہترین ہندوقیں تھیں۔ فاز کی پہلی آواز پر زوران جاگ اٹھا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ وہ کون ہے جس نے سوتے ہوؤں کو جگانے کی کوشش کی ہے جبکہ بستی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ بے جا فائرنگ کی جائے اور عام لوگوں کو پریشان کیا جائے۔

بہر حال تین چار لوگ اس طرف روانہ کئے گئے جہاں سے فاز کی آواز ابھری تھی۔ وہ لوگ واپس تو نہ آئے البتہ فائرنگ کی آوازیں اور چیخیں ضرور سنائی دلی تھیں۔ اور اس کے بعد یہ چیخیں چاروں طرف گونجنے لگیں۔

پوری بستی جاگ گئی تھی اور ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہونے لگا تھا۔ جس میں فائرنگ کی آواز بھی شامل تھی۔ آہن پوشوں کے خلاف بھی کچھ ہندوقیں استعمال ہوئیں، سردار کے آدمی چاروں طرف پھیل گئے تھے، لیکن آہن پوش اس طرح لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے کہ گولیاں ان پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ البتہ ان کی طرف سے چلائی جانے والی گولیاں ہر شخص کو زندگی سے محروم کر دیتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی وقت میں مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک بھی زندہ باقی نہ رہا۔ اور بستی میں جگہ جگہ انسانی لاشیں نظر آنے لگیں۔

والے جاگ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا وہ وہیں تک محدود نہیں رہے گا۔
پتہ نہیں ظالم ہبا اور کون کونسے احکامات صادر کرے گا اور ان لوگوں پر کیا کیا مصیبتیں
نہیں گی۔

جو لوگ گرفتار ہو چکے تھے وہ بستی کے دانشور تھے وہی کوئی مشورہ بھی دے سکتے
تھے لیکن اب مشورے دینے والا بھی کوئی نہیں تھا اور پھر بستی کے مکانات میں نقل و
حرکت پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ لوگ اپنی مرضی سے دروازوں سے گزر کر نہیں جا
سکتے تھے۔ آہن پوش جگہ جگہ ان کی نگرانی کر رہے تھے۔

پوری بستی میں اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔ ہبا نے انہیں ہر طرح سے پس دیا تھا
اور اب وہ صرف اپنی موت کے منتظر تھے۔ پھر بستی میں جانے کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔
انہوں نے میرے شوہر کو بھی مار دیا تھا۔ اور میں صرف اپنے بچے کی حفاظت کے لئے
کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آئی اور اپنے بچے کے ساتھ ان غاروں میں آکر چھپ
گئی۔ اور پھر پھر تم لوگ یہاں پہنچ گئے اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ لڑکی کچھ دیر
کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔

واقعی یہ ایک کرب ناک اور عبرتناک داستان تھی۔ میں اور قاسم خان بے شک
بزم تھے، لیکن پھر بھی اس عورت کی داستان سن کر نجانے کیوں ایک دکھ کا سا احساس
ہوا تھا اور دل نے یہ کہا تھا کہ ہمیں ضرور اس عورت کی مدد کرنی چاہئے۔ لیکن سوال
یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی مدد کس طرح کی جائے۔ بہر حال میں نے کہا۔

”اور لڑکی کیا تم یہ جاننا چاہو گی کہ اس بستی کا کیا ہوا؟“

”ہاں بے شک، کیونکہ میرے ماں باپ بھی وہیں تھے۔“

”ہمیں افسوس ہے، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے، بستی کا ہر گھر جلا ہوا پڑا ہے،
بستی کے مکینوں کی لاشیں بستی کی گلیوں میں بکھری پڑی ہیں اور اب وہاں کچھ بھی نہیں
بچا۔“ میرے ان الفاظ کو سن کر لڑکی پر ایک دم سختہ سا طاری ہو گیا تھا۔ اور ہم دونوں
گہرا کر اس کی صورت دیکھنے لگے، لیکن پھر وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی
تھی اور کئی دیر تک روتی رہی تھی۔ ہم دونوں یونہی اپنی جگہ بیٹھے رہے تھے۔

پھر قاسم خان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا اور اس کے کندھے

سہا دیکا بیٹھا تھا اور کسی بچے کی آواز ابھرتی تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جاتا۔ پھر دوسرا
حکم جاری ہوا۔

بستی کے کسی گھر میں چراغ نہ جلایا جائے، ہبا کی آمد کا استقبال تاریکیوں سے کیا
جائے کہ اب اس کے مخالفوں کی تقدیر میں تاریکی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔
”سو یہی ہوا، آج تیسرا دن تھا کہ بستی کے کسی گھر میں روشنی نہیں کی گئی تھی،
لیکن ہبا کے احکامات بدستور جاری تھے۔ دو دن تک وہ بستی میں ان لوگوں کو تلاش
کرتا رہا جو اس کے بستی بدر کئے جانے کے دور کے لوگ تھے اور اب ان لوگوں کو
ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا انہی میں سردار زور ان بھی تھا۔ اب بھلا کس کی مجال تھی کہ
ہبا کے خلاف ہتھیار اٹھاتا، پھر اس کا تیسرا حکم ملا۔

”تمام لوگ اپنے اپنے مال و دولت کے انبار میدان میں ایک جگہ جمع کر دیں اور
خبردار اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ کسی کے پاس کوئی قیمتی شے موجود نہ رہے
اجناس وغیرہ کے ذخائر بھی وہیں میدان میں جمع کر دیئے جائیں اور ہر وہ شے جو کسی کی
ملکیت تھی اب ہبا کی ملکیت میں دے دی جائے کہ جسم کے کپڑوں کے علاوہ کسی کے
پاس کچھ باقی نہ رہے اگر اس حکم کی پورے طور سے تعمیل نہ ہوئی اور کسی نے کچھ
چھپانے کی کوشش کی تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ ہمارا غدار ہے اور بستی ہمولیہ والے
غدار کی سزا سے بخوبی واقف ہیں۔“

پورا دن اس حکم کی تعمیل میں گزر گیا۔ میدان میں، ڈھیروں انبار لگ گئے تھے
ہمولیہ والوں کے پاس بہت کچھ تھا، کون جانے ہبا کا کوئی نیا حکم ان کی موت کا پروانہ
ہی ہو۔ سب کے سب ہوئے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچارے کھانا پیانا
بول گئے تھے، بس بچوں کی شکم سیری کے لئے جو کچھ بھی مل رہا تھا وہ اپنے بچوں کے
حلق سے پیچے مار رہے تھے۔ باقی کسی کے منہ میں کوئی چیز نہیں گئی تھی۔ اور
صرف پانی پ رہے تھے۔ اس طرح شاید ہبا ان لوگوں سے اپنے بستی

کئے جانے کا انتقام لے رہا تھا اور یوں یہ بستی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔
میدان میں جمع ہونے والی اشیاء کی چھان بین ہو رہی تھی اور اس کی گہرا
— والا ہبا خود کر رہا تھا۔ ادھر وہ اپنے کلموں میں مصروف تھا اور ادھر

پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”بس کو لڑکی! یہ تو ہونا ہی تھا اور اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا، لیکن اب اس جس مقصد کے لئے جی رہی ہو وہ پورا کو یعنی اپنے بچے کی پرورش، ظاہر ہے تم اپنے بچے کی وجہ سے وہاں سے بھاگی تھیں اور اب تمہیں اس بچے کے لئے جینا ہے۔ اس طرح ان عاروں میں تم کیسے جینو گی۔“ لڑکی نے ان الفاظ کو سن کر اپنا سراٹھایا اور پہلے قاسم خان کو پھر مجھے دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو بھائی، واقعی اب مجھے اس بچے کے لئے جینا ہے۔ میں اپنا کچھ، سب کچھ اس بچے پر لٹا دوں گی، اس کی پرورش کروں گی، اب یہی میرے جیے مقصد ہے۔“

”لیکن اس طرح ان عاروں میں؟“ میں نے کہا۔

”نہیں، ہم ان عاروں میں نہیں رہیں گے۔ ان عاروں سے نکل کر کچھ دور نکلیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ گھنے جنگلوں پر ختم ہوتا ہے اور جنگلوں کی غلغلہ سمیت ایک بستی آباد ہے جسے درینہ بستی کہتے ہیں۔ تم دونوں مجھے وہاں تک چلو گے، اور اگر تم نے ایسا کیا تو یہ میرے اوپر ایک بہت بڑا احسان ہو گا۔“ لڑکی خاموش ہو گئی تھی اور اب اس بات کی منتظر تھی کہ ہم اس سلسلے میں اس سے کیا ہیں۔ قاسم خان میری طرف پلٹا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ زندگی میں لاتعداد جرم کئے تھے، برائیاں کی تھیں اور مختلف چکروں سے گزرتے ہوئے یہاں آ پھنسے تھے، لیکن بہر حال دل میں یہی خیال تھا کہ اس مظلوم لڑکی کا ضرور کرنی چاہئے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے، غالباً قاسم خان میرے اشارے پر منتظر تھا اور میں نے سر ہلا کر اس بات کی تائید کی تھی کہ اس کی مدد کرنا ہو گی۔ میرے اس عمل سے قاسم خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر وہ لڑکی طرف پلٹا اور بولا۔

”لڑکی! ہم لوگ تیری مدد کرنے کے لئے تیار ہیں، ہمیں یہاں سے کب

گا؟“

”کل سورج ڈھلنے کے بعد ہم اپنے سفر کا آغاز کریں گے اور کوشش کرے

جنگلوں تک پہنچ جائیں گے تاکہ اگلے دن کی روشنی تپتے پتھروں پر نہ گزرے، پھر جنگل سے گزرتے ہوئے ہم اس جگہ کی طرف جائیں گے جہاں درینہ بستی آباد ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب تو بھی آرام کرو۔“ ابھی قاسم خان نے اتنا ہی کہا تھا کہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور قاسم خان احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا۔ بعض اوقات ایسی ہی بات کہہ جاتا تھا کہ بس سر پٹنے کو دل چاہے، یعنی جس عورت کے ماں باپ اور شوہر کو کتے کی موت مار دیا گیا ہو اس سے بڑے آرام سے کہہ رہا تھا کہ تم آرام کرو۔

بہر حال ہم دونوں اپنی جگہ بیٹھے رہے، لڑکی بھی کچھ لمحوں کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ ہم لوگ بھی خاموش تھے۔ غرضیکہ ایک عجیب سی فضا تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولی۔

”اور تم لوگ، تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”ہم لوگ، مسافر ہیں اور اتنی دور سے آئے ہیں کہ بہت لمبے عرصے میں ہم نے سفر کیا ہے۔“

”لیکن تم ہو کون؟“

”جو بھی ہیں، اب تیرے ہمدرد ہیں۔“

”شکریہ اے میرے ہمدرد! میں تمہاری کمائی سننے کے لئے اصرار نہیں کروں گی، لیکن اتنا تمہیں بتا دوں کہ تمہیں اس ہمدردی کا صلہ ضرور ملے گا۔“ پھر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ ہم دونوں بھی اسے تنہائی فراہم کر رہے تھے اور اسی لئے خاموش تھے۔ ظاہر ہے ابھی وہ اس صدمے سے باہر نہیں نکلنے پا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اپنے بچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی، تب میں قاسم خان سے مخاطب ہوا۔

”کو قاسم خان! کیسا لگا یہ روپ تمہیں؟“

”یار زندگی واقعی میں اسی چیز کا نام ہے۔“

”کیا جیل کی سلاخوں کے پیچھے یہ سوچا تھا کہ کبھی پروفیسر لکھونا سے واسطہ پڑے گا؟“

اور اس کے ذریعے اس انوکھی دنیا میں آنے کا موقع ملے گا۔ اور دیکھو اب ایک ایسی

سفر طے ہوتا رہا، پہاڑی سلسلہ کافی طویل تھا، لیکن لڑکی کے کہنے کے مطابق یہ سفر رات کے دوران طے ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم دن کی روشنی میں جنگل تک پہنچ جاتے، سو یہی ہوا، سورج ابھی پوری طرح نمودار نہ ہونے پایا تھا کہ ہم نے کافی فاصلے پر درخت لہلہاتے ہوئے دیکھے تھے۔ ان درختوں میں ہمیں ناریل کے درخت بھی نظر آئے تھے اور ہماری رفتار تیز ہو گئی تھی۔

پورے دن کے بعد کوئی کھانے کی شے نظر آئی تھی اور اسے دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے وہاں پہنچیں اور ان ناریلوں کو توڑ کر پیٹ کی آگ بجھائیں۔ چنانچہ ہم تینوں ہی تیزی سے دوڑنے لگے، بچہ اس وقت میرے ہاتھوں میں تھا اور میں دوڑنے میں بھی احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چند لمحات کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے، جہاں ناریل کے درخت موجود تھے۔ دو منٹ تک قاسم خان رکا رہا پھر اس نے بندروں کی طرح درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔

اس کی پھرتی تو میں جیل میں بھی دیکھ چکا تھا اور اب پھرتی کا ایک اور مظاہرہ میرے سامنے تھا اس نے نہایت اطمینان سے تین چار ناریل توڑ کر نیچے پھینکے تھے جو دعائیہ آگے بڑھ کر پکڑ لئے تھے۔ پھر قاسم خان نیچے اتر آیا اور میں نے بچہ دعائیہ کو دے دیا اور ہم دونوں ناریل توڑنے لگے۔

ایک ناریل دعائیہ کو دیا اور دوسرے دو ناریل ہم دونوں لے کر بیٹھ گئے۔ پھر پہلے ناریل کا پانی پیا گیا اس کے بعد گودا کھلایا اور کچھ دیر کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ایک انتہائی آرام دہ جگہ تھی یہ اور یہاں کچھ عرصہ با آسانی گزارا جاسکتا تھا۔ چنانچہ فیصلہ یہ کیا گیا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے گا اور اس کے بعد آگے کا سفر شروع کیا جائے گا۔ قاسم خان نے کہا۔

جگہ ہم لوگ موجود ہیں جس کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں نہیں تھا۔
”بہر حال اب جو کچھ بھی ہے فی الحال اس لڑکی کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا دینا ہمارا کام ہے اس کے بعد اس منحوس بڑھے کو آواز دیں گے اور اس سے کہیں گے ہمیں اس وادی سحر سے باہر لے چل۔ اس سے اچھی وہ نل تھی جہاں بربریت کا عالم تو نہ تھا۔“

”ویسے قاسم خان، کچھ وقت یہاں ضرور گزارنا چاہئے۔“

”اماں بالکل ہی سٹھیا گئے ہو کیا؟“

”میں تمہیں ساٹھ سال کا لگتا ہوں۔“

”مم... مم... میرا مطلب ہے۔“

”کیا مطلب ہے، پروفیسر لنکونا کو شاید بھول گئے ہو تم، کتنی بے دردی سے ہم اس کی گردن اتاری تھی اور جب ہم واپس اس جگہ پہنچے تھے تو...“

قاسم خان اس منظر کو یاد کرنے لگا تھا اور پھر اس پر کبھی طاری ہو گئی۔
”واقعی یار! جب تک وہ لنکونا نہ چاہے گا، ہم میل سے نہیں نکل سکتے، چنانچہ مجبوراً اس وقت تک ہمیں یہاں رہنا پڑے گا۔ جب لنکونا ہمیں یہاں سے واپس دنیا میں لے جائے گا۔“

پھر ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ غرضیکہ وقت گزرتا رہا اور وہ وقت آیا جب ہمیں یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ اور ہم تینوں اس غار سے نکل آئے تھے، پھر لڑکی نے ایک جانب رخ کیا تھا اور ہم دونوں اس کے ساتھ ہل پڑے تھے۔ بچہ لڑکی کی آغوش میں ہی تھا اور اس وقت جاگ رہا تھا اور بہت ہی پیارا بچہ تھا۔

بہر حال سفر کا آغاز ہوا تھا اور ہم دونوں نے خود کو تقریر کے سہارے پر چھوڑ دیا کہ تقدیر ابھی نجانے کہاں کہاں لے جائے گی اور کیا کیا رنگ دیکھنے پڑیں گے۔



کے قاسم خان کو پکڑایا اور اس کے بعد میں خود بھی اوپر چڑھ گیا تھا۔ کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، ظاہر ہے یہاں کئی پھل دار درخت تھے اور قاسم خان نیچے اتر کر کئی پھل توڑ لایا تھا، بہر حال پھل کھا کر ہم نے پیٹ بھرا اور پھر میں نے قاسم خان سے کہا۔
 ”قاسم خان! تم اور دعائیہ چاہو تو بھرپور آرام کرو، میں جاگ رہا ہوں، ویسے دعائیا ہمیں مزید کتنے دن لگیں گے۔“

”بس ایک سورج اور ایک چاند اور ہمیں جنگل کے راستے میں گزارنا ہو گا اور اس کے اگلے سورج چڑھنے تک ہم درینہ بستی میں ہوں گے۔“
 ”ایک سورج ایک چاند۔“ قاسم خان حیرانی سے بولا۔
 ”دنوں کا حساب ہے قاسم خان۔“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم کل بھی اپنا سفر جاری رکھیں گے اور پرسوں صبح ہم لوگ درینہ بستی میں ہوں گے۔“
 ”بالکل ٹھیک۔“
 ”لیکن دعائیا ایک درخواست ہے تم سے۔“
 ”کیا؟“

”تم بستی والوں پر یہ ظاہر نہیں کرو گی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم اپنے طور پر کسی طرح بستی میں داخل ہو جائیں گے اور اگر کوئی ہم سے ہمارے بارے میں پوچھے گا تو ہم بھی اسے ہبا کا شکار بتا دیں گے۔“
 ”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔“

”میرا خیال ہے اب تم لوگ سٹالو میں جاگ رہا ہوں۔“ پھر ہم لوگ خاموش ہو گئے تھے، درختوں کی جڑی ہوئی شاخوں کے درمیان ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تھے دعائیہ اپنے بچے کو سینے سے چٹائے ہوئے تھی، قاسم خان بھی خاموش تھا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد دونوں اوگھنے لگے تھے، اور میں آہستگی کے ساتھ درخت سے نیچے اتر آیا تھا اور درخت کے نیچے ٹھلنے لگا تھا۔ پھر ایک عجیب واقعہ ہوا میں ٹھلنے کے انداز میں واپس آ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اسی درخت سے کوئی چیز

”بے شک۔ یہاں خطرناک جانور ضرور ہوں گے، اور ہمیں ان سے بچاؤ کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا ہو گا؟“

”سیدھی سی بات ہے قاسم خان! جب ہم کسی جگہ قیام کے لئے رکیں گے تو ہم دونوں میں سے ایک کو سپرہ دینا ہو گا، بے شک ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں لیکن۔۔۔۔۔“
 ”ہتھیار ہے۔“ لڑکی نے کہا اور دوڑ کر ایک درخت کی آڑ میں پوشیدہ ہو گئی، اور جب وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں انتہائی چمکدار خنجر تھا۔ پھر وہ کہنے لگی۔

”بے شک یہ ہتھیار جانوروں سے جنگ کے لئے ناکافی ہے، لیکن پھر بھی ہم اس سے کئی کام لے سکتے ہیں، مثلاً اس کے چوڑے پھل سے درخت کی شاخیں کاٹ کر اور انہیں نوکدار بنا کر بھالے جیسا بنا سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ ایک اچھی ترکیب ہے اور قاسم خان اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ دو تین مضبوط شاخیں توڑو اور اس چاقو کی مدد سے انہیں نوکدار بنا دو۔“

سو قاسم خان نے ایسا ہی کیا، جنگل میں وہ کافی دور تک اندر چلا گیا تھا اور جب تھوڑی دیر کے بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں شاخوں کا ایک گٹھر موجود تھا۔ پھر اس نے ان کی چھٹائی شروع کر دی اور تھوڑی ہی دیر میں چار پانچ شاخوں کو نوکدار بنا دیا تھا۔ اور انہیں احتیاط سے سنبھال کر رکھ لیا گیا تھا۔

بہر حال فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ مزید ایک آدھے گھنٹے یہاں رکنے کے بعد آگے کا سفر شروع کریں گے، دعائیا کا بچہ نہ صرف خوش شکل بلکہ خوش مزاج بھی معلوم ہوتا تھا اور اس بورے سفر میں اس نے ہمیں تنگ نہیں کیا تھا، اس وقت بھی وہ درختوں پر موجود پرندوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور دعائیہ اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

پھر کچھ دیر کے بعد ہم نے سفر کا آغاز کیا، طے یہ کیا گیا تھا کہ سورج غروب ہونے تک سفر جاری رکھا جائے گا اور اندھیرا ہونے تک کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں قیام کر لیا جائے گا۔ چنانچہ ہم سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ شام ہو گئی اور ہم نے ایک ایسے درخت کا انتخاب کیا جو زمیں سے بہت اونچا تو نہ تھا لیکن اس کی شاخیں کچھ اونچے درخت کی طرح آہستہ ہوئی تھیں کہ ان پر با آسانی قیام کیا جاسکتا تھا۔ پھر ہم نے پناہ دے گا اور چڑھایا تھا، پھر قاسم خان اوپر چڑھا اور میں نے بچے کو احتیاط سے اونچا کر

دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے دن بھی ہم نے سفر جاری رکھا اور اس وقت جب سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، ہمیں ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے، لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے مکان اور ان مکانوں کے درمیان لوگ آ جا رہے تھے۔ ہم لوگ اپنی جگہ پر ٹھہر گئے تھے۔ دعایا کہنے لگی۔

”تھوڑی دور چل کر بستی کا بڑا دروازہ آ جاتا ہے اس بڑے دروازے سے اندر داخل ہو کر بستی میں کہیں بھی جاسکتے ہیں۔“

”دعایا! کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اس بڑے دروازے کے بجائے اور کسی جگہ سے اس بستی میں داخل ہوں۔“

”بستی کے چاروں طرف ایک دیوار سی بنی ہے لیکن اس دیوار کو پار کیا جاسکتا ہے۔“

”کس طرح؟“ قاسم خان نے کہا۔

”بھئی زیادہ تر علاقہ جنگل پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے جب بستی کے آس پاس درخت نظر آ رہے ہیں تو درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کودا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“ دعایا نے تائید کی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔

”اور میرے بھائیو! میں تمہاری بے حد شکرگزار ہوں کہ تم نے اس سفر میں میری بھرپور مدد کی، میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی، اور ہاں ایک بات اور۔“

”کیا؟“ قاسم خان نے پوچھا۔

”یوں تو بستی میں تم اپنے طریقے سے داخل ہو گے لیکن خدا نخواستہ اگر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ تو زیر اش کا نام بے دھڑک لے لینا اور کہنا کہ تم اس کے ممان ہو، اصل میں زیر اش اس بستی کا نہایت معزز آدمی ہے اور میرے ماں باپ کا احسان مند کیونکہ میرے ماں باپ نے ایک دفعہ اس کی جان بچائی تھی اور اب میں اسی کے پاس رہوں گی، اور اسے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دوں گی، چنانچہ کوئی بھی افتاد پڑنے پر تم بلا جھجک زیر اش کے پاس چلے آنا۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری بہت مہربانی۔“ میں نے کہا۔

”بچے آئی ہے، اور میں نے جھٹ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تھا، بچے کو نیچے کی طرف آنا ہوئے دیکھ کر میں اسی سیدھ میں بھاگا اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر آرام سے بچے کو کچک کر لیا۔ بچہ اس آفت سے پریشان ہو کر جاگ گیا تھا۔ اور رونے لگا تھا، لیکن میں سہ جلدی سے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا اور تھوڑی سی ٹیک و دو کے بعد میں بچے کو چپ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ دعایہ شاید گہری نیند سو گئی تھی، قاسم خان بھی اپنی جگہ مست تھا اور یقیناً دعایا کی نیند گہری ہو گئی ہو گی جبھی اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور جس کے نتیجے میں یہ بچہ نیچے آ رہا تھا۔ لیکن بس خدا کو اس بچے کی زندگی عزیز تھی، لہذا اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔“

پھر بچہ میرے کندھے سے سر لگائے لگائے سو گیا تھا اور میں مزید کچھ دیر ٹھنکنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ اسی عالم میں رات گزر گئی اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ دونوں جاگ اٹھے، دعایا نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنی گود کی طرف دیکھا اور پھر ادھر ادھر، پھر اس کی نظر نیچے پڑی اور بچے کو میری گود میں دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں نیچے اتر آئے تھے اور دعایا نے لپک کر بچے کو گود میں لیا تھا۔

”وہ دراصل تم گہری نیند سو گئی تھیں، چنانچہ اس خیال سے کہ کہیں بچہ نیچے نہ گر پڑے میں اسے لے کر نیچے آ گیا تھا۔“

”بھائی! آپ کا بہت بہت احسان ہے یہ واقعی اگر یہ گر پڑتا تو نجانے اس کا کب حشر ہوتا۔“

”خیر چھوڑو ان باتوں کو، قاسم خان!“

”بس۔“

”ڈیوٹی۔“

”باس پانچ منٹ درکار ہیں، ابھی ذخیرہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر قاسم خان جنگل میں ایک سمت دوڑ گیا اور پانچ ہی منٹ میں اس نے کئی طرح کے پھل جمع کر لئے تھے ویسے قاسم خان واقعی بے حد پھرتیلا تھا اور اس کا مظاہرہ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ بہر حال ہم نے پھلوں کا ناشتہ کیا اور اس کے بعد اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ پھر

”ہمیں صرف اتنی مملت درکار ہے کہ ہم یہاں کے نقشوں سے واقفیت حاصل کر لیں۔“

”میرا خیال ہے زیراش اتنا اچھا انسان تو ہے کہ صورت حال کو سمجھ کر تمہاری مدد کرے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بستی میں داخل ہوتے ہی اس بستی کے لوگوں نے دعایا کو اور ہمیں اس طرح تپاک سے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کہ ہم خود حیران رہ گئے تھے لیکن جب ہر شخص کی پیشکش ٹھکرا کر دعایا نے زیراش کے آگے سر جھکایا تو زیراش نے اس کا سراپنہ چوڑے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

”مجھے تیری بستی کی مکمل داستان معلوم ہے دعایا۔ آہ۔ کاش میں بے بس انسان کوئی ایسا ذریعہ حاصل کر سکتا جس سے تیری اور بستی والوں کی مدد ہو سکتی لیکن تقدیر نے کچھ ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں، تو بھی آگئی اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہے۔“ زیراش اپنی آبادی میں صاحب ثروت انسان تھا اور اس کی بہت سی زمینیں وہاں موجود تھیں۔ چنانچہ وہ ایک خوش حال حیثیت رکھتا تھا اور اس نے ان سب کی بہترین خاطرمدارات کی۔ اس خاطرمدارات سے فارغ ہو کر دعایا نے سسکیاں بھرتے ہوئے زیراش کو اپنی کہانی سنا چاہی تو زیراش نے کہا۔

”نہیں دعایا۔ مجھے ان دردناک لمحات کے بارے میں کچھ نہ بتا، آ میں تجھے دکھاؤں کہ میں کیسے کرب سے گزر رہا ہوں۔“ اور پھر زیراش ہم لوگوں کو جہاں لے گیا وہ ایک تہ خانہ تھا، اس تہ خانے میں بستر لگے ہوئے تھے اور ان میں سے دو بستروں پر دو قوی بیکل جوان آنکھیں بند کئے ہوئے دراز تھے۔ دعایا نے ایک لمحے میں انہیں پہچان لیا، اس میں سے ایک ہارا تھا اور دوسرا اس کا بھائی سوبان۔ دعایا کے منہ سے دکھ بھری آواز نکلی۔

”یہ دو توں۔ آہ۔ یہ دونوں ہماری بستی کے قابل فخر نوجوان۔“

”ہاں۔ بیٹھو میں تمہیں ان کی کہانی سنا دوں۔“ زیراش نے کہا پھر کچھ لمحے تک جیسے وہ اپنے ذہن میں اس کہانی کو مربوط کرتا رہا اور اس کے بعد غم زدہ آواز میں بولا۔

”اس وقت جب شیطان صفت ہبا بستی میں قہر و غضب کے طوفان برپا کر رہا تھا، بستی کے ایک بہت بڑے، لیکن تاریک مکان میں ایک عمر رسیدہ بوڑھا، ایک بستر پر

بہر حال لڑکی نے گلوگیر آواز میں ہمارا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر بچے کو سینے سے لگائے اس طرف چل پڑی تھی۔ جہاں بستی کا دروازہ موجود تھا۔ ہم دونوں اپنی بڑ کھڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔ پھر میں نے قاسم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کہو قاسم خان، کیا خیال ہے بستی کو اندر سے دیکھا جائے۔“

”ہاں، کوئی حرج نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ خطرے کی کوئی بات بھی نہیں ہے۔“

”لیکن ٹھہرو۔“

”کیا ہوا؟“

”اگر ہم دعایا کے ساتھ ہی بستی میں داخل ہوں تو کیا حرج ہے ظاہر ہے یوں ہر ہم دعایا کے ساتھ تو نہیں رہیں گے، تو پھر کیوں نہ ہم بستی میں بھی اس کے ساتھ داخل ہوں اور زیراش پر بھی اپنا تاثر قائم کریں۔“

”یہ بات تو ہے پھر اب کیا کریں؟“

”دعایا کو روکو، وہ زیادہ دور نہیں گئی ہے، دیکھو وہ جارہی ہے۔“ میں نے کہا اور قاسم خان پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ آن کی آن میں اس نے دعایا کو جالیا تھا۔ دعا ب چونک کر اسے دیکھنے لگی اور پھر بولی۔

”خیر تو ہے میرے بھائی، کیا بات ہے؟“

”دعایا ہم بہت سی ایسی باتیں نہیں کر سکے ہیں جو کرنا چاہتے تھے، کچھ ایسا ذہن الجھا کہ ہم ان باتوں کی جانب توجہ ہی نہیں دے سکے۔“ دعایا نا سمجھنے والے انداز میں قاسم خان کو دیکھتی رہی، میں بھی قریب پہنچ گیا تھا، میں نے کہا۔

”اصل میں ہم ان علاقوں میں اجنبی ہیں، ہم اپنے آپ کو پوشیدہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس کے بعد صورت حال بہت مختلف ہو جائے گی اور ہم آگے کے سفر سے محروم رہیں گے۔“

”میرے بھائیو، تم سے جدا ہونے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں بے باک و مددگار تمہیں رکنے کی دعوت کیا دیتی، بے شک زیراش بہت اچھا انسان ہے، لیکن پھر بھی کیا کہا جاسکتا ہے۔“

کو دیکھا اور بولی۔

”اگر میرے دونوں بیٹے بستی ہولیہ میں کام آجاتے ہیں تو میں سمجھوں گی کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔“

”آفرین ہے تجھ پر بہو۔ آفرین ہے۔“

”تو پھر بابا ہمیں اجازت دو۔“

”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ گو کہ تجویز تم نے پیش کی ہے اس میں جتنے خطرات ہیں اس کا مجھے اندازہ ہے جس زمیں دوز راستے سے تم بستی سے باہر نکلنا چاہتے ہو یہ بارش میں شہر میں جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کے لئے بنایا گیا ہے اس میں برسوں سے غلاظت بستی ہے اور غلاظت ایسی بدبودار ہوا پیدا کرتی ہے جو انسانی زندگی کے لئے مہلک ہوتی ہے اس کے علاوہ اس زمیں دوز گزرگاہ میں حشرات الارض بھی ملیں گے اور تمہارا وہاں سے گزرتا بے حد مشکل ہو گا۔“

”ہم کسی آسان کام کے لئے نہیں جا رہے ہیں بابا ہمیں خوفزدہ نہ کرو ہم ہر قسم کی دشواریوں سے گزر جائیں گے عزم پختہ ہوں تو راستے رب عظیم صاف کر دیتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بچو رب عظیم تمہارا ساتھ دے میں تمہیں دعاؤں کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہوں۔“

دونوں بھائیوں نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا ہارا نے سویان سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد وہ بوڑھے اور اپنی ماں کے قریب آگئے دونوں نے ان کی پیشانیاں چومیں ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں تک آگئے تھے۔ ہارا نے کہل۔

”نہیں ماں۔ بہادر بیٹوں کی مائیں انہیں مسکرا کر رخصت کرتی ہیں ہم کوئی شکار کرنے نہیں جا رہے بلکہ بستی ہولیہ کو بچانے کے لئے ایک کوشش کر رہے ہیں شاید ہماری یہ کوشش کارگر ہو جائے۔“

”تم سب سے قریبی بستی آیا جاؤ گے بستی کے سردار کو ساری صورت حال بتا کر اس سے مشورہ لینا کہ کیا کیا جائے؟ صرف بستی آیا والے اس مصیبت پر قابو پانے میں ناکام رہیں تو کسی دوسری بستی کا رخ کرنا شکرال میں ایسی بہت سی غیر مند بستیاں موجود

بیٹھا ہوا اپنے سامنے موجود دو خوبصورت نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے پوتے تھے بوڑھا ہلان اپنے بیٹے کی موت کے بعد ان دونوں پوتوں کو اپنے سینے پر لگے ہوئے زخموں میں سموئے ہوئے تھا، بوڑھے کی بیوی بھی اس کے گھر میں ہی تھی اور اس کی بہو بھی یعنی ان بیٹوں کی ماں۔ یہ خاندان صرف چار افراد پر مشتمل تھا بوڑھے ہلان کے پوتے ہارا اور سویان بہت ہی چاق و چوبند اور توانا تھے۔ ان دونوں جوانوں کے علاوہ بوڑھے کی اور کوئی کمائی نہیں تھی اور اس نے ان کی بہترین پرورش کی تھی۔ دونوں ہی چاق و چوبند، پھرتیلے اور بہت ہی خوش مزاج انسان تھے۔ لیکن اس وقت سب پر ہبا کی صورت میں تباہی نازل تھی۔ پھر بوڑھا ان دونوں جوانوں سے مخاطب ہوا۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ہر کام کرنے کے قابل ہو، لیکن، میرے بچو! یوں سمجھ لو کہ اس دنیا میں میرا تمہارے سوا اور کون ہے، تمہیں کھونے کے بعد میرے پاس جینے کے لئے اور کچھ نہیں ہو گا، خیر میری تو زندگی ہی کیا، میں تو اپنے آپ کو کسی کے بدلے موت کے لئے بھی پیش کر سکتا ہوں، لیکن اصل مسئلہ تمہاری ماں کا ہے۔“

”بابا! تو نے ہمیں جو تربیت اور طاقت بخشی ہے وہ اس قدر ناکارہ نہیں کہ جو ذمہ داری ہم نے اپنے کندھوں پر لی ہے اسے پورا نہ کر سکیں۔“

”تم دونوں ٹھیک کہتے ہو لیکن میں اپنے اس کمبخت دل کو کیا کہوں۔ پوری بستی خوف کا شکار ہے اور ہر شخص عقل سے کام لینا چھوڑ چکا ہے اس وقت بھلا کون ہے جو منصوبہ بندی کر سکے ان حالات میں میرے بچو..... میں تمہیں اس کی اجازت کیسے دوں؟“

”دیکھ رہا ہے بابا اس کینے ہبا نے بستی میں کیا اندھیر مچا رکھا ہے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کل کا دن کیا ہو اور وہ کون سا نیا حکم دے دے ہمیں بستی کے لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلانا چاہئے ورنہ بعد میں ہمارے بارے میں بھی حکم صادر ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو کہ تاخیر کی صورت میں صرف پچھتو رہ جائیں۔“

”میں تم دونوں سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں میرے بچو اپنی ماں سے اجازت لے لو وہ کیا کہتی ہے۔“ عورت نے گردن اٹھا کر ڈنڈباتی نگاہوں سے اپنے دونوں بیٹوں

کی مدد پر آمادہ تھی کیونکہ چند ہی گز کے فاصلے پر انہوں نے اک کالے ناگ کو اپنے راستے میں حائل دیکھا اگر چراغ روشن نہ کرتے تو اس ناگ کے قریب سے گزرتا پڑتا اور اس وقت نہیں کہا جاسکتا تھا کہ موزی جانور ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا لیکن روشنی ہوتے ہی سانپ کی تیز پھنکار گونجی تھی اور دونوں ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔ تب ہار نے اپنا تیز خنجر نکل کر ہاتھ میں لے لیا اور اسے نوک کی طرف سے پکڑ کر سانپ کا جائزہ لینے لگا۔ سانپ نے آہستہ سے کہا۔

”نشانہ خطا نہیں ہونا چاہئے۔“ ہار نے کوئی جواب نہ دیا وہ بہترین نشانہ باز تھا اور چاقو پھینک کر مارنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اس نے سانپ کے پھن کے نشانہ لیا اور دوسرے لمحے اس کے ہاتھ سے نکلنے والا چاقو سانپ کے پھن میں ترازو ہو گیا۔ موزی جانور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اور وہ مدھم روشنی میں اس کا جائزہ لیتے رہے پھر جب انہوں نے محسوس کیا کہ سانپ کا جسم ٹھنڈا ہو چکا ہے تو آگے بڑھے اور ہار نے اپنا چاقو سانپ کے پھن سے نکل کر چاقو کو صاف کر کے دوبارہ اپنے لباس میں رکھ لیا۔

اس کے بعد مدھم روشنی میں وہ دونوں آگے بڑھتے رہے ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ دونوں آگے بڑھتے رہے لیکن دونوں جانتے تھے جس مقصد کے لئے انہوں نے یہ سفر اختیار کیا ہے وہ بہتوں کی زندگی کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ اپنی تمام تر قوت برداشت سے کلام لیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے بالآخر انہیں اس طویل ترین راستے کا دوسرا سرا نظر آگیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے دونوں نے فوراً ہی روشنیاں بجھا دی تھیں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دشمن یہاں موجود ہیں یا نہیں تاہم ان کا خیال تو رکھنا ہی تھا۔

دونوں کافی دیر تک وہاں رک کر باہر ہونے والی آہٹوں کا جائزہ لیتے رہے اور پھر انہوں نے کوئی آہٹ نہ پائی تو ہار نے سانپ کے شانوں پر چڑھ کر اوپر قدم رکھا اور باہر کا جائزہ لینے کے بعد دونوں ہاتھ سوراخ پر ٹکا کر اوپر آگیا پھر اس نے سانپ کو بھی اوپر کھینچ لیا اور دونوں بھائی سیدھے کھڑے ہو کر اپنے چہرے سے کپڑے اتارنے لگے اور پھر تازہ ہوا میں گہری گہری سانس لینے سے ان کی حالت بہت بہتر ہو گئی اس سفر کے

ہیں جو مصیبت میں پھنسے ہوؤں کی مدد بھی کرتی ہیں۔“

”ہمارا انتظار کرنا بابا ہم واپس آئیں گے۔ ہم ضرور واپس آئیں گے۔“ سانپ نے کہا اور اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے شاید یہاں سے روانگی کی تیاریاں وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے تھیلے اپنے شانوں سے باندھے اور ایسے لباس استعمال کئے جو ان کے راستے میں رکاوٹ نہ ثابت ہوں۔“

اب گھر سے نکل کر اس جگہ تک جانے کا مسئلہ تھا جہاں زمیں دوز راستہ جو گندے پانی کی گزرگاہ تھی شروع ہوتا تھا۔ رات کی تاریکی سے وہ صرف چھپکلیوں کی طرح زمیں پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے جہاں بھی کہیں آہٹ محسوس ہوتی وہ رک جاتے تھے زمین دوز گزرگاہ کا فاصلہ ان کے گھر سے بہت سا زیادہ فاصلہ نہیں تھا بس ایک چھوٹا سا راستہ عبور کرنا ہوتا تھا لیکن اس راستے کو عبور کرنے میں کافی وقت لگ گیا چونکہ دشمن شیطان جگہ جگہ اپنے گھوڑوں پر سوار گردش کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے یہاں تک کہ وہ اس زمین دوز راستے کے دہانے تک پہنچ گئے یہ دہانہ کھلا ہوا تھا اور گندا پانی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا کیونکہ یہ صرف برساتی پانی کی نکاسی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں دہانے میں سے نیچے اتر گئے بوڑھے نے درست کہا تھا، یہاں شاید بدبو پھیلی ہوئی تھی لیکن ایک بڑی مشکل کو ٹالنے کے لئے چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنا ہی ہوں گی انہوں نے اپنے چہروں پر کپڑا لپیٹ لیا۔ اور دونوں تاریکی میں آگے بڑھنے لگے ان کے چلنے کی رفتار بے حد ست تھی، تھوڑی دیر کے بعد وہ زمیں کے نیچے دور تک نکل آئے۔ شدید بدبو سے دماغ پھنسا جا رہا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ جسم پسینہ پسینہ ہو گئے تھے لیکن دونوں آگے بڑھتے جا رہے تھے اور انہیں جب یہ احساس ہو گیا کہ وہ دہانہ بہت پیچھے رہ گیا اور اگر وہ یہاں روشنی کر لیں تو انہیں آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اور اس روشنی کے دہانے سے نہیں دیکھا جاسکتا تو دونوں نے اپنے جسم پر بندھے ہوئے تھیلوں میں ہاتھ ڈال کر چربی اور پلور کے بنے ہوئے چراغ نکل لئے جنہیں روشن کر کے روشنی حاصل کی جاسکتی تھی چراغوں نے ان کے راستے آسان بنا دیے تھے۔ شاید تقدیر ان

”وہ کتنے بھی ہوں ہم ضرور انہیں ختم کر دیں گے“ تو بے فکر رہ سوبان میرا کلمہ اڑا ان سب کا خون چاٹ لے گا اگر ہم اس کوشش میں مر بھی گئے تو برا نہ ہو گا یہ سب ہماری بستی کے لوگوں کے قاتل ہیں۔“

”تو پھر دیر کرنا بیکار ہے۔“ سوبان بھی پر جوش ہو گیا دونوں نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے کلمہ اڑے سنبھالے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے البتہ ٹیلے تک پہنچتے ہوئے انہوں نے قدموں کی آوازیں نہ پیدا ہونے دی تھیں۔ ٹیلے کے عقب میں ان کی خوش قسمتی سے صرف دو محافظ موجود تھے جنہوں نے اپنے آہنی خود اتارے ہوئے تھے اور ٹیلے سے کمر لگائے آرام کر رہے تھے ان سے کچھ فاصلے پر ان کے گھوڑے ہوشیار معلوم ہوتے تھے اور کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس کر کے کنوٹیاں بدل رہے تھے۔

سوبان اور ہارا موت بن کر ان پر جھپٹے اور ان کے وزنی کلمہ اڑے ان کی کھوپڑی کی ہڈیاں کٹنے ہوئے گردن میں اتر گئے ان میں سے ایک کی آخری چیخ ابھری اور فضا میں گردش کرنے لگی۔ سوبان اور ہارا نے ہوشیار جنگجوؤں کی مانند سب سے پہلے ان کے ہتھیاروں پر ہاتھ ڈالے اور ان کی بندوقیں قبضے میں کر لیں ان کے کارتوس اپنی تحویل میں لے کر وہ گھوڑوں کی طرف بڑھے اور اچھل کر ان پر سوار ہو گئے لیکن شاید کچھ اور محافظ آس پاس موجود تھے اور شاید کسی وجہ سے ان کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے کیونکہ دوسرے لمحے کئی فائر ہوئے اور گولیاں ان کے آس پاس سے نکل گئیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اب انہیں آسانی ہو جائے گی لیکن گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوتے ہی ان پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی تھی اس کا قطعی موقع نہیں تھا کہ رک کر جوابی فائر کئے جاتے۔ محافظوں کی سمت کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا بے تحاشا گھوڑے دوڑ رہے تھے لیکن محافظ تعداد میں کافی معلوم ہوتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر یلغار کر رہے تھے گولیوں کی بارش سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں پوری طرح ان کی نگاہوں میں مل اور وہ بخوبی یہ بات جانتے تھے کہ بھاگنے والے ان کے ساتھیوں میں سے نہیں ہیں جس سمت سوبان اور ہارا کو سفر کرنا تھا وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی فی الحال ان گولیوں سے بچنے کے لئے وہ بے تحاشا گھوڑے دوڑا رہے تھے اور سمت کا تعین کھو بیٹھے تھے اس وقت نہایت مخدوش حالت پیدا ہو چکی تھی انہیں کافی تشویش لگی ہوئی

بعد نجانے کیوں انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کریں گے۔

لیکن آگے کا سفر اتنا آسان نہیں تھا بستی کے چاروں طرف محافظ اپنے گھوڑوں پر سوار گشت کرتے پھرتے تھے یہ اندازہ لگانے کے لئے کوئی بستی سے باہر تو نہیں جا رہا۔ ویسے تو آس پاس کسی کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

انہوں نے سمت کا تعین کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹے بڑے ٹیلے ان کو چھپانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے یوں بھی آسمان کراؤد ہو رہا تھا اور روشنی زمین تک نہ پہنچ رہی تھی جس کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن جو لوگ تاریکی میں دیر تک موجود رہے ہوں وہ کم از کم اس تاریکی میں مدہم سالیوں کی موجودگی کا اندازہ ضرور لگا سکتے تھے۔

انہیں ابھی آگے بڑھتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دفعتاً ہی گھوڑوں کی ہنہناہٹ ان کے کانوں میں گونجی اور دونوں کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں آواز جہاں سے آئی تھی وہاں سے ان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اتفاق کی بات یہ تھی کہ قرب و جوار میں کوئی ایسا ٹیلہ بھی نہیں تھا جس کے عقب میں پوشیدہ ہوا جاسکتا تھا دونوں پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی بھی طریقہ کار نہیں تھا گھوڑوں کی آوازیں دوبارہ گونجیں اور انہوں نے ان کی سمت کا اندازہ لگایا ایک اونچا ٹیلہ ان سے کافی فاصلے پر موجود تھا یقیناً گھوڑوں کی آوازیں اسی ٹیلے کے عقب سے آئی تھیں وہ زمین پر سانس روکے لیٹے رہے ان کی نظریں ٹیلے کا طواف کرتی رہیں گھڑ سوار ٹیلے کے عقب سے برآمد نہ ہوئے تھے جس سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ وہاں رکے ہوئے ہیں کچھ دیر بعد سوبان نے سرگوشی کی۔

”اب کیا کیا جائے وہ ہمیں یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں اور ان سے بچ کر آگے نکل جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں کہ ہم انہیں ختم کر دیں۔“ ہارا نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

”ان کی تعداد کا اندازہ نہیں ہے۔“

تھی دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا خیال بھی تھا گھوڑے اس وقت بلندیوں کو عبور کر رہے تھے اور ان کی رفتار ست ہو گئی تھی جبکہ حملہ آور ابھی میدانوں میں ہی تھے اور انکے قریب پہنچنے کی رفتار زیادہ تیز تھی پھر ایک گولی نے سوبان کے گھوڑے کے پاؤں کو زخمی کر دیا گھوڑا لڑکھڑاتا ہوا سر کے بل آ رہا۔ سوبان اگر ایک ہوشیار گھوڑا نہ ہوتا تو سنگلاخ چٹانوں پر گر کر اس کا بھیجا باہر نکل آتا اور اعضاء ٹوٹ پھوٹ جاتے لیکن جیسے ہی گھوڑا زمیں بوس ہونے لگا اس نے گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا دی گھوڑا ڈھلان پر دور تک لڑھکتا چلا گیا اور سوبان نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

بارا نے اپنے گھوڑے کی لگائیں کھینچ لیں گردن گھما کر سوبان کی جانب دیکھا اور پھر صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے زندگی کی پرواہ کئے بغیر واپس لوٹا۔ سوبان کا گھوڑا تو کافی دور جا چکا تھا اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا بارا نے اپنے گھوڑے کو سوبان کے قریب لا کر اپنا ہاتھ سارے کے لئے پیش کیا اور دوسرے لمحے سوبان کو اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ خود ہارا کا گھوڑا بھی بدحواس ہو رہا تھا اور آس پاس سے نکلنے ہوئے دیکھتے انگاروں سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ پھر دو سوار اس کی پشت پر آ گئے تھے چنانچہ وہ بری طرح بدکنے لگا۔

سوبان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”یہ بلندیاں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آگے جا کر ختم ہو جائیں گی ہمارے پاس راہ فرار نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔“

”یوں لگتا ہے جیسے ہم دریائے شیرجان کی جانب جا رہے ہیں۔“

”ہاں میرا بھی یہی اندازہ ہے۔“

”مگر اس طرف سے تو ہمارے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ ہارا نے سرد لہجے میں کہا اور اس دوران میں محافظ انہیں تین سمت سے گھیرے ہوئے مسلسل ان کے پیچھے آ رہے تھے اور اب انہوں نے یہ بلندیاں طے کرنا شروع کر دی تھیں گھوڑا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ پہاڑی کٹاؤ سامنے آ گیا جس کے آگے راستہ مسدود تھا اور نشیب میں دریائے شیرجان بہہ رہا تھا۔ پہاڑی چٹانوں سے سر ٹکراتے ہوئے وہ ہولناک آوازیں پیدا کر رہا تھا یہ دریا اس

علاقے کا سب سے بڑا دریا کہلاتا تھا اور اسے مقامی زبان میں برف کا دریا کہا جاتا تھا پہاڑوں سے ٹپکنے والی برف سے یہ دریا بنا تھا اور اس کا پانی اتنا سرد ہوتا تھا کہ اطراف میں اس سرد پانی کی وجہ سے موسم ہمیشہ سرد رہتا تھا اس دریا میں کودنا ہی موت کو آواز دیتا تھا لیکن موت کی آوازیں چاروں طرف سے ابھر رہی تھیں اور کوئی بھی لمحہ ایسا ہو سکتا تھا کہ دیکھتے ہوئے انگارے ان کے جسموں کو چھو لیں اور وہ بے جان ہو جائیں۔ گھوڑے نے ہننا کر واپس پلٹنے کی کوشش کی تو دونوں اس کی پیٹھ سے کود گئے۔ وحشی جانور یہاں آ کر پوری طرح بدک گیا تھا کیوں کہ اس نے بھی اپنے سامنے موت کو دیکھ لیا تھا۔ سوبان نے ہارا کو دیکھا۔ بارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم دریا میں چھلانگ لگا دیں۔“ سوبان نے گہری سانس لی اور بولا۔

”رب عظیم کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی یہاں سے کسی سمت نکلنا یا اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہمارے لئے ناممکن ہے۔“

”ہاں اگر ہم نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے ان کی تحویل میں دے دیا تو ہم سے وہ ہمارے خاندان کے بارے میں پوچھیں گے اور اس کی بعد ہمارے ماں اور باپ زندہ نہ رہ سکیں گے۔“

”نہیں ہم ان کے لئے بدنامی کا باعث یا موت کا سبب نہیں بنیں گے۔“ سوبان نے کہا اور دونوں بھائیوں نے متفق ہو کر دریا کے کٹاؤ سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ ان کے جسم بخ بستہ ہواؤں کو چیرتے ہوئے گہرے پانیوں کی جانب سفر کر رہے تھے۔



بلا کر غضب ناک لہجے میں کہا۔

”کون یہاں سے باہر نکلا ہے؟ اس کے بارے میں مجھے مکمل طور پر معلومات درکار ہیں۔ اور اگر یہ معلومات مجھے چند لمحوں کے اندر فراہم نہ کر دی گئیں تو سمجھ لینا کہ تم لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور ہبا کے آدمی جانتے تھے کہ ہبا اگر کوئی بات کہہ دیتا ہے تو اسے پورا کرنے کے لئے یقینی طور پر عمل کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ قبر اور غضب بن کر بستی والوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور ان محافظوں نے پوری بستی کو اپنے گھوڑوں کے پیروں تلے روند ڈالا۔ جو بستی کے ایک ایک شخص کو پیغام دے رہے تھے وہ کہہ رہے تھے۔

”بستی والو! تم میں سے ہر شخص اس میدان میں جمع ہو جائے جو مشرقی کنارے پر دسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر خاندان الگ الگ اپنا ڈیرہ ڈالے۔ اور اگر اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو ہبا کے حکم پر شام تک بستی میں قتل عام شروع ہو جائے گا۔ بچارے بستی والے ہر لمحہ ایک نئی مصیبت کا انتظار کر رہے تھے وہ اس نئے حکم پر لرز اٹھے۔ عام خیال یہی تھا کہ وہاں میدان عظیم میں انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر قتل نہیں کیا جائے گا تو پھر اس طرح اس میدان میں جمع ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال جب سورج بلندی پر پہنچا تو پورا میدان ہمولیہ کے بے یار و مددگار انسانوں سے بھر چکا تھا۔ اور ہبا کے لڑاکے ان کی ترتیب کر رہے تھے۔ ہر خاندان کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جمع کیا گیا تھا بوڑھے بچے اور عورتیں تک بے گھر ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں لیکن زور سے رونے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی چنانچہ ان کی آہ و زاری بالکل بند تھی۔ البتہ آنکھوں سے بننے والے آنسوؤں پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تھا تب ہبا غیض و غضب کا دیوتا بن کر اپنے گھوڑے پر سوار ان کے درمیان پہنچا۔ اور ایک ایک قدم آگے بڑھ کر ان کے خاندانوں کے درمیان چکر لگانے لگا۔ پھر اس نے ان کے سامنے رک کر کہا۔

”رات کو کچھ افراد بستی سے باہر نکلے ہیں اور میرے دو آدمیوں کو قتل کر کے یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ بعد میں انہوں نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو ہماری گرفت سے محفوظ کر لیا ہے۔ وہ کون ہیں اور ان کا تعلق کون سے خاندان سے

زیر اش ہمیں یہ کہانی سنا رہا تھا اور ہم حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم ان پر اسرار داستانوں کے ساتھی بن گئے ہیں۔ بھلا ہمارا اس انوکھی دنیا سے کیا تعلق؟ نہ جانے کم بخت لنگونانے کہاں لا پھینکا تھا۔ جو کچھ نظر رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر دل و دماغ وحشت کا شکار ہو رہے تھے۔ مجھے تو سب سے زیادہ قاسم خان پر حیرت تھی میری فطرت تو خیر بہت تبدیل ہو چکی تھی۔ اور میں ہر طرح کی صورت حال برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن قاسم خان جس پامردی سے ان تمام حالات کا مقابلہ کر رہا تھا اس پر مجھے حیرت تھی۔ بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا تھا کہ قاسم خان مجھ سے زیادہ مستعد ہے۔ اور اس تمام صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد میں زیر اش سے متاثر تھا جو بستی ہمولیہ کی کہانی اس طرح سنا رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی بستی کی کہانی ہو۔ ہبانے ہمولیہ کو جس طرح تباہ کیا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد اس بات کی یقینی وضاحت ہو جاتی تھی کہ آنے والے وقت میں بگڑا ہوا سانڈ یا بھوکا شیر کسی بھی جانب رخ کر سکتا ہے۔ چھوٹے آدمی کو جب طاقت مل جاتی ہے تو وہ ہر شخص کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ کوئی صاحب ظرف ہوتا اور اس بات کا خیال کرتا کہ ماضی میں اس کے ساتھ رحم اور انصاف سے کام لیا گیا ہے تو شاید اس سے خطرہ محسوس نہیں کیا جاتا۔ لیکن اب تو نہ جانے کون کون سی بستیاں ہبا کے غیض و غضب کا شکار ہونے والی تھیں۔ بہر حال اس وقت بات صرف ہمولیہ کی ہو رہی تھی۔ زیر اش نے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اور ہبا کو اپنے ان دو ساتھیوں کی موت کی خبر مل چکی تھی جنہیں باہر جانے والے راستے پر کھانڈوں سے قتل کر دیا گیا تھا اور یہ بات طے ہو گئی تھی کہ کچھ لوگ یقینی طور پر ہمولیہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کو

ہے مجھے یہ معلومات فوراً چاہئیں اگر یہ معلومات مجھے حاصل نہ ہو سکیں اور یہ نہ پتہ چل سکا کہ وہ کس مقصد سے باہر گئے ہیں اور کس طرح گئے ہیں تو یہ سمجھو کہ اس طرح لوگوں کو قتل کر دوں گا کہ تم لوگوں کو لاشیں اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ دہلی ہوئی چیخیں، آہیں اور سسکیاں بلند ہوئیں تو ہبانے گرج کر کہا۔

”نہیں رونے کی اجازت نہیں ہے۔ رونے کے لئے تمہارے پاس بہت وقت پڑا ہوا ہے۔ جو کہا جا رہا ہے اس کی تعمیل ہو۔“ ہبا کے خونخوار سپاہی ہمارے سامنے جا با کر ہم سے سوالات کرنے لگے۔ بستی کے لوگ سہمی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کے گھروں میں سے کون غائب ہے۔ وہ جو مر چکے تھے ان کی اطلاع تو دوسروں کو مل ہی چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کون ہیں جو بستی سے نکل گئے ہیں۔ تب ہبانے کے پڑوسی نے ہبان کا چہرہ دیکھا اور گردن گھما کر اس کے پوتوں کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ہبان کی بہو کے علاوہ اور کوئی اس کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ اس شخص کے چہرے پر چونکنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ ہبان کے پوتے ہارا اور سوبان کل تک زندہ سلامت موجود تھے لیکن اب وہ نظر نہیں آ رہے تھے اس کی بے چینی کو ہبان نے بھی دیکھ لیا تھا تب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور ہبان کی آنکھیں شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اپنے ساتھی کو غور سے دیکھ رہا تھا اور ساتھی کے چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہبا کے ساتھی اس جانب آ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ہبان کے پڑوسی سے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا اور وہاں سے چند قدم آگے بڑھ کر بوڑھے ہبان کے سامنے پہنچ گئے۔ اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔

”تیرے اہل خاندان کہاں ہیں؟“ تو ہبان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں ہوں اور میرے بیٹے کی یہ بیوہ ہے۔ ہم دونوں افراد ہی ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں اور زندگی گزار رہے ہیں۔“

”تیرا بیٹا کہاں ہے؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”طویل عرصہ قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔“ ہبان غمزہ لہجے میں بولا۔ اور وہ لوگ اسے غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جبکہ ہبان کے پڑوسی نے

آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے اہل خاندان بھی منہ بند کئے خاموش کھڑے تھے۔ سپاہی دوسرے لوگوں سے سوالات کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اور جب وہ ذرا دور نکل گئے تو ہبان کے پڑوسی نے ہبان سے کہا۔

”تیرے دونوں پوتے کہاں ہیں؟“

”کیا خاموشی مناسب نہیں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے پوتوں کو ان لوگوں کے خوف سے چھپا دیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ ہمولیہ کے لئے امداد لینے گئے ہیں۔“ پڑوسی خاموش ہو گیا تھا۔ سپاہیوں کی یہ پوچھ گچھ رات گئے تک جاری رہی تھی اور تمام دن اس میدان میں کھڑے کھڑے ہر کرنے والے ہمولیہ بستی کے لوگوں کو رات گئے اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت ملی تھی۔ یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہاں سے باہر جانے والے کون ہیں؟ لیکن ہبا جانتا تھا کہ وہ لوگ یقینی طور پر ہمولیہ بستی سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کے دوستیوں کو قتل کر کے باہر نکل گئے ہیں۔ دوستیوں کو قتل کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یا ان کی موت ہبا کے لئے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے انہیں قتل کیا ان کے اندر یہ دلیری کہاں سے پیدا ہو گئی۔ اور کہیں یہ دلیری دوبارہ کسی کے دل میں نہ جاگ اٹھے۔ چنانچہ اس کا سبب کرنا ضروری تھا۔ دوسری صبح اس نے اعلان کیا کہ آخر کار وہ یہ پتہ تو چلا ہی لے گا کہ اس کے دوستیوں کو قتل کر کے بستی سے باہر نکل جانے والے کون تھے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی بستی والوں پر جو قیامت ٹوٹے گی وہ ان کے تصور سے بھی باہر ہو گی۔ ہمولیہ والے خاموشی سے برداشت کر گئے۔ ان کے اندر اب اتنی سکت نہیں تھی کہ ہبا کی کسی بات کا جواب دے سکیں۔ ہبانے یہاں ٹھم شروع کر دیا۔ اور نہ جانے کس کس طریقے سے وہ بستی ہمولیہ والوں کو اس سلسلے میں خوفزدہ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ چنانچہ بہت سے درخت کاٹے گئے اور جگہ جگہ انہیں نصب کر کے پھانسی گھر بنائے جانے لگے۔ ہمولیہ کے بد نصیب باشندے یہ نہیں جانتے تھے کہ پھانسی دینے کے لئے کس کس کو منتخب کیا جا رہا ہے۔ یہ اجتماعی پھانسی گھر لوگوں میں تیار ہو گئے اور ان میں بڑے بڑے رے پھندوں کی شکل میں لٹکا دیئے گئے۔ تب ہبا نے اعلان کیا۔

”بستی والو! تمہارے سردار کے باپ نے مجھے شہر بدر کیا تھا اور ذلیل و خوار کے اس بستی سے نکالا تھا۔ اس وقت اس کے باپ کے جتنے ہمنوا تھے۔ وہ سب میرے علم میں ہیں اور اب میں انہیں بتاؤں گا کہ ہبا کو اس بستی سے نکلنے کا کیا نتیجہ مل سکتا تھا۔ گو اس کام میں ایک طویل عرصہ لگا ہے۔ غالباً چودہ یا پندرہ برس لیکن چودہ پندرہ برس کے بعد ہی سہی میں اپنے انتقام کی تکمیل کر رہا ہوں۔ چنانچہ کل شام سویرے ڈوبنے کے بعد جب تاریکی چاروں طرف مسلط ہو جاتی گی۔ ان تمام لوگوں کو ان پھانسی کے پھندوں میں لٹکا دیا جائے گا۔ اور یوں میرے انتقام کی تکمیل ہو جائے گی۔ ہوا والو! ان لوگوں سے اپنا انتقام پورا کرنے کے بعد میں اس بستی کی سرداری کا منصب سنبھالوں گا۔ ہو سکتا ہے تم لوگوں کو وفادار پا کر میں تمہیں معاف کر دوں۔ حالانکہ تمہارا تعلق بھی اسی بستی سے ہے۔ جہاں سے مجھے بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لینا کہ اس کے بعد پوری بستی ہبا کی محکوم ہو گی۔ یہاں گھر میں چراغ میرے حکم سے جلے گا۔ اور میرے حکم سے بجھے گا۔ تم سب کو میرے حکم کی تعمیل کرنا ہو گی۔ چنانچہ انتظار کرو اس وقت کا جب ان لوگوں سے تمہارا بستی کو نجات مل جائے جو تمہاری تباہی لے کر آئے تھے۔“ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زور ان بہت اچھا سردار تھا اور جن لوگوں کو پھانسی کے لئے منتخب کیا تھا وہ بھی بہت معزز اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس وقت تو ہر ایک کو اپنی؟ کی فکر تھی۔ چنانچہ کون کسی کے لئے روتا۔ رونے کے لئے تو ان لوگوں کے گھر ہی کافی تھی جنہیں موت کی سزا دی جا رہی تھی۔ وہ سسک رہے تھے بے آواز رہے تھے۔ جو عذاب ان پر نازل ہوا تھا اس سے بچنے کا کوئی راستہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہر حال اب وہ ہبا کے رحم و کرم پر تھے۔ پھر جب دوسرا دن طلوع ہوا موت ان کی آنکھوں میں آنکس ڈال کر مسکانے لگی۔ جن لوگوں کے لئے پھانسی بنایا گیا تھا۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ ہر شخص کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور ہبا ہر کارے جو قرب و جوار میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ان لوگوں کو پھانسی گھر کے قریب ہو جانے کا حکم دینے لگے۔ اور بد نصیبوں نے اپنے بستی والوں کی موت کا نظارہ کر لیا۔ وہ لوگ بھڑوں اور بکروں کی مانند تھے۔ چنانچہ اس طرح

ہوئے وہ پھانسی گھر کے کنارے پہنچ گئے۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا کہ شام کی سیاہی تقدیروں پر چھانے لگیں۔ اور موت کے ہولناک قہقہے گردش کرنے لگے۔ انہیں زنجیروں میں باندھ کر پھانسی گھروں تک لایا گیا۔ اور پھر انہیں اونچی جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔ جو خاص طور سے اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ہبا نے مسکراتی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شیطان کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”ہولیہ والو! ان سب سے نجات تم سب کے لئے نجات ہو گی اور اس کے بعد میری سرداری میں اس بستی میں نئے دور کا آغاز ہو گا۔ دیکھو! موت کس طرح ان کی جانب بڑھ رہی ہے۔“ ہبا کے اشارے پر ہبا کے آدمی ان لوگوں کی جانب ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگے۔ اور بستی والوں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لیکن یہ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون تھے، کیا تھے کہاں سے آئے تھے، جنہوں نے اچانک ہی ہبا کے ان آگے بڑھنے والے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش کی اور انہیں وہیں ڈھیر کر دیا۔ یہ گولیاں نہ جانے کہاں سے چلائی گئی تھیں۔ افراقی پھیل گئی۔ ہبا کے ساتھ جو خونخوار محافظ موجود تھے۔ وہ آتش پا ہو گئے۔ اور اس کے بعد ہبا کے اشارے پر قتل عام شروع کر دیا گیا۔ یوں ساری بستی تباہ ہو گئی اور جگہ جگہ آتش و آہن کے مظاہرے ہونے لگے۔ یہ کہانی ہے بد نصیب ہولیہ کی۔ دو افراد جو دریا میں بہتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے بچا لئے گئے۔ یعنی ہارا اور سوبان۔ جو ہلمان کے پوتے تھے اور یہ بچی دہائیہ جنہیں تم لوگ لے کر آئے ہو۔“ زیر اش درد بھرے انداز میں خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ خداوند عالم ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔ برا ہو اس ذلیل لنگوٹا کا جو ہمارے لئے اس عذاب کا باعث بنا تھا۔

زیر اش نے کہا۔ ”معزز مہمانو! تم دعائیہ کو لے کر یہاں آئے ہو۔ حالانکہ میں جانتا ہوں میری بستی کے لوگ اس بات کے خلاف ہو جائیں گے کہ ہم ہبا سے کوئی جھگڑا نہ کر لیں۔ لیکن بہر حال دیکھیں گے اور دیکھ کر غور کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں تم لوگوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے بھرپور کوشش کروں گا۔“ تو قاسم خان نے مجھے

ایک اور رائے بھی ہے۔
”کیا؟“

”یہ کہ تو خود بھی ان معاملات میں دلچسپی لے۔ ہمارے لئے یہ بڑی دلکشی کے حامل ہیں۔“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر غور کیا جاتا تو یہ سچ ہے کہ قاسم خان غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو میرے پیارے دوست! اب کیا فیصلہ ہے تیرا؟“

”فیصلہ ہمارا نہیں تقدیر کا ہے۔ البتہ عمل کے بارے میں ہم فیصلے کر سکتے ہیں۔“

”وہ بھی تقدیر ہی کے فیصلے ہوں گے۔ جو ہمارے لئے عمل متعین کریں گے۔“

”بڑی اچھی بات کہی ہے تو نے۔ جو ہم سوچیں گے وہی ہماری تقدیر کی سوچ ہو گی۔“

”تو پھر بتا! کیا سوچا جائے؟“

”میں بتاؤں؟ زیرِ اش بہت اچھا انسان ہے۔ وہ کبھی بھی یہ بات نہیں کہے گا کہ ہم اس کی بستی چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ مہمان نوازی کی آداب کے خلاف بات ہو گی۔ لیکن جس چیز کو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی اور کے لئے باعثِ تکلیف ہے ہمیں کیا غرض ہے کہ ہم اس کی تکلیفوں میں اضافہ کریں۔ یعنی۔“

”کل دن کی روشنی میں ہم یہ بستی چھوڑ دیں گے۔“

”کہاں جائیں گے؟“

”تقدیر کے فیصلوں کی تلاش میں۔“ قاسم خان نے جواب دیا اور میں اسے دیکھ کر مسکراتے لگا۔ لیکن جب دوسری صبح ہم نے زیرِ اش سے اپنے مقصد کا اظہار کیا تو زیرِ اش ہمیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”میں جانتا ہوں۔ اور واقعی مجھے وہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ جو میں پچھلی رات کہہ چکا ہوں۔“

”کیا سردار زیرِ اش؟“

”یہی کہ مہمان نوازی کے اصولوں کے مطابق مجھے تمہارے لئے ہر تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔“

دیکھا اور میں نے قاسم خان کو۔ اور اس وقت ہم مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ لیکن جب ہمارے لئے تنہائی مسیحا کی گئی تو میں نے قاسم خان سے کہا۔

”قاسم خان! اس خوفناک مکان میں داخلے کے دروازے کو شاید ہم عمر بھر نہ تلاش کر سکیں۔ جس کے ایک دروازے سے ہم اس پر اسرار دنیا میں پہنچے ہیں۔ لیکن اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے۔“ قاسم خان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھا پھر بولا۔

”ایک بات بتاؤ گے؟“

”کیا؟“

”دیکھو زندگی میں کیا کچھ نہیں کیا ہم نے جرم و سزا کی دنیا میں ہمارا بڑا نام ہے شہباز لیکن ایک ایسی دنیا جو ہمارے جیسے دوسرے انسانوں کے تصور سے بھی باہر ہو اگر ہمارے سامنے آتی ہے تو کیا ہم اس کی دلکشی سے انکار کر سکتے ہیں۔“ میں نے حیرت سے قاسم خان کو دیکھا اور کہا۔

”یہ ساری باتیں اپنی جگہ ایک بات میں نے محسوس کی ہے وہ یہ کہ کم از کم اس دنیا میں آنے کے بعد تو انتہائی ہمدرد ہو گیا ہے۔“ قاسم خان پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر بولا۔

”بزدل تو میں کبھی بھی نہیں تھا۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک تحریک ہوتی ہے انسان کے اندر۔ وہ تحریک اس کی فطرت میں رچ بس جاتی ہے۔ اور پھر وہ اسی تحریک کے زیرِ اثر کام کرتا ہے۔ دیکھو! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ ہم اس پر اسرار دنیا میں آ گئے ہیں۔ اور وقت کچھ ایسی شکل اختیار کر گیا ہے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمیں یہاں کسی خاص مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ جب یہ خاص مقصد ہماری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا ہے تو کیوں نہ ہم کوئی ایسا کام کریں۔“

”میں یہی تو کہہ رہا تھا قاسم خان کہ اب تیرے اندر ایک انوکھی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ جب کہ تو ہر نئے کام سے بیزاری کا اعلان کرتا تھا۔“

”سچی بات تو یہ ہے شہباز کہ سارا کام میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہاں کچھ کر کے زیادہ خوشی حاصل ہو رہی ہے اور“

”ٹھیک کہتے ہو لیکن آداب مہمانی کچھ ہوتے ہیں۔ تو آداب میزبانی بھی کچھ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دونوں کو اپنا اپنا فرض پورا کرنا چاہئے۔ تم اپنا فرض پورا کرنے کے لئے تیار ہو تو ہم بھی اپنا فرض پورا کریں گے۔“

”تمہارا فرض کیا ہے؟“

”کہ اب دعائیہ تمہارے پاس پہنچ چکی ہے اور ہمارا بس یہی مقصد تھا۔ تھوڑا سا ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دو۔“

”مگر تم۔“

”نہیں سردار زیرِ اش! اس سلسلے میں ہم تمہاری کسی بات کو نہیں مانیں گے۔“

”مجھے دکھ ہو گا۔“

”لیکن ہمیں نہیں ہو گا۔ اور ہم تمہیں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

”پھر مجھے بتاؤ تمہارے لئے کیا کروں؟“

”نہیں کچھ بھی نہیں۔ بس یوں سمجھ لو ہم جا رہے ہیں۔“

”ایسے نہیں۔“

”پھر۔“

”تمہیں یہاں سے رات کی تاریکیوں میں جانا پڑے گا تاکہ یہ پتہ نہ چلے کہ تم یہاں سے نکلے ہو۔“ ہم نے سردار زیرِ اش کی مشکل کو سمجھا اور اس کے بعد اس کی بات کو تسلیم کر لیا چنانچہ اس رات ہمیں عمدہ قسم کے گھوڑے فراہم کئے گئے۔ کھانے پینے کی اشیاء اور اس کے علاوہ ان علاقوں کے بارے میں تھوڑی سی معلومات اور پھر ہم دونوں نے رات کی تاریکیوں میں اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔



آدھی رات تک یہ سفر جاری رہا چاند کے ساتھ ساتھ ہم اپنی مسافریں طے کر رہے تھے۔ پھر آدھی رات گزری تھی کہ چاند پر دھندلاہٹیں طاری ہونے لگیں۔ جن علاقوں سے ہم گزر رہے تھے۔ چاندنی میں وہ ہمیں بے حد پر اسرار نظر آ رہے تھے۔ نامہ نظر سنگلاخ زمین جس پر جگہ جگہ چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ یہاں بزرے کا نام و نشان نہیں تھا۔ حالانکہ بستی کے قرب و جوار بہت سرسبز تھے۔ لیکن فاصلے طے ہونے کے ساتھ ساتھ درختوں کے سلسلے ختم ہو گئے تھے اور اب پتھریلی زمین کے علاوہ اور کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ جب چاند کی روشنی گرد آلود ہوئی تو ہمیں ایک لمبے کے اندر یہ احساس ہو گیا کہ زور کی آندھی آرہی ہے۔ یہ آندھی جنوب کی جانب سے اٹھ رہی تھی۔ ہم نے گردن گھما کر دیکھا تو ہمارے دل لرز کر رہ گئے۔ ایک سیاہ چادر زمین سے آسمان تک بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ کالی آندھی تھی جس کا رخ اسی جانب تھا۔ ہم دونوں اتنے خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور قاسم خان نے کہا۔

”ہم نہیں کہہ سکتے کہ تقدیر کے فیصلے کیا ہیں؟ لیکن آندھی کی مخالف سمت دوڑو۔ اور کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کرنے کی کوشش کرو جہاں ہم اس خوفناک آندھی سے بچ سکیں۔“ آندھی کے عقب میں اب آہستہ آہستہ گزرگراہٹیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ بھلا مذہب دنیا کے ان غیر مذہب لوگوں نے دنیا کی ہر چیز تو دیکھی تھی لیکن ان قدر ترقی یافتہ کامنا انہیں کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ بڑا ہٹ کیسی ہے؟ لیکن کالی آندھی بڑی برق رفتاری سے ہمارے عقب میں چلی آ رہی تھی۔ شاید ہمارے گھوڑوں نے بھی اس خوفناک کیفیت کو محسوس کر لیا۔ انسانوں سے زیادہ جانوروں کی حس تیز ہوتی ہے۔ گھوڑوں کو آندھی کی مخالف سمت دوڑانے میں ان گھوڑوں کی ذہانت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس گھوڑوں نے خود ہی دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور رفتار ایسی تھی کہ خدا کی پناہ۔ ہم لوگ ماہر گھوڑے سوار نہیں تھے۔

بہترین پناہ گاہ تھا۔ جب ایک بڑی مصیبت سے ہمیں چھٹکارا حاصل ہوا تو ہم نے اس غار کو بغور دیکھا۔ اور پھر یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ یہ غار سامنے سے بے شک غار ہے لیکن آگے چل کر ایک سرنگ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے اور اس سرنگ کے آخری سرے پر مدہم مدہم روشنی لرز رہی ہے۔ جیسے کسی شمع کی روشنی ہو۔ پتہ نہیں قاسم خان نے اس روشنی کو دیکھا تھا یا نہیں۔ لیکن ابھی تک کیونکہ اس نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا اس لئے میں نے اس سے کہا۔

”قاسم خان۔“ اور وہ اس طرح چونک پڑا جیسے خواب سے چونک پڑا ہو۔ اس نے میری جانب دیکھا اور پھر بولا۔

”خدا کی پناہ۔“

”وہ ادھر دیکھو۔“

”کدھر؟“

”وہ سامنے۔“ میں نے اسے اشارہ کیا اور قاسم خان مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”آہ! یہ تو روشنی ہے۔“

”ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی... کوئی ہے؟“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اب ہم جب ان خوفناک واقعات کے درمیان موجود ہیں۔ تو پھر کسی بھی خوفناک

چیز سے ڈرنا میں سمجھتا ہوں اب ہمارے لئے اپنا مذاق اڑانے والی بات ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے قاسم خان سے پوچھا۔

”آؤ دیکھتے ہیں کیسی روشنی ہے؟“ وہ بولا اور میں نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ پھر

میں نے کہا۔

”ساری باتیں اپنی جگہ قاسم خان! لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تمہاری

دلیری نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہاں ان غاروں میں داخل

ہونے کے بعد تم پر کچھ ہوا ہو یا نہیں ہوا ہو۔ لیکن دلیری کی یہ کیفیت طاری ہو گئی

ہے۔“ قاسم خان مسکرا دیا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔

گھوڑوں کی پشت سے گرنے سے بچنے کے لئے اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا کہ ہم گھوڑوں کی پشت سے چمٹ جائیں اور ایسا ہی ہوا۔ ہم نے اپنے ہاتھ گھوڑوں کی گردنوں میں ڈال دیئے تھے۔ اور ان کی پشت پر لیٹ گئے تھے۔ گھوڑے دوڑ رہے تھے اور ایسے دوڑ رہے تھے کہ اگر ان میں سے کسی گھوڑے کو اگر معمول سی ٹھوکر بھی لگ جائے تو اس کے بعد نہ اس کی ہڈیوں کا پتہ چلے نہ اس پر سوار کی ہڈیوں کا۔ اور اس طرح سیاہ طوفان ہمیں دوڑاتا رہا۔ یہاں تک کہ گھوڑے کسی بلندی کا سفر طے کرنے لگے۔ اور اس کے بعد اچانک ہی ہم نے اپنے سروں پر کسی چیز کا سایہ محسوس کیا۔ گھوڑوں نے غالباً کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی تھی۔ جہاں ہم خوفناک آندھی سے ہٹ لے سکیں۔ جب گھوڑے رک گئے تو ہم نے گھوڑوں کی گردنوں کو چھوڑا اور سیدھے ہو گئے۔ عقب میں خوفناک نگاہوں سے دیکھا۔ تو کالا طوفان ہماری جانب بڑھتا ہی چلا رہا تھا۔ ہم گھوڑوں کی پشت سے اتر گئے۔ جس جگہ ہم نے قیام کیا تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا ہمیں۔ لیکن جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کوئی ایسی پہاڑی ہے جو اندر سے کھوکھلی ہے۔ یعنی ایک پہاڑی غار۔ جس میں گھوڑے ہمیں لے آئے تھے۔ اس وقت ان گھوڑوں کا جس قدر شکر گزار ہوا جاتا کم تھا۔ کالا طوفان اپنے ساتھ بڑے بڑے پتھروں کو لڑھکاتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن یہ خوفناک غار چونکہ پہاڑی بلند پر تھا اس لئے خاصاً محفوظ تھا۔ اس کے علاوہ پورے پہاڑ کو اڑانا طوفان کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ ہم لوگوں نے تھوڑی دیر کے بعد پتھروں کی بارش محسوس کی اور الٹا آڑ میں ہو گئے جہاں ہم ان پتھروں کا شکار نہ ہو سکیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے ہم نے باہر کا منظر دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر ہمارے دل لرز گئے کہ ہوا کا یہ شدید طوفان اپنے ساتھ چٹانوں کو لڑھکاتا چلا آ رہا تھا۔ اور یہ گزر گزراہٹ بھی ان ہی چٹانوں تھی۔ بے شمار چٹانیں اس پہاڑ سے ٹکرائیں۔ اور ہم نے غار کو لرزتے ہوئے دیکھا۔ طوفان آن کی آن میں ان پر سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے سکون سکون تھا۔ وہ لرزتے رہے اور طوفان کی حشر سلانیاں دیکھتے رہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد طوفان کی آواز ختم ہو گئی تھی۔ آگے نہ جانے وہ کیا تباہی برپا کرنے کے لئے چلا تھا۔ ہمارے گھوڑے بھی سب سے اور دبکے ہوئے کھڑے تھے۔ بہر حال یہ غار ہمارے

رکھا ہوا تھا۔ اور یوں رکھا ہوا تھا کہ اس کی گردن زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ اور چہرہ ہارے عین سامنے۔ ہم سہمی ہوئی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھنے لگے تو اچانک ہی ہم نے محسوس کیا کہ پروفیسر لنکونا کی آنکھوں کے پونے گردش کر رہے تھے۔ پروفیسر لنکونا کی کاہل موجود ہونا حیرت ناک بات تھی کہ یہ دوسرا حیرت ناک منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اور اس وقت ایک پہاڑی غار میں ہم دو انسان چاہے کتنے ہی دیر کیوں نہ ہوں ایسا منظر اگر کوئی بھی شخص دیکھ لیتا تو اس کی کیفیت ہماری کیفیت سے ٹکف نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سوکھے پتے کی طرح لرز رہے تھے اور ہماری پھٹی پھٹی آنکھیں اس طرف جی ہوئی تھیں۔ لنکونا کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے کہا۔

”وادی سحر میں آنے والا مجھے پہچان تو گئے ہی ہو گے۔ یہ سرمتم نے میرے نون سے اتارا تھا۔ اسکی حقیقت کیا ہے یہ میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ تمہیں جو کچھ بتانا ہے سمجھ لو اور اس وقت میں تمہاری رہنمائی کے لئے موجود ہوں۔ وادی سحر میں فل ہو چکے ہو تم۔ اور ابھی تم نے یہاں کے معاملات سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے۔ میں تمہیں اور کچھ بھی بتا دیتا اور اگر میں تمہیں یہ سب کچھ بتا دوں گا تمہارے ذہن وقت پر کرنے والے فیصلے نہ کر پائیں گے اور تمہیں ان کے لئے یثانی ہوگی۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں وقت کے ساتھ ساتھ ان حالات سے دشمن ہونا چاہئے۔ وہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ اور وہی ضروری بھی ہے۔ تو نواب جب تم یہاں سے واپس جاؤ گے تو اس خانقاہ کے پیچھے تمہیں ایک سیدھا راستہ ملے گا جو گڈنڈی کی شکل کا ہو گا۔ گڈنڈی کے اختتامی حصے پر پہنچو گے تو وہاں نہیں ایک استقبال کرنے والا ملے گا۔ اس سے عدم واقفیت کا اظہار مت کرنا۔ کیونکہ مستقبل میں وہ تمہارے ساتھ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے شریک رہے گا۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ بس سمجھ لو کہ اس کے بعد تمہارے اصل کام کا آغاز ہو گا۔ میں کسی نہ کسی شکل میں تمہاری رہنمائی کرتا ہوا ملوں گا تمہیں۔ سمجھ لو کہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ ہاں جو وعدہ میں نے تم سے لیا ہے اس کے لئے تم یوں سمجھ لیتا کہ میں پہنچے نہیں ہوں گا۔“ لنکونا کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں اور قاسم خان دہشت بھری

”اگر تم مجھے پہلے بزدل سمجھتے تھے تو یہ تمہارا قصور ہے میرا نہیں۔ اگر میں بزدل ہوتا تو جو زندگی ہم گزارتے رہے ہیں۔ وہ نہ گزار پاتے۔“ میں نے قاسم خان کی بات سے اتفاق کیا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں اس عجیب و غریب سرنگ میں آگے بڑھنے لگے۔ جو سیدھی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ ہم اس دہانے کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں سے روشنی خارج ہو رہی تھی۔ قریب سے ہمیں وہ اور زیادہ واضح محسوس ہوئی۔ پہلے رنگ کی اس روشنی میں جو لرزشیں تھیں۔ اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ یقینی طور پر کسی ایسی چیز کی روشنی ہے جسے ہوا لگ رہی ہے۔ جب ہم اس سوراخ سے دوسری جانب پہنچے تو ہم نے دیوار میں لگی ہوئی ان مشعلوں کو دیکھ لیا جو اس عظیم الشان جگہ کو روشن کر رہی تھیں۔ یہ جگہ ایک بڑے ہال کی مانند تھی۔ جہاں پتھروں کی نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ جگہ کے عین درمیان کوئی چیز رکھی ہوئی تھی جو دور سے ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی اس جگہ مدہم سے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن یہ پہاڑی غار اس وقت جس کیفیت کا منظر نظر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارے دلوں میں حیرت برپا ہو گئی۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ میں اور قاسم خان ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ اور یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس پہاڑی غار کی اصل نوعیت کیا ہے۔ اصل میں اگر یہاں مشعلیں نہ لگی ہوتیں تو ہم سمجھ لیتے کہ قدرت کا کارنامہ ہے۔ لیکن مشعلیں تو کم از کم انسانوں ہی کی لگائی ہوئی ہیں۔ پھر درمیان میں یہ کیا چیز رکھی ہوئی ہے اور ہم آہستہ سے اس کے قریب پہنچ گئے۔ پھر تھوڑے فاصلے سے ہم نے دیکھا کہ وہ ایک انسانی جسم ہے۔ جو اس چٹان پر پڑا ہوا ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور چیز رکھی ہوئی تھی۔ جب چند قدم اور آگے بڑھے تو دفعتاً قاسم خان نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روک دیا۔ اور اب ہم نے بغور دیکھا لیا تھا کہ جو انسانی جسم وہاں پڑا ہوا ہے اس کی گردن اس کے شانوں پر نہیں ہے۔ بلکہ گردن کچھ فاصلے پر سیدھی رکھی ہوئی ہے اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ منظر ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس وقت جب ہم نے پروفیسر لنکونا کا سر اس کے تن سے جدا کیا تھا۔ اور تھوڑے فاصلے پر پھینک دیا تھا۔ لیکن بعد میں ہمیں وہ سر جڑا ہوا ملا تھا۔ یہ پروفیسر لنکونا ہی کا سر تھا۔ لیکن وہ اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اپنے بدن سے کچھ فاصلے

نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دلوں میں ابھی لرزشیں تھیں۔ بہر حال یہ کچھ ہو رہا تھا کم از کم اس سے پہلے ہمارا واسطہ کبھی ایسے واقعات سے نہیں پڑا تھا اب ہم میں یہ جرات نہیں ہوئی کہ ہم آگے بڑھ کر لنگوٹا سے کوئی اور سوال کریں۔ طوفان رک چکا تھا۔ یہ پراسرار خانقاہ جسے ابھی ابھی لنگوٹا کے کئے ہوئے سرے خانقاہ نام دیا تھا ہمارے لئے دہشت کا گھر تھی۔ قاسم خان نے کہا۔

”کیا یہاں رکنا چاہو گے؟“

”نہیں... آؤ!“ میں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔ اور ہم دونوں واپسی کے لئے پلٹ پڑے۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم اسی پہاڑی پر تھے۔ ہمارے گھوڑے اب بھی اوجھلے ہوئے تھے اور اب بہتر حالت میں نظر آ رہے تھے۔ جبکہ پہلے انہیں بھی ہم نے انتہائی خوفزدہ دیکھا تھا۔ ہم نے ان کی لگائیں پکڑیں۔ اور وہاں سے نیچے اترنے لگے۔ نیچے تک کا فاصلہ ہم نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ قاسم خان بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اترنے لگے۔

”کسی بھی صورت میں ہم اس پراسرار پہاڑی غار میں نہیں رہ پائیں گے۔ حالانکہ یہ ایک بہتر پناہ گاہ ہے۔“

”ہاں قاسم! ظاہر ہے ہم لوگ پناہ کی تلاش میں یہاں نہیں آئے۔“ قاسم خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ میں نے کہا۔

”اب جب ہم اس نامعلوم وادی میں آئے ہیں جسے وہ وادی سحر کا نام دیتا ہے۔ اپنی سوچ سمجھ کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ کوئی صحیح فیصلہ نہ کر پائیں۔“

”مطلب۔“

”مطلب یہ کہ ہمیں اس کے عقبی حصے کی جانب ہی چلنا چاہئے۔“

”طوفان اس سمت گیا ہے۔“

”ظاہر ہے آگے بڑھتا چلا گیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور ہم دونوں نے اپنے گھوڑے اسی جانب دوڑا

دیئے۔ جدھر طوفان کا رخ تھا۔ اور جدھر کے بارے میں اس پراسرار وجود نے نشان دہی کی تھی۔ یعنی پروفیسر لنگوٹا نے جو اب لنگوٹا بن چکا تھا۔ ہم نے کافی سفر طے کر لیا۔ قاسم خان نے اس دوران کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ پھر جب وہ پہاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور ہمارے سامنے لق و دق میدان پھیلا ہوا نظر آنے لگا۔ تو قاسم خان بولا۔

”کون سا برا وقت تھا جب ہم اس مکان میں داخل ہوئے تھے۔ اور اس کے بعد ہم نے اپنے لالچ کے تحت لنگوٹا کا سراں کے شانوں سے اتار دیا تھا۔“

”گزرے وقت کو کونسا بے مقصد ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمیں آنے والے وقت کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہئے۔“

”آہ نہ جانے ہمارا استقبال کرنے والا کون ہو گا؟“ قاسم خان عجیب سی آواز میں بولا۔ اور میرے ذہن میں بھی متعدد خاکے ابھرنے لگے۔



ہو گئی۔ وہ بے حد خوفناک اور قد آور کالے رنگ کا ریچھ تھا۔ جو ایک شاخ سے لٹکا ہوا ہیر توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ ریچھ کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور میں نے ریچھ کی آنکھوں میں بہ یک وقت نفرت غصے اور شرارت کے آثار ابھرتے پائے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کوئی اور حرکت کرتا۔ ریچھ غراتا ہوا نیچے کود گیا تھا۔ قاسم خان نے جیسے ہی اس بھیانک ریچھ کو دیکھا اس نے اپنے گھوڑے کو فوراً ہی پیچھے کی جانب موڑ لیا۔ اور کافی دور جا کر کھڑا ہوا میری جانب دیکھنے لگا۔ میرا گھوڑا بے شک بدک رہا تھا لیکن میں نے اسے سنبھال لیا۔ میں نے اس سے پہلے اتنی جسارت کا ریچھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ریچھ غنیمت و غضب میں بھرا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ اور نجانے کیوں اس وقت مجھے اس سے خوف نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ میں نے راتفل اتار کر ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔ ریچھ اتنے فاصلے پر تھا کہ میں راتفل آسانی سے استعمال کر سکوں اور اس کے بعد میں نے اس سے زیادہ خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ راتفل گرجی اور ریچھ کی پیشانی کے درمیان سوراخ ہو گیا۔ لیکن اچانک ہی بہت سی آوازیں ابھری تھیں۔ اور میں چونک کر ان آوازوں کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ میرا خیال ایک لمحے کے لئے ان آوازوں کی جانب چلا گیا تھا۔ تب میں نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جو میری جانب بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے جسموں پر چمڑے کے تنگ لباس تھے۔ اور سروں پر انہوں نے عجیب و غریب ساخت کی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ درمیانی جسم لباس سے خالی تھے۔ یہ شاید قرب و جوار کی آبادی کے باشندے تھے۔ لیکن ان کے انداز میں جارحیت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری اس کوشش کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن پھر فوراً ہی ایک قد آور آدمی آگے بڑھا۔ اور مسکراتا ہوا میرے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

”شباباش دلیر جوان شاباش۔ تو نے وہ کام کیا ہے جسے کرنے کے لئے ہم کافی دن سے سرگرداں تھے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے اس شخص سے سوال کیا۔ اس کی روشن آنکھیں چمکتا ہوا چہرہ مجھے پسند آیا تھا۔

”میرا نام غزال ہے۔ ہم بہت دیر سے اس ریچھ کی ناک میں تھے۔ اس نے ہماری بستی کے بہت سے لوگوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہم زندگی کی بازی لگا کر اس کی

وادئ سحر کا یہ سفر بڑا عجیب و غریب تھا۔ مہذب دنیا کے دو انسان یہاں جن کیفیات سے روشناس ہو رہے تھے وہ ناقابل یقین تھیں۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ہم پڑھے لکھے مہذب لوگ نہیں تھے اور غالباً وقت نے ہمارا انتخاب بھی اسی بنیاد پر کیا تھا۔ ہم دونوں کے ذہنوں میں دہشت خیزیاں تھیں۔ اور پھر زیر اش نے ہمیں جس لباس اور جن ہتھیاروں سے آراستہ کر کے بھیجا تھا۔ انہوں نے ہماری شخصیت کو بالکل مقامی لوگوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور دیکھنے والی نگاہ ہمیں اس پر اسرار وادی میں اجنبی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور ہم یہاں کے معاملات سے تقریباً واقف ہوتے رہے تھے۔ اس وقت بھی ہم جس جنگل سے گزر رہے تھے اس کے کنارے کنارے ایک ندی گزرتی تھی اور گھوڑوں نے ندی دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور اس میں منہ ڈال دیا تھا۔ اس شیریں ندی کے پانی سے ہم لوگوں نے بھی اپنے بدن خوب دھوئے تھے۔ اور اتنے دنوں کی گرد ہمارے جسموں سے اتر گئی تھی۔ اور ہم خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہے تھے۔ جب یہ تازگی قائم ہو گئی تو ہم نے گھوڑے ندی کے کنارے کنارے ست رومی سے آگے بڑھنا شروع کر دیے۔ جنگل تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ندی، ندی کے کنارے لگے سایہ دار درخت اور ان درختوں کو چھوتی ٹھنڈی ہوا۔ میں نے قرب و جوار میں نگاہیں دوڑائیں۔ قاسم خان کا گھوڑا میرے گھوڑے سے کوئی چار گز پیچھے تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ پھر ہم ایک درخت کے قریب سے گزرے سارا درخت نیچے سے اوپر تک سرخ سرخ بڑے بڑے بیروں سے بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں رک کر ان بیروں کو توڑوں۔ دفعتاً میری نگاہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے لگائیں کھینچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کی شاخیں زور زور سے ہل رہی ہیں۔ میں ان شاخوں کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیر کے درخت پر کون موجود ہے۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد صورت حال میری نگاہوں کے سامنے واضح

تلاش میں جنگل میں نکلے تھے۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی موت کسی اجنبی کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی جانب بڑھا اور بولا۔

”اور جو شخص مدد کرنے والا ہوتا ہے اس کی عزت بھی کی جاتی ہے۔ اور اس کا احترام بھی۔ کیا وہ شخص تیرا ساتھی ہے؟“ اس نے قاسم خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

”ہاں وہ میرا ساتھی ہے۔“

”ہم تیرے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بہر حال تو ہمارا محسن ہے۔ اور اگر ایک محسن کو اس کے احسان کا صلہ دیئے بغیر جانے دیا جائے تو یہ ناشکر گزاری ہوتی ہے۔ آؤ میری بستی میں آؤ۔ میرے قبیلے کا نام بھی اتفاق سے غازال ہی ہے۔ یعنی میں غازال اور میرا قبیلہ بھی غازال۔ چنانچہ قبیلہ غازال کی طرف سے ہم تم لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آؤ۔“ میں نے قاسم خان کو ساری صورت حل بتائی تو قاسم خان بولا۔

”جانا مناسب ہو گا یا نہیں؟“

”کیا تجھے پروفیسر لکھونا کی بات یاد نہیں ہے؟ اس نے کہا تھا کہ کوئی ہمارا استقبال کرنے کے لئے خود ہم تک پہنچے گا۔“ قاسم خان نے پر خیال انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ غازال ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔ میرے گھوڑے کے ساتھ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”اصل میں ہم پر یہ قہر بہت عرصے سے نازل ہوا ہے۔ میرا قبیلہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور میں ایک سردار کی حیثیت سے اپنے قبیلے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے ان جان فروشوں کے ساتھ اتنی دور نکل آیا ہوں۔ یہاں ہم ان درندوں کا شکار کر رہے ہیں۔ جنہوں نے ہماری بستی میں اندھیر پھیلا رکھی ہے۔ آؤ! تم نہیں جانتے، کتنی مائیں اپنے بچوں سے محروم ہو گئی ہیں ویسے میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں میرے دوست!“

”شہباز۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور تمہارا ساتھی؟“

”یہ قاسم ہے۔“

”اصل میں تم نے جس دلیری کے ساتھ اس خوفناک ریچھ کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہم

نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دلیر لوگوں کو تو ہر طبقے میں محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی چونکہ تم ہمارے محسن بھی ہو۔ ہم تمہاری میزبانی کرنا اپنے لئے فخر سمجھیں گے۔“

”مگر تم اس وقت درندوں کے شکار پر نکلے ہو۔ کیا مجھے قبیلے میں لے جا کر میری میزبانی کرنا تمہارے لئے ضروری ہے؟“ میں نے کہا۔

”مہمان ہر قیمت پر مہمان ہوتا ہے۔ اور محسن ہر قیمت پر محسن۔“

”تو پھر میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں کہ پہلے اپنے قبیلے کی سرحدوں سے ان درندوں کو پاک کر لو۔ پھر اس کے بعد ہمیں شرف میزبانی بخشنا۔ ہم اس دوران تمہاری کاوشوں میں تمہارا ساتھ دیں گے۔“ غازال نے گردن جھکا لی۔ پھر مغموں لہجے میں بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ دلیر لوگ فراخ دل بھی ہوتے ہیں۔“ پھر ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی تکلف تھا ہی نہیں۔ چونکہ میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ بس وادی سحر میں آگیا تھا۔ تو یہاں کے حالات سے بھی نمٹنا ضروری تھا۔ قاسم بھی کسی تردد میں نہیں تھا۔ ریچھ کے جسم کو وہیں چھوڑ کر ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ جگہ جگہ جنگلی درندوں کے نشانات مل رہے تھے اور۔ اس سلسلے میں چونکہ غازال زیادہ تجربہ کار تھا اس لئے وہ قیام کے لئے کسی بہتر جگہ کی تلاش میں لگائیں دوڑا رہا تھا۔ پھر ایک اور مناسب جگہ نظر آگئی۔ جو درختوں کے جھنڈ کے درمیان تھی۔ ہر چند کہ یہ جگہ درندوں کا ممکن ہو سکتی تھی۔ لیکن جب انسان کسی جگہ پہنچ جاتے ہیں تو پھر کوئی ذی روح ان کے سامنے قدم نہیں جما سکتا۔ ہم نے وہیں پر اپنی قیام گاہ بنالی۔ غازال نے گھوڑوں کو خاص طور سے محفوظ مقام دیا تھا۔ اس نے کہا۔

”جنگل کے ان خوفناک درندوں نے بہت سے جانوروں کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ اس لئے ہم گھوڑوں کی حفاظت کا خاص بندوبست رکھتے ہیں۔ اب اس وقت کے لئے ہمیں اجازت دو۔ ہمیں ذرا کچھ کام کرنا ہے۔“ اور یہ کام ہرن اور چیتل کا شکار تھا۔ نئے لے کر وہ چند ہی لمحوں میں وہاں پہنچ گئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے ہرنوں کو آگ پر بھوننا شروع کر دیا۔ گوشت بھننے کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ اور رات کا کھانا بہت عمدگی سے کھایا گیا۔ گھوڑے درخت کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ پھرے داروں

”بس یہاں سے تھوڑے فاصلے پر۔“ غزال وہاں جانے کے لئے تیار ہوا۔ میں اور قاسم بھی اس کے ساتھ چل پڑے تھے۔ اور پھر ہم نے اس لاش کو دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ لاش کا جسم بالکل گوشت کا لو تھڑا بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسی کسی نے چھری سے اس کے بدن کی کھال اتار لی ہو۔ جگہ جگہ شیر کے پنچوں کی خراشیں تھیں۔ شیر نے اسے توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ غزال غمزہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”تم لوگ اس کی لاش اٹھا کر لے جاؤ۔“ اور اس کے ساتھی اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ غزال نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”فرزا بہت اچھا انسان تھا۔ خوش مزاج، دلیر، آہ! ایسا بہت بار ہوا ہے۔ ان دنوں قبیلہ غزال ان ہی مشکلات کا شکار ہے۔“ غزال بہت غمزہ تھا۔ میں اور قاسم بہر حال ان سارے واقعات سے اس لئے متاثر تھے کہ ہمارے لئے یہ سب کچھ بہت اجنبی تھا۔ البتہ اپنی اقامت گاہ پر پہنچ کر قاسم نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”ہر چند کہ درختوں پر پریدار موجود ہیں۔ لیکن کیا ہم ان پھر بھروسہ کر سکتے ہیں؟“

”مطلب؟“

”جو لاش دیکھی ہے۔ اسے دیکھنے کی بعد میرا تو دل چاہتا ہے کہ درخت کی کسی چوٹی پر رات گزاروں۔“

”اور صبح کو ہم تمہاری ٹوٹی ہوئی ہڈیاں اٹھا کر یہاں کسی گہرائی میں دفن کر دیں۔“

میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”درخت کی جب شاخ پر تم سو سکتے ہو؟“

”یہ تو میں زمین پر بھی نہیں سکتا۔“

بہر حال یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے تو زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قاسم واقعی سونے نہیں پائے گا۔ پھر مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ گیدڑوں نے چیخا شروع کر دیا۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ گیدڑوں کی آواز سے پھیکی چاندنی میں لپٹے ہوئے جنگل کی ہیبت ناکی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی ہم نے شیر کی خوفناک آواز سنی۔ میں نے پھرتی سے

کو درختوں پر چڑھا دیا گیا تھا پھر وہ مختلف باتیں کرنے لگے۔ غزال انہیں اپنے قبیلے کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا تھا۔ دوسری صبح یہاں سے سفر کا آغاز کر دیا گیا۔ اور ہم تمہ ضرورتوں سے فارغ ہو کر آگے بڑھ گئے۔ ہم نے ندی کا راستہ اختیار کیا تھا اور چوکے انداز میں رانفلیں سیدھی کئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن کافی طویل سفر کے بعد بھی ہمیں کوئی درندہ نظر نہیں آیا۔ جبکہ درندوں کے پیروں کے نشانات جگہ جگہ مل رہے تھے۔ آگے چل کر اس ندی کے بننے کی رفتار کافی تیز ہو گئی تھی۔ اور اس کا شور کان پھاڑے دے رہا تھا۔ سورج کی کرنیں سنہری ہو گئیں۔ اور ماحول میں ہلکی سی خنکی پیدا ہو گئی۔ ندی کی لہریں سورج کی کرنوں سے ہم آہنگ ہو کر چاندی بکھیر رہی تھیں۔ آگے چل کر دریا کی رفتار کافی تیز ہو گئی تھی۔ وہ چھوٹی بڑی چٹانوں کو روندنا شیب میں بہہ رہا تھا۔ یہاں وزنی پتھر آپس میں رگڑ کھا کر شفاف اور چکنے ہو گئے تھے۔ اور اس سے آگے ایک سرسبز و شاداب علاقہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں اک جھرنّا گر رہا تھا۔ جھرنّا کی مترنم آواز بھی کانوں میں رس گھولتی محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کے نیچے وادی میں شمال کی طرف اونچی اونچی گھاس کا وسیع و عریض جنگل بکھرا ہوا تھا۔ اور عین وسط میں ایک خوفناک سیاہ رنگ کا پہاڑی ٹیلہ ابھرا ہوا تھا۔ شام کے دھندلکے ابھر آئے۔ اور قرب و جوار کے ماحول پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میری چھٹی حس نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ تو اس وقت تقریباً نیم تاریکی پھیل گئی تھی۔ جب دو آدمی دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ اور ان میں سے ایک نے آتے ہی فوراً کہا۔

”سردار غزال۔ فرزا، فرزا۔“ غزال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”کیا ہوا؟“

”فرزا کو شیر نے ہلاک کر دیا۔“

”کہاں، کیسے؟“ غزال نے وحشت زدہ انداز میں پوچھا۔

”یہاں سے کچھ فاصلے پر وہ جانوروں کو دیکھتا پھر رہا تھا کہ وہ غائب ہو گیا۔ ہم اسے تلاش کرتے پھرے اور اب ہم اس کی لاش دیکھ کر آ رہے ہیں۔ شیر نے اس کے بدن کے چیتھڑے اڑا دیئے ہیں۔ اس کے گھوڑے کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔“

”کدھر ہے وہ؟ کتنے فاصلے پر ہے؟“ غزال نے پوچھا۔

تب میں درخت کی شاخ سے کودا۔ نیچے کے لوگ نہ جانے گولیوں کی آواز سن کر کن کیفیتوں کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن میں آہستہ آہستہ اسی سیاہ ٹیلے کی طرف پہنچ گیا۔ جو میں نے دن کی روشنی میں دیکھا تھا۔ شیر کی غراہٹیں ادھر سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ شیر کہیں آس پاس موجود تھا۔ لیکن دوسرے لمحے ایک اور واقعہ ہوا جس سے میں حیران رہ گیا۔ کئی گولیاں میرے سر کے پاس سے گزری تھیں۔ یقیناً یہ گولیاں شیر پر نہیں چلائی گئی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ گولیاں مجھ پر کیوں چلائی گئی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی غلط فہمی ہو۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اپنی جگہ سے ذرا سا ہٹا ہی تھا کہ ایک بار پھر دو گولیاں یکے بعد دیگرے چلیں۔ اور اس بار واقعی میری تقدیر اچھی تھی۔ اچانک مجھے ایک سمت سے آہٹ سنائی دی اور میں نے بے دھڑک گولی داغ دی۔ لیکن اس کا نتیجہ جو برآمد ہوا اس سے میں بھی بہت حیران ہوا۔ یہ ایک انسانی چیخ تھی۔ میں نے اب اس کی جانب چھلانگ لگا دی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں غزال یا اس کا کوئی آدمی میرے ہاتھوں شکار نہ ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو بہت افسوس ناک بات ہو گی۔ اصل میں مجھے شیر کا ہی شبہ تھا۔ جس کی بنیاد پر میں نے گولی چلائی تھی۔ ان چلتی ہوئی گولیوں کے بارے میں اپنے ذہن میں یہی تصور کر لیا تھا میں نے۔ ہو سکتا ہے غزال کا کوئی ساتھی اس طرف موجود ہو۔ بہر حال میں نے اپنی گولی سے شکار ہونے والے کے قریب پہنچ کر اسے دیکھا۔ اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ چہرہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔ کم از کم غزال کے ساتھ نظر آنے والوں میں سے اس کے نقش و نگار اور رنگت کا کوئی چہرہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ غزال اور اس کے قبیلے کے نقوش کسی حد تک سیاہی مائل اور ایک خاص حیثیت لئے ہوئے تھے۔ لیکن یہ چہرہ تانبے کی رنگت کا تھا اور اس کے نقوش بھی تیکھے اور جاذب نظر تھے۔ میں نے بغور اسے دیکھا اس کے سینے سے خون کی دھاریں ابل رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد میں نے غزال اور اس کے ساتھیوں کو اپنی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا۔ غزال نے مجھے آواز دی تھی۔

”شہباز، شہباز۔ کہاں ہو تم؟“ تب میں نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا اور غزال اور اس کے ساتھی میرے قریب پہنچ گئے۔

رائفل نکال لی تھی۔ دوسرے لوگ بھی جاگ گئے تھے۔ شیر تھوڑے وقفے سے کئی بار دھاڑا۔ اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لیکن قاسم خان میرے پاس آ بیٹھا تھا۔ تو اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”میں دنیا کی ہر چیز سے لڑ سکتا ہوں لیکن جنگل کا ماحول میرے لئے اجنبی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہا ہے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور اس کی بعد درحقیقت میں نے یہ فیصلہ کیا کہ درخت کی کوئی شاخ ہمارے لئے بہتر ہے۔ میں نے قاسم خان سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

”پیارے بھائی! مجھے ایسے ہی درخت کی کسی شاخ پر لے چلو۔ یہ زمیں شاید آج کی رات میرے لئے موت کی زمین ثابت ہو۔“ پھر میں نے اس بات پر اتفاق کر لیا۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ شیر کی آواز قریب ہی سنائی دی تھی۔ اور پھر میں نہیں چاہتا تھا کہ قاسم کو کوئی نقصان پہنچے۔ میں شاید اسے پہنچنے والے نقصان سے اپنے آپ کو کسی بھی طرح دوچار نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دیر تک چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے رہے۔ لیکن شیر قریب نظر نہیں آیا تھا۔ ہاں تھوڑی سی آگہی اس بات کی ہو گئی تھی کہ شیر کی آواز کون سی طرف سے آئی ہے۔ یقینی طور پر وہ کافی فاصلے پر بائیں سمت لمبی لمبی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ ویسے اس کی تلاش میں نکلنا بھی خطرناک تھا اور یہ بات ہم نے سیانوں کی زبانی سنی تھی۔ نہ جانے جاگتے ہوئے کتنی رات گزر گئی۔ میں خود بھی آنکھیں پھاڑے اس لمبی گھاس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لمبی لمبی گھاس ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تو میں نے رائفل سیدھی کر لی۔ اس وقت نیچے کے لوگ نیم غنودگی کا شکار ہو گئے تھے۔ شیر کی آواز شاید ان کے لئے کوئی اجنبی آواز نہیں تھی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا۔ پھر میں نے جھاڑیوں سے شیر کو نکلتے دیکھ لیا۔ قاسم خان بھی اس وقت سو ہی رہا تھا۔ شاخ پر وہ جس طرح بندر کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بار بار ہنسی آ رہی تھی۔ باقی تمام لوگ بھی شیر کی اس پراسرار آمد سے واقف نہیں تھے۔ لیکن میں نے وہیں سے نشانہ لیا۔ دو فائر کئے اور گولیاں شیر کے جسم میں پوست ہو گئیں۔ زخم کھاتے ہی شیر خوفناک انداز میں دھاڑا۔ اور اس کے بعد پوری قوت سے ایک لمبی زقذ لگا کر ایک سمت دوڑنے لگا۔ میں نے اس پر دو فائر اور کئے لیکن چونکہ شیر دوڑ رہا تھا اور اس کی رفتار بے پناہ تھی اس لئے گولیاں اس پر کارگر نہیں ہوئیں۔

”کیا ہوا؟ کیا ہو گیا۔ کیا تم نے شیر پر حملہ کیا تھا؟“

”ہاں! لیکن شکار یہ ہو گیا۔“ میں نے اس شخص کی جانب اشارہ کیا۔ ابھی تک غزال نے شاید جھاڑیوں میں پڑی ہوئی اس لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ اب اس کی نگاہ میرے اشارے پر اس لاش پر پڑی تو حیرت سے اچھل پڑا۔

”یہ۔۔۔ یہ تو انسان ہے۔“

”ہاں۔“

”لیکن یہ کون ہے؟“

”یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو غزال۔ ذرا جھک کر غور سے اس کا چہرہ دیکھو۔“ غزال مرنے والے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے سینے سے خون اب بھی مسلسل بہہ رہا تھا۔ اور وہ حیرانی سے بولا۔

”آہ! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو سندالیہ ہے۔ کوئی سندالیہ۔“

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ تو غزال کے چہرے پر گہرے تردد کے آثار بکھر گئے۔ پھر اس نے کہا۔

”سندالیہ ایک لمبی کمانی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مگر یہ؟“

”اس نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ اور میں بال بال بچ گیا۔ اس کے باوجود میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت میری گولی کا شکار جو ہو رہا ہے وہ کوئی انسان ہے۔ میں نے اسے درندہ سمجھ کر گولی چلائی تھی۔ پھر جب مجھے انسانی چیخ سنائی دی تو میں نے اسے دیکھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک انسان ہے۔ اور تم سندالیوں کے بارے میں مجھے کیا بتانے جا رہے تھے؟“

”آؤ میں تمہیں اطمینان سے ان سندالیوں کی کمانی سناؤں گا۔“ غزال بولا اور اس کے بعد اس لاش کو وہاں سے اٹھا لیا گیا۔ شیر کے بارے میں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ دو گولیاں کھانے کے بعد اس کی کیا حالت ہوئی ہے؟ لیکن کم از کم مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔ زخمی شیر ویسے تو خطرناک ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ زیادہ زخمی ہو گیا ہے جیسا کہ میرا اندازہ تھا تو یقینی طور پر کسی نہ کسی جھاڑی کے

درمیان وہ دم توڑ دے گا۔ ہم اپنی جگہ آ گئے۔ قائم خان بالکل میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اور اس سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ لاش کو بغور دیکھا گیا۔ غزال اور اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا تجزیہ کیا۔ یہ بات تو غزال پہلے ہی لمحے میں کہہ چکا تھا کہ یہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ وہ دیر تک اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ پھر اچانک ہی کسی خیال کے تحت میں نے غزال سے سوال کیا۔

”غزال! کیا تم نے کوئی ایسی شے دیکھ کر اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ جس پر تمہیں کسی درندے کا شبہ ہوا ہو؟“

”ہرگز نہیں۔ شہباز ہم نے تمہاری رائفل کی آواز سنی تھی۔ اور اس کے بعد تمہاری جانب دوڑ پڑے تھے۔ پھر ہمیں اور بھی بہت سی گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ لیکن ہم میں سے کسی ایک نے بھی فائر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ صورت حال کا ہمیں صحیح اندازہ نہیں تھا۔ ہم تقریباً گہری نیند کے عالم میں تھے۔“ میں نے اس بار ذرا پر تکلف انداز میں اس لاش کو دیکھا اس کا مطلب تھا کہ اسی شخص نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ پھر میں نے غزال سے کہا۔

”اور اب تم مجھے سندالیوں کے بارے میں بتاؤ گے۔ کیا سندالیہ کوئی قبیلہ ہے؟“

”نہیں یہی تو ایک بات ہے کہ وہ قبیلہ نہیں ہے۔ بات خاصی قدیم ہے اور تم یوں سمجھ لو کہ ایک طرح سے یہ ہمارے ہاں ایک قدیم روایت کے طو پر مشہور ہے۔ کہ کسی اجنبی سرزمین سے ایک انسانوں سے بھرا ہوا جہاز ہمارے علاقے کے ساحل پر آکر لگا تھا۔ اس سے عورتیں، مرد اور بچے نیچے آئے تھے۔ اور انہوں نے ایک وادی پر قبضہ کر کے وہاں اپنی زندگی گزارنے کا کام شروع کیا لیکن قرب و جوار میں آباد قبائل ان کی وہاں موجودگی برداشت نہیں کر سکے۔ اور وہ آپس میں جنگیں کرنے لگے۔ البتہ ان جنگوں میں مقامی لوگوں نے محسوس کیا کہ باہر سے آنے والے خاصی جنگ و جدل کے ماہر لوگ ہیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو شدید نقصانات پہنچائے تھے۔ وہ جدید ترین ذریعہ جنگ جانتے تھے۔ البتہ انہوں نے کئی بار یہ کوشش کی کہ ان کے اور مقامی لوگوں کے درمیان سمجھوتا ہو جائے۔ مقامی لوگ انہیں اپنے درمیان رہنے کی اجازت دے دیں۔ ابتدا میں انہوں نے بڑی پیش کشیں کیں اور کہا کہ وہ اناج اگلنے کے ماہر ہیں۔ اور زندگی کے دوسرے کام بھی جانتے ہیں۔ تو وہ مقامی لوگوں کی مدد کریں

ہے میں نے زخمی کیا تھا۔ بہر حال شیر کی موت کے بعد صورت حال خاصی دلچسپ ہو گئی تھی اور ہم آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی ایسی بات نہ رہی ہو جو قابل تکلف ہو۔ غزال ہمارا دوست بن گیا تھا۔ اور ان علاقوں میں ہم لوگ اب اجنبیوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اچھے دوست اور ساتھی کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ بہت دن اسی انداز میں گزر گئے۔ اور میں اس بات سے خوش تھا کہ ایک نئی دنیا کا نظارہ کرنے کو ملا۔ اکثر میں قاسم خان سے اس بارے میں کہتا تھا تو قاسم خان ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتا تھا۔

”جگہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ علاقے بھی بہت حسین ہیں۔ لیکن بس نہ جانے کیوں اپنی دنیا کی بات ہی اور ہوتی ہے۔“ آخر کار ہم غزال کی بستی پہنچ گئے۔ بہت اچھی جگہ تھی قبیلہ غزال یہاں آباد تھا۔ غزال نے جو رہائش گاہ ہم لوگوں کو رہنے کے لئے دی تھی وہ بہت شاندار تھی۔ اور ہم یہاں آکر ان لوگوں کو بڑے دلچسپ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ عورتیں مرد بچے سارے کے سارے بڑے خوش شکل اور تندرست نظر آتے تھے۔ پھر اس کے بعد قرب و جوار کا اندازہ کیا جانے لگا۔ غزال نے کہا۔

”اصل میں ہماری سندالیوں سے قدیم دشمنی چلی آ رہی ہے۔ ان آبادیوں میں ان سندالیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کوئی بھی سندالی اگر کہیں مل جائے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ سندالی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔“ سندالیوں کی کمائیاں ہمیں پر اسرار لگی تھیں۔ لیکن بہر حال یہ ان لوگوں کا معاملہ تھا۔ بستی غزال میں قیام ہمارے لئے دلچسپ حیثیت کا حامل ثابت ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ مقامی لوگ ہم سے بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ ہر چند کہ بیشتر بار ہمارے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ ہمارا مقصد کیا ہے؟ ہم تو تہذیب کی دنیا کے لوگ تھے۔ زمانہ قدیم کے نابلدوں میں طرز زندگی بھی قدیم ہی تھا۔ البتہ رائفلوں اور آتشیں ہتھیاروں کا استعمال خاص تعجب خیز تھا۔ ہو سکتا ہے کسی ذریعے سے انہیں ان ہتھیاروں کا استعمال آیا ہو۔ پھر ہماری ملاقات روہن سے ہوئی۔ یہ غزال کا ایک امیر زادہ تھا۔ سرے پاؤں تک احمت۔ بڑی جسامت کا مالک۔ ہر شوق پورا کرنے کے لئے تیار۔ شبنی خورہ بد قسمتی سے قاسم خان کو مقابلے کی دعوت دے بیٹھا۔ متبادل نشانہ بازی کا تھا۔ ساری باتیں اپنی

گے۔ انہیں خوشحال کر دیں گے۔ بہر حال مقامی لوگوں نے انکا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا اور کیونکہ مقامی لوگوں نے انہیں ایک لمحے کے لئے سکون نہیں لینے دیا تھا وہ کہتے ہی جنگ جو تھے لیکن بہر حال مقامی لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مصلحت سے کام لے کر اپنے آپ کو منتشر کر لیا۔ انہوں نے اپنے چہرے کے نقش و نگار تبدیل کئے۔ مقامی لوگوں کا سا روپ دھارا۔ اور چھپ چھپ کر زندگی گزارنے لگے۔ چنانچہ ان پوشیدہ لوگوں کو سندالیہ کہتے ہیں۔ آج بھی ان کے اور مقامی لوگوں کے درمیان جنگ چل رہی ہے۔“ میں اور قاسم ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ یہ وحشت کی دنیا تھا۔ سحر کی وادی تھی۔ ہم اس بارے میں کیا کہہ سکتے تھے سوائے خاموش رہنے کے۔ ایسی صورت حال میں تو کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غرض یہ کہ یہ سارا معاملہ چلتا رہا۔ اور ہم لوگ اس بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ بعد میں میں نے قاسم خان کو ساری تفصیل بتائی۔ تو قاسم خان نے کہا۔

”خیر! ظاہر ہے مجھے یہاں آباد نہیں ہونا“ اور مجھے اس علاقے میں زندگی نہیں گزارنی اس لئے میں اس مسئلے میں اپنی ٹانگیں نہیں اڑانا چاہتا۔ اور نہ ہی ان حالات پر کوئی تبصرہ کرنے کا خواہش مند ہوں۔ لیکن سندالیوں نے جو پیش کش کی تھی۔ اور اس کے بعد مقامی لوگوں نے جو ان کے ساتھ سلوک کیا وہ ایک الگ حیثیت کا حامل ہے۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کا یہ سب کچھ کرنا بھی جائز۔ لیکن اس نے تم پر گولیاں کیوں چلائی تھیں؟“

”کاش میں تمہیں بتا سکتا۔“ ہم لوگ خاموش ہو گئے تھے۔

ایک بار پھر ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ لیکن رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب اچانک ایک گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سنائی دی۔ اور کچھ لمحوں کے بعد سب ہی جاگ گئے۔ کیونکہ ساتھ ساتھ شیر کی غرائیں بھی ابھری تھیں۔ روشنیوں کی گئیں۔ اور یہ دیکھ لیا گیا کہ شیر نے ایک گھوڑے کو ہلاک کر دیا ہے۔ لیکن اسی وقت قاسم خان نے خاصی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے رائفل سنبھالی اور گولی چلا دی۔ شیر کی خوفناک دھاڑ سنائی دی تھی۔ ہم نے اسے کئی فٹ اونچا اچھلتے ہوئے دیکھا اور قاسم خان نے نہایت مہارت کے ساتھ دوسری گولی بھی اس پر داغ دی۔ شیر کا وزنی جسم اچٹلا اور پھر اس زور سے زمین پر گرا کہ لوگوں کے دل دہل گئے۔ بہت بڑا شیر تھا۔ اور وہی شیر تھا

جگہ لیکن قاسم خان لاتعداد ایسی صلاحیتوں کا ملک تھا جن کے بارے میں دعوے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی تھی کہ وہ صلاحیتیں اس کے اندر کہاں سے منتقل ہوئیں۔ چونکہ پروفیسر انکو یا لنگونا دوبارہ ملنے کے باوجود ہم لوگوں کو یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکا تھا بس وہ اپنے مقصد کے لئے ہم لوگوں کو استعمال کر رہا تھا۔ یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں اور ہم لنگونا پر تاؤ کھاتے رہتے تھے۔ لیکن بہر حال اس جادوگری سے نکلنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ پھر روہن کی اور عادتوں کے بارے میں پتہ چلا اپنے قبیلے کی حسین ترین لڑکیوں سے وہ بہت زیادہ قربتوں کا اظہار کرتا تھا اور اس سلسلے میں خاصی گپ بازی بھی۔ چنانچہ قاسم خان کو ایک شاندار موقع مل گیا۔ اب وہ زیادہ تر روہن کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اور روہن کو بے وقوف بنانا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی میں بھی اس کی دلچسپیوں میں شریک ہو جاتا تھا۔ ویسے کئی بار میں نے قاسم خان سے کہا تھا کہ بہر حال یہ ایک اجنبی جگہ ہے۔ اور ہم اس بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ آگے کیا ہو؟ اس لئے کسی مقامی شخص کو اپنی شرارتوں کا نشانہ بنانا ممکن ہے نہ مناسب۔ اس کے جواب میں قاسم خان نے کہا تھا۔

”دیکھو اب اس جگہ سے زندگی بچا کر واپس لے جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ کیوں نہ آزادی سے زندگی بسر کی جائے۔“

”لیکن کچھ اصولوں کے ساتھ۔“

”برا نہ مانا شہباز۔ اب بھلا اصول وصول کہاں رہ سکتے ہیں۔ جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں رہا تو اصولوں کو کونسی زندگی سے منسلک کریں۔“ بہر حال تفریح ہو رہی تھی۔ روہن کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں کہ وہ درندوں کے شکار کے لئے اپنی ٹولی بنا کر جنگلوں میں نکلنے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ قاسم خان نے مجھ سے کہا۔

”اور ہم قبیلہ غازال کے پابند تو نہیں ہیں کہ محدود رہیں۔“

”مطلب؟“

”روہن کا پیچھا کریں گے اور اسے شکار کرتے دیکھیں گے۔“ میں نے اس بات سے اسے منع نہیں کیا تھا۔ بہر حال غازال کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ ہمیں اس کی تلاش میں جانا ہے۔ قاسم خان اپنی تفریح میں مشغول تھا۔ چنانچہ ہم سے پہلے وہ اپنا گھوڑا لے کر نکل گیا۔ بعد میں میں نے اس سلسلے میں آگے

”مشرقی علاقے میں نکل آئے۔ غازال نے کہا۔“

”مشرقی علاقے میں تھوڑا سا آگے چلنے کے بعد دریائے سانا بہتا ہے۔ یہ دریا تائی قدیم روایتوں کا حامل ہے۔ اور اس سے لاتعداد پراسرار روایتیں منسوب ہیں۔ دل ترین دریا ہے۔ نہ جانے کہاں سے بہتا ہوا آتا ہے۔ اور یہ نہیں معلوم کہ اس نالہائی کتنی ہے۔ آج تک کوئی بھی اس بارے میں صحیح معلومات حاصل کر کے واپس نہیں آ سکا۔ اس کے کنارے کچھ ایسے ٹھکانے موجود ہیں۔ جن میں بڑے بڑے غار بنے ہوئے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ غاروں میں سنا لیتے رہتے ہیں۔“

”کیا خیال ہے؟ سنا لیلوں کو تلاش کرنا پسند کرو گے؟“

”تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ایک سنا لیل کی زندگی کا خاتمہ لاتعداد برکتوں کا حامل آتا ہے۔ یہ بات ہمارے وجود میں درج کر دی گئی ہے۔“

”تو پھر آؤ چلیں۔“ میں نے کہا اور غازال نے خوشی سے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔

”اب ہم دونوں دریائے سانا کی طرف چل پڑے۔ صبح سے دوپہر تک کا سفر بہت بکون گزرا۔ گھنے جنگل جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن محسوس ہوتا تھا کہ یہاں اندے موجود نہیں ہیں۔ پھر اس وقت سورج بلندی پر پہنچ چکا تھا جب ہم دریائے سانا پہنچے میں نے غازال سے دریا کے معاملے میں تفصیلات معلوم کر لی تھیں۔ ہم نے مل پہنچنے کے بعد اپنے گھوڑے چھوڑ دیئے۔ تاکہ وہ پانی پی لیں اور اپنے لئے دراک تلاش کر لیں۔ سرسبز و شاداب گھاس کے قطعے کے قطعے تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھے میں نے ایک درخت کی آڑ سے دریا کے کنارے پھیل ہوئی چٹانوں اور غاروں کا سلسلہ دیکھا۔ ان بڑی بڑی چٹانوں کے علاوہ جھوٹی چٹانیں اور پتھر بھی لاتعداد پھیلے ہوئے تھے۔ ہم دونوں اپنی رائفلیں سنبھالے وہاں سے آگے بڑھے۔ اور نوڑے فاصلے پر پتھروں پر جا بیٹھے۔ ہماری نگاہیں دور دور تک بٹھک رہی تھیں۔ غازال نے غالباً اس تجسس کا شکار تھا۔ جو اس وقت میرے ذہن میں موجود تھا۔ یعنی کسی سنا لیل

کی تلاش۔ پھر اچانک ہی اس نے میری توجہ اشارے سے ایک جانب مبذول کرالیا۔ دریائے سنا میں ایک انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔ جو پانی کی لہروں کے ساتھ ست روی آگے بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ یہاں دریا کا بہاؤ بہت زیادہ تیز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ علاقہ تھا اور جگہ جگہ دریا کے اندر بھی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس انسانی جسم کی پانی پر بہنے کی رفتار بہت سست تھی۔ ہم دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس جانب دوڑ پڑے۔ غزال نے کہا۔

”یا تو یہ کوئی لاش ہے یا ممکن ہے کوئی بے ہوش زندہ شخص جو کوئی بھی ہے مگر ہے سندالی ہو۔“ چنانچہ ہم پہاڑی پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ایک ایسی جگہ جا کھڑے ہوئے جہاں آنکھ کی سیدھ میں وہ انسانی جسم آ رہا تھا۔ ہم بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اور پھر ہم جب اس کے قریب پہنچے تو میں پانی میں اتر گیا۔ اور میں نے اس انسانی جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ نوجوان آدمی تھا اور یقینی طور پر اپنے نقوش سندالی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ نیلاہٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اسے پانی اوپر اٹھا لیا۔ اور اس کے بعد اسے بازوؤں میں سنبھالے کنارے کنارے چل پڑا۔ غزال میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ اور میں نے غزال سے کہا۔

”یہ زندہ ہے۔“

”لیکن اپنے نقوش سے سندالی معلوم ہوتا ہے۔ کیا ہم اسے ہلاک کر دیں۔“
”نہیں غزال اگر یہ اس عالم میں ہوتا کہ اسے ہلاک کر کے ہمیں خوشی ہوتی شاید میں تمہیں نہ روکتا۔ لیکن ایک بے ہوش بے بس اور نیم مردہ شخص کو ہلاک کر میں سمجھتا ہوں انسانیت کے خلاف ہے۔“ غزال عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر گیا۔ میں نے کہا۔

”آؤ میری مدد کرو۔ کیوں نہ اسے گرم کپڑوں میں ڈھک دیا جائے۔ یہ کام تم کئے دیتا ہوں تم جلدی سے وہ سوکھی لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کرو۔ اگر اسے گرم نہ ملی تو شاید یہ زندگی نہ پاسکے۔“ غزال کی اندرونی کیفیت کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کیونکہ بہر حال وہ قدیم رسموں کی بنیاد پر سندالیوں سے اپنی نفرت کا اظہار کر چکا تھا لیکن بہر حال وہ مجھ سے بہترین تعاون کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کی جسمانی مدد کی

نوجوان آدمی تھا۔ میں نے اس کے بدن پر زخم دیکھے۔ جو صرف پتھروں پر ٹکرانے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ کوئی زخم گہرا نہیں تھا۔ اس دوران غزال تیز آگ بھڑکا چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے نوجوان کو آگ کے قریب لٹا دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی ہلاتیں ختم ہونے لگیں۔ غالباً سرد ترین پانی میں کئی گھنٹے تک بہنے سے اس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ لیکن اب ہم اسے خاصی بہتر حالت میں پا رہے تھے۔ اور ہمارے زہنوں میں اس کے بارے میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ میں غزال کے بارے میں تو مکمل طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن بہر حال میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی تھی۔ وہ زندگی کی جانب لوٹ رہا تھا۔ ہم اس کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ اسے گرمی پہنچاتے رہیں۔ پھر تھوڑی سی غذا کا بندوبست بھی کر لیا گیا۔ اور اب اس کی زندگی بچ گئی تھی۔ نوجوان نے اپنی آنکھیں کھولیں اس کی آنکھوں میں زندگی کی تیز چمک تھی۔ خوبصورت نقوش کے ساتھ آنکھیں بھی بہت حسین تھیں۔ میں نے جھک کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ تو اچانک ہی اس نے اپنے پورے بدن کو جھنجھٹا دیا۔ اور اس طرح تڑپا کہ ہمیں اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تب میں نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔

”تو ابھی اٹھنے کے قابل نہیں ہے دوست! آرام کر۔ ہم تیرے دشمن نہیں ہیں۔“ میں نے ایک لمحے کے اندر محسوس کر لیا تھا کہ وہ کافی طاقتور ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت تھی اور وہ کسی اجنبی اور ٹانوس زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اسے قابو میں رکھا گیا تھا۔ اور ہم نے چڑے کے تسموں سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے تھے۔ غزال نے کہا۔

”افسوس کے اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”غزال مجھے ایک بات بتا۔“

”کیا؟“

”اگر ہم اسے بستی لے جائیں تو کیا ایک سندالی کی حیثیت سے بستی کے لوگ اس سے دشمنی کا اظہار نہیں کریں گے۔“

”سو فیصدی کریں گے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ایک سندالی کو قتل کرنا لازماً برکتوں کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اور یہ برکتیں حاصل کرنے کی ہر شخص کو شل ہے۔“

”پھر بول کیا کریں؟“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”دیکھو جیسا کہ تم میرے بارے میں جانتے ہو کہ میں تم لوگوں کے درمیان ہوں۔ ہم لوگوں کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔“

”کیا؟“

”اس کو قتل کرو گے بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن ہو سکتا ہے ہم اس سے ایسی کار آمد معلومات حاصل کر لیں جس سے تمہیں یا تمہاری بستی والوں کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“ وہ کچھ سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔

”ایسی صورت میں ہم اسے بستی میں لے جاسکتے ہیں اور اگر مجھ سے کوئی سوا کیا گیا تو میں بستی والوں کو یہی جواب دوں گا۔“

”تب پھر ضروری ہے کہ ہم اسے بستی لے جائیں۔“

”جیسے تم مناسب سمجھو۔“ چنانچہ میں اپنے طور پر اپنی معلومات کے مطابق ہتھیاریاں کرنے لگا۔ سب سے پہلے میں نوجوان کو مکمل طور پر زندگی کی طرف لے جانے کے لئے کوششیں کر رہا تھا اور جب اس کے بدن میں واقعی توانائی پیدا ہو گئی تو ہم واپسی کے سفر کا فیصلہ کر لیا، قاسم خان بہر حال خود بھی ذہین تھا اس کے باوجود اگر وہاں کی تفریحات میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے اور مجھ سے فاصلہ اختیار کر لیتا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ میں اس سارے مسئلے میں مشکل کا شکار نہ اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ بہر حال ہم لوگ بستی کی جانب چلے گئے۔

غازال نے اپنی بستی والوں کو وہی سب کچھ بتایا تھا جو میں نے اس سے کہا تھا اور بستی والے اپنے پسندیدہ سردار کی بات سے مطمئن ہو گئے، یہاں کچھ وچ ڈاکٹر بھی موجود تھے جنہوں نے اس پر کوششیں شروع کر دیں، پھر اسے ایک شخص جس کا چہرہ کالے نقاب میں ڈھکا ہوتا تھا اور وہ بہت عرصے سے بستی غازال کی خدمت کر رہا تھا اس نوجوان کی تیمارداری پر مصروف ہو گیا اور آخر کار اس نے بتایا کہ نوجوان بالکل بہتر حالت میں آچکا ہے اور اب وہ اداس نگاہوں سے ہر شخص کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم دونوں اس کے پاس پہنچ گئے اور ہم نے اس سے پوچھا۔

”اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟ اور سندالیوں میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے عجیب سی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھا یعنی مجھے اور غازال کو جو اس وقت میرے ساتھ ہی تھا پھر آہستہ سے بولا۔

”کیا تم مجھے سندالی سمجھتے ہو؟“

”کیا مطلب، تم سندالی نہیں ہو؟“

”میری ماں سندالی تھی اور میرا باپ مقامی آدمی تھا ان دونوں کے اشتراک سے میرا وجود عمل میں آیا۔“

”لیکن تم؟“

”ہاں میں ان لوگوں کے خلاف مہم پر نکلا ہوں جو ہماری ان آبادیوں کو صحیح معنوں میں ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ سندالی نہیں ہم ہی میں سے ایک ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”ہبا۔“

”کیا مطلب؟“ غازال نے چونک کر پوچھا، ہبا کی کہانی غازال کو نہیں بلکہ مجھے معلوم تھی، میں نے غازال سے کہا۔

”ہبا کے بارے میں میں جانتا ہوں غازال، اور میں تمہیں اس کے بارے میں

بتاؤں گا۔ کیا تم نے بستی ہمولیہ کا نام سنا ہے؟“
میرے ان الفاظ پر نوجوان چونک کر مجھے دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

”کیا تم بستی ہمولیہ کے بارے میں جانتے ہو؟“

”ہاں تھوڑا بہت۔“

”کیا تم میں سے کسی کا نام شہباز ہے؟“ اس کے ان الفاظ پر نہ صرف میں بلکہ غازال بھی چونک پڑا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”آہ! تم نہیں جانتے.... تم نہیں جانتے، کیا تم کالی خانقاہ کے بوڑھے کی پیشینگوئی کے بارے میں جانتے ہو؟“

”نہیں، وہ کون ہے؟“

”اس کا تعلق براہ راست آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں سے ہے اور وہ بتاتا ہے کہ ہمارے نجات دہندگان میں سے ایک کا نام شہباز ہو گا اور ایک اس کا ساتھی، بہر حال اس کے ذریعے ہم اپنے علاقوں کے دشمنوں کو نقصان پہنچا سکیں گے اور شاید ان کا خاتمہ بھی ممکن ہو۔“ غازال نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا اور میں نے آنکھ سے اسے اشارہ کر دیا کہ ابھی اس نوجوان کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائے پھر اسی رات قاسم خان بھی واپس آگیا۔ اس نے بڑے سنسنی خیز انداز میں مجھے ایک کہانی سنائی اور کہنے لگا۔

”حقیقت یہ ہے شہباز کہ اس وادی سحر میں جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے، میں تو واقعی اس تمام کارروائی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔“

”اب تو کوئی نئی اور اجنبی کہانی سنائے گا۔“

”نہیں وہ کہانی نئی ہے نہ اجنبی، کیا تم یقین کرو گے کہ ایک بلند و بالا پہاڑی پر واقع ایک خانقاہ میں میری ملاقات ایک بار پھر پروفیسر لکھنوا سے ہوئی ہے۔“ قاسم خان کے ان الفاظ پر میں شدت حیرت سے چونک پڑا تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”یقین کرو، یقین کرو، اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ بہت جلد وہ ہم سے ملاقات کر کے ہمیں وہ اصل صورت حال بتائے گا، جس کے لئے اس نے ہمیں وادی سحر میں

بھیجا ہے۔“ میں نے یقین نہ کرنے والی نگاہوں سے قاسم خان کو دیکھا تو اس نے کہا۔
”تم از کم اس بات پر تم بھی یقین رکھتے ہو گے کہ اہم ترین معاملات میں تم سے بھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ میں قاسم خان کو تشویش بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔

”نہیں قاسم خان میں تمہاری بات کو جھوٹ نہیں سمجھ رہا۔ بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”اصل میں سارا کھیل ہی مال ہے۔ یار اگر اپنی دنیا میں ہوتے تو کہیں نہ کہیں کوئی لمبا ہاتھ مار ہی لیتے۔ زندگی بگاڑنے کے لئے چاہے کتنا ہی پھیلاؤ کر لو۔ جتنی دولت چاہے جمع کر لو۔ اس دولت سے زندگی میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم ان پہاڑوں، جنگلوں اور دہشت کدوں سے الگ بھی ایک دنیا ہے۔ جس میں باآسانی گزارہ کیا جاسکتا ہے۔“

”وہ تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اب یہ بتاؤ کرنا کیا چاہئے؟“

”میں، کئی بات یہ ہے کہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“ پھر میں نے قاسم خان کو دریا سے ملنے والے نوجوان کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے کہا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”ابھی تو غازال کے پاس محفوظ ہے۔“

”غازال سے اس بارے میں کوئی بات ہوئی؟“

”وہ ایک چھوٹے ذہن کا انسان ہے۔ بس اتنا کہ یہاں کے معاملات سے واقف ہو۔“

”میرا خیال ہے سندالیہ کے بارے میں اس سے معلومات کی جاسکتی ہیں۔ کم از کم تفصیل بتا دے گا۔“ میں نے قاسم خان سے اتفاق کیا۔ اور اس کے بعد ایک بار پھر ہم غازال سے ملے۔ میں نے غازال سے اس سندالیہ کے بارے میں پوچھا۔ تو غازال نے پریشان لہجے میں کہا۔

”کیا بتاؤں؟ حالانکہ ہم نے اسے بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھا تھا۔ کئی محافظ اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ ایک جھونپڑے میں بند تھا۔ جھونپڑے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ نہ اس میں کوئی سوراخ تھا اور نہ ہی باہر نکلنے کا کوئی راستہ، لیکن وہ غائب ہو

گیا۔

”غائب ہو گیا؟“

”ہاں۔“

”کیسے؟“

”آہ! اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“

”تم نے اسے تلاش کرایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آس پاس نکل گیا ہو۔“

”اس وقت جھونپڑے کے دروازے پر چار محافظ موجود تھے۔ اور مسلسل ان ڈیوٹیاں تبدیل ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ اس کے باوجود غائب ہو گیا۔“ میں اور قاسم خان ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ غزال نے کہا۔

”اور میں جانتا ہوں کہ یہ بات سچ ہے کہ تم نے مجھے اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غزال بہت شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں تمہارے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمت نہ کر پا رہا تھا۔“

”نہیں غزال! ظاہر ہے کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں وہ جس انداز میں ملا۔ اسی انداز میں غائب بھی ہو گیا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں اس کے بارے میں۔ وہ تو سب چھوڑ دے تو غائب ہو گیا اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ سندالیہ کا پورا قصہ کیا ہے؟“

”بس اتنا ہی جتنا تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ وہ لوگ ہم میں سے نہیں ہیں۔ کبہ اور سے آکر آباد ہوئے ہیں۔ اور یہاں ہماری دنیا پر قبضہ جمانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور ان کے پاس بہت سی طاقتیں ہیں۔ ان طاقتوں کے جواب میں بغیر اوقات تو ہم ان کا بھرپور مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اب تمہیں شاید اس بات کا یقین نہ آئے کہ پچھلے دنوں جو اس علاقے میں درندوں کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں بھی کچھ سیانوں نے یہی کہا تھا کہ ممکن ہے یہ سندالیوں کے جادو کا اثر ہو۔“

”کیا وہ جادوگر ہیں؟“

”ہاں بہت بڑے جادوگر۔ بہت بڑے جادوگر۔“

”تو پھر تم لوگوں نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”ابھی تک چھوٹی چھوٹی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ کوئی بڑی کارروائی کرنے کی ہمت نہ ہمارے اندر تھی اور نہ ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہبا اور ہمولیہ کی کمائی جو تفصیل سے ہمیں معلوم ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سندالیہ ہی کی کمائی ہو۔“

”وہ کیسے؟“

”سندالی بہت چالاک ہوتے ہیں۔ وہ آگ کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس ان کے مقابلے کے لئے آگ کے ہتھیار نہیں ہیں۔“

”آگ کے ہتھیار؟“

”ہاں جو گر جتے ہیں اور آگ اگتے ہیں اور جسموں میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔ یا چٹائیں تک اڑ جاتی ہیں۔ خوفناک آوازوں کے ساتھ۔“ غزال نے معصومیت سے کہا اور ہمیں اس کے ان الفاظ سے بہت مزہ آیا۔ وہ آتشیں اسلحہ کی بات کر رہا تھا یعنی بندوق، دستی بم وغیرہ۔ لیکن تعجب ہے سندالیہ کے پاس اس کا استعمال تھا۔ بعد میں جب غزال سے کافی معلومات حاصل کر کے میں اور قاسم خان بیٹھے تو قاسم خان نے کہا۔

”دادی سحر کا سحر ہم لوگوں کو دیوانہ کر دے گا شہباز! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟“

”کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جیسی گزر رہی ہے گزارتے رہو۔ دیکھتے ہیں ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں بس ویسے جہاں تک میرا خیال ہے تم یہاں مقامی لوگوں سے دوستیاں کرنے کی کوشش کرو یہ ہمارے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوں گی۔“

”میں نے اس سلسلے میں چند بے وقوف تاڑ لئے ہیں۔ بڑے مزے کے لوگ ہیں۔ ان سے تفریح بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ان مقامی لوگوں میں اس طرح گھل مل جائیں کہ تنہائی کا احساس ہی نہ ہو اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم ان سے بہت سی معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ کام میں کر چکا ہوں اور مزید کروں گا۔“ ہم غزال کے مہمان تھے۔ اور غزال نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسائش فراہم کر دی تھیں۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ پروفیسر لکھونا کے کہنے سے ہم نے جو مصیبت اپنی طرف

”پتہ نہیں۔“
 ”دیکھیں قریب سے؟“
 ”دیکھنا پڑے گا۔“

”آؤ!“ ہم آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔ پھر ہم نے قدموں کی آواز پیدا کی تاکہ وہ ہماری جانب متوجہ ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہماری جانب متوجہ نہ ہوا۔ ایک لمحے کے لئے سنسنی کا سا احساس ہوا۔ پھر ہمارے اور اس کے درمیان چند انچ کا فاصلہ رہ گیا۔ تو اچانک ہی اس نے رخ بدل کر ہمیں دیکھا۔ اور دوسرے ہی لمحے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ایک لمحہ میں اس چہرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ پروفیسر لنکونا تھا۔ لیکن ہم اسے بوڑھا پروفیسر لنکونا نہیں کہہ سکتے تھے۔ نقوش وہی تھے۔ چہرہ وہی تھا۔ انداز وہی تھا۔ آنکھیں وہی تھیں۔ لیکن اس کی عمر اس وقت اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وہ لنکونا کی جوانی کا کوئی کردار معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا ہماری طرف دیکھنے کا انداز ویسا ہی تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ جو سو فیصدی پروفیسر لنکونا کی آواز تھی۔

”تمہیں حیرت ہو رہی ہو گی۔“

”کون ہو تم؟“

”مجھے نہیں پہچانتے۔“

”پہچان تو رہے ہیں لیکن یقین نہیں کر پا رہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں! اس کی وجہ اچھی طرح جانتے ہو تم۔“

”وجہ۔“

”ہاں یہ وادی سحر ہے اور جادو کی وادی میں تمہیں جو کچھ بھی نظر آئے گا وہ تعجب خیز ہی ہو سکتا ہے۔“

”تو تم واقعی پروفیسر لنکونا ہو؟“

”ہاں۔“

”لیکن اس وقت تمہاری عمر اور تمہارا حلیہ؟“

”ضرورت کے مطابق ہے۔“

”مطلب؟“

ڈال لی ہے وہ واقعی ایک تشویش ناک مصیبت ہے اور نہ جانے اس مصیبت سے ہم کب تک دوچار رہیں گے۔ اور بہر حال اس طرح وقت گزرتا رہا اور پھر اس رات ہم لوگ موسم کے زیر اثر باہر نکل آئے تھے۔ ان خشک علاقوں میں بارش ذرا کم ہی ہوتی تھی۔ بادل چھاتے تھے۔ تو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے پوری بستی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ عورتیں طرح طرح کے لباس پہن کر باہر نکل آتی تھیں۔ اور بادلوں کی چھاؤں میں خوشیاں مناتی تھیں۔ اور پھر اگر چند پانی کے قطرے پڑ گئے تو سمجھ لو کہ عید ہی ہو گئی ان لوگوں کی۔ ہر طرف خوشیوں کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔ اور سردار کی سربراہی میں پانی کو ذخیرہ کرنے کے انتظامات ہونے لگتے تھے۔ ویسے بات یہ نہیں تھی کہ یہاں بارش بالکل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بہت کم ہوتی تھی۔ اور جو چیز کم ہوتی ہے اس کی طلب بھی انسانی ذہنوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ آج بھی بادل گھرے ہوئے تھے۔ صبح ہی سے بادلوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور سورج سے ان کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ گویا دو فریقوں میں جنگ ہو رہی تھی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہاں تک کہ بادل سورج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ وہ طاقت حاصل کرنے لگے۔ شام کو تقریباً ساڑھے چار پانچ بجے تک بادل جمع ہو چکے تھے اور آسمان کو انہوں نے گہری تاریکیوں میں ڈھک لیا تھا۔ موسم سے چونکہ ہر شخص لطف اندوز ہو رہا تھا اس لئے کسی کی کسی جانب توجہ نہیں تھی۔ غالباً غزال بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میں اور قاسم خان اس پر لطف ماحول سے مزے لیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اور بہت دور تک چلے گئے۔ پھر جب ہلکی ہلکی بوندوں کا سلسلہ شروع ہوا تو واقعی ہمیں بھی لطف آنے لگا۔ ہم مستی میں آکر کافی دور نکل آئے چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں قرب و جوار کا ماحول بہت پر اسرار نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہی ہمیں ایک پتھر پر ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا اس کی پشت ہماری طرف تھی اور دوسری سمت رخ کئے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے حلقے اور لباس سے مقامی آدمی ہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جس طرح وہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تعجب خیز بات تھی ہمارے قدم رک گئے۔ قاسم خان نے مجھے دیکھا اور میں نے قاسم خان کو۔ پھر قاسم خان سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”کون ہے یہ؟“

ہاں ہو گیا۔ اس نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تمہارا نام شہباز ہے؟ بات یہ نہیں ہے
ذیہ شہباز! کہ وہ تمہیں کسی طرح جانتا تھا۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ بہت سے افراد کو یہ بات
معلوم ہے کہ ان علاقوں کو سندالیوں سے نجات دلانے والا شہباز اور اس کا ساتھی یہ
ہو گا۔ اور تم اپنے آپ کو اس سے گریزاں کر رہے ہو۔ میں اگر تم سے یہ کہہ بھی
دوں کہ جاؤ اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ تو یقین کرو۔ اب یہ میرے بس میں بھی نہیں
ہے۔ کیونکہ دیوتاؤں نے وہ ذمہ داریاں تمہارے شانوں پر رکھ دی ہیں جو تمہیں
بہر مال پوری کرنی ہیں۔ میں تمہیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ تمہارے لئے
سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ وہ سب کچھ جس کا تم مجھے حکم دو۔ لیکن میرے دوست!
یہ بہت اچھا رہے گا کہ اگر تم ہماری مدد کرو۔ تم زندہ سلامت رہو گے۔ تم واپس جاؤ
گے۔ تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن اس کے
لئے ایک وقت متعین ہو چکا ہے۔ ایک کام متعین ہو چکا ہے۔ اب جس طرح بھی تم
چاہو۔ اس کی تقریر بہت لمبی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ
وہ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنا کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر
میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے! لیکن ہم یہاں جس طرح اچھے ہوئے ہیں۔ کسی بات کا سراپاؤں ہی
سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔“
”میں نے کہا نا اب میں تمہیں وہ حقیقتیں بتائے دیتا ہوں۔ جن کے تحت تمہیں
میل لایا گیا ہے۔ اصل میں یہ تو تمہیں معلوم ہے بلکہ معلوم ہو چکا ہے کہ سندالی ہم
میں سے نہیں ہیں۔ وہ سرحد کے اس طرف کے لوگ ہیں۔ جو یہاں پہلے آ کر غلاموں
کو پکڑ کر لے جایا کرتے تھے۔ ہمارے لائقہ اد نوجوان عورتیں اور بچے ان کے قبضے میں
جا چکے ہیں۔ وہ انہیں اپنی دنیا میں لے جاتے ہیں اور اس کے بعد انہیں فروخت کر
دیتے ہیں۔ جن سے جبری مشقت لیتے ہیں ان سے جانوروں کی سی زندگی لیتے ہیں اور
ہماری عورتوں کو داغدار کرتے ہیں۔ بہت پرانی بات ہے یہ۔ بہت قدیم بات ہے۔ پہلے
”بڑے بڑے سمندروں کے جہازوں میں آیا کرتے تھے۔ یہاں آ کر قتل و غارت گری
کرتے تھے۔ غلاموں کو پکڑ لے جاتے تھے اب وہ اسی طریقے سے یہ عمل سرانجام دے
رہے ہیں۔ ان کے پاس آگ والے ہتھیار ہوتے ہیں۔ میں پروفیسر لنکونا یہ سمجھ لو ان

”مطلب یہ کہ میں تمہیں ایک ایسے دور میں لایا ہوں جو ماضی کا دور ہے۔“
”ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“
”تو اتنا سمجھ لو کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں اور اس بات کا اعتراف کر رہا
ہوں کہ میں لنکونا ہوں۔“
”لیکن قاسم خان تم کہتے تھے کہ لنکونا سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔“
”ہاں قاسم خان سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس کے ذریعے میں نے تمہیں
ایک پیغام بھی بھیجا تھا۔“
”اس وقت کیا تم ماضی میں نہیں تھے؟“
”تھا، لیکن تمہارے سامنے مجھے حلیہ بدل کر ہی آنا پڑا۔ تاکہ تم اس بات سے
انکار نہ کرو کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔“
”پروفیسر لنکونا! اگر ہم تم سے یہ درخواست کریں کہ تم ہمیں ہماری دنیا میں واپس
بھیج دو۔ ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے۔ ہم اسے ختم کرنا چاہتے ہیں اور تم سے کچھ
نہیں چاہتے۔“
پروفیسر لنکونا نے گردن جھکالی۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

”دیکھو نہ میں تمہیں مجبور کر رہا ہوں اور نہ تمہیں اپنی مشکل کا قائل کرنے کی
کوشش میں ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انسان کبھی کبھی انسانوں سے بہت فاصلہ
اختیار کر لیتے ہیں۔ تمہارے سامنے کبھی کبھی کوئی دکھی شخصیت بھی آ جاتی ہے۔ تو تم
سوچتے ہو کہ یہ دکھ صرف تمہارا تو نہیں ہے۔ جسے دکھ ہے وہی اس دکھ سے نکلنے کی
کوشش کرے گا۔ لیکن میرے دوست! یہ سوچنا مناسب نہیں ہے۔ تمہیں یہ بھی سوچنا
پا ہے کہ ہر شخص پر کچھ ذمہ داریاں نازل ہوتی ہیں۔ کبھی اپنے لئے کبھی دوسروں کے
لئے۔ اپنی ذمہ داریاں تو خیر سب ہی پوری کر لیتے ہیں کسی نہ کسی شکل میں۔ لیکن جو
دوسروں کے لئے اپنے آپ کو مخصوص کر لیتے ہیں۔ وہ زیادہ قابل احترام اور زیادہ قابل
عزت ہوتے ہیں۔ تم اس وقت ایک آبادی کے لئے ایک فرد کے لئے نہیں بلکہ یہ
سمجھ لو کہ اس علاقے کی دور دور تک کی آبادیوں کے لئے نجات دہندہ کی حیثیت رکھتے
ہو۔ میں نے تمہیں وادی سحر میں بھیجا ہے۔ بلکہ اگر شاید تم یقین کرو تو میں ایک بہت
بڑے سچ کو قبول کرتا ہوں وہ یہ کہ میں تمہاری تلاش میں سرگرداں تھا۔ وہ سندالی جو

شانوں پر رکھ لی تھی۔ اس کی وجہ کیا ہے جانتے ہو؟“
”نہیں۔“

”اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے مستقبل میں جینا سیکھ لیا ہے۔ آج ان تمام لوگوں کو جو تم دیکھ رہے ہو تا یہ سب اگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ان میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب اپنے طور پر ایک مشکل عمل سے گزر رہے ہیں۔ یہ ماضی کی داستانیں ہیں۔ جو ماضی میں گم ہو گئی ہیں۔ حال میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جب تم وہ ظلم توڑ دو گے جو سندالیوں کا ظلم ہے تو اس وادی میں پھر سے زندگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ وادی سینکڑوں سال آگے نکل آئے گی۔ لیکن اس میں رہنے اور جینے والے وہیں سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔ جہاں سے انہوں نے اس کا انجام کیا تھا۔ اتنی چکرانے والی بات تھی کہ دماغ قبول نہیں کر پا رہا تھا لیکن ہمارے سامنے ایک ایسی پراسرار شخصیت موجود تھی۔ جس کی پراسرار زندگی کا تجزیہ ہم لوگ خود کر چکے تھے۔ بھلا کیسے انکار کر سکتے تھے۔ بہت دیر تک ہم الجھن میں گرفتار رہے تھے۔ میں نے کہا۔“

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ زندہ بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔“

”ہاں میرا مطلب یہی ہے۔“

”مگر ہم تو یہ محسوس نہیں کر پا رہے۔“

”بے شک تم محسوس نہیں کر پا رہے لیکن وقت تمہیں ہر چیز کا خود بخود احساس دلادے گا۔ بشرطیکہ تم دل و جان سے اس بات پر آمادہ ہو جاؤ۔“

”خیر بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”ہاں! آج میں تم سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ذہن تروتازہ رہیں اور جو کچھ تم کر رہے ہو پورے اعتماد کے ساتھ کر سکو۔“

”یہ زیادہ بہتر ہو گا پروفیسر لنگوٹا۔“

”ہو ہنہ! میں راہوں کی پوری فوج تمہیں دوں گا۔ یہ لوگ خانقاہوں کے مکین ہوں گے۔ لیکن درحقیقت یہ تمہاری فوج ہو گی۔ تمہاری سپاہ ہو گی۔ اور تم یہاں وہ سب کچھ کر سکو گے جو کرنا چاہتے ہو۔ یہ فوج تمہاری تربیت میں آتشیں ہتھیاروں کا استعمال سیکھیں گے۔ ہم انہیں ایسی جگہ محفوظ کریں گے جہاں عام لوگوں کی نگاہیں ان تک نہ پہنچ سکیں۔ سمجھ رہے ہو نہ میری بات۔“

لوگوں کا وچ ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ لوگ میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ پروفیسر تو میں ہوں میں بنا۔ اس سے پہلے میں ڈاکٹر وچ لنگوٹا تھا۔ پھر جب میں نے اپنے آدمیوں کو اپنی بستی والوں کو ایک بڑی مصیبت میں گرفتار دیکھا تو میں نے ایک جادو کا عمل کیا۔ جادو کا عمل یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کچھ عرصہ کی لئے ترک کر دوں۔ اور اس کے بعد تمہاری دنیا میں پہنچ جاؤں۔ کیونکہ یہ بات مجھے میرے علم نے بتائی تھی کہ آپ کی زبان میں بات کرنے والوں سے آپ کی زبان میں بات کرنے والے ہی منٹ سکتے ہیں۔ لہٰذا تم۔ بندوق، ریوالور، دستی بم اور اس کے بعد مسلسل گولیاں برسانے والی مشینیں تم لوگوں نے ایجاد کی ہیں۔ تم ان کا صحیح استعمال جانتے ہو۔ یہ سب وہ عمل نہیں کر سکتے جو تم کر سکتے ہو۔ چنانچہ تمہاری وادیوں میں جا کر مجھے تمہاری تلاش تھی یعنی کچھ ایسے لوگوں کی تلاش۔ جو سندالیوں کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔ اور سلسلے میں میری معلومات کہ تم دونوں کو منتخب کیا۔ یعنی میں تمہاری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ اپنی زندگی ایک بیش قیمت حصہ ترک کر کے۔ آج تم مجھے جس شکل میں دیکھ رہے ہو یہ میری وہی شکل تھی جب میں نے وادی سحر سے قدم نکالے تھے۔ اور تمہاری دنیا میں پہنچ تھا۔ کیا تمہیں اس بات کا یقین آئے گا میرے دوستو! کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ میں نے اس سے شادی کی تھی اور یہ شادی کئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ وہ آج بھی میری خطر ہے اور وادی سحر کے اس پراسرار اور گمنا گوشے میں وہ اپنے ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ میرے انتظار میں آنکھیں بچھا ہوئے ہے۔ لیکن میں اس وقت اس کے پاس جانا چاہتا ہوں جب میں اپنی قوم کو محفوظ کر لوں۔ میرے دوست! بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ کہ تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ تمہیں ایک قوم کو محفوظ کرنا ہے۔ اور اس کے بعد یہ قوم صدیوں تک تمہیں یاد رکھے گی۔“

”لیکن پروفیسر لنگوٹا۔ بات تو ساری یہ تعجب خیز ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو نا کہ یہ بات تو ماضی میں چلی گئی اب بھلا اس بات میں زندگی کیسے ہے؟“

”تو سنو میرے دوست! یہ وادی سحر ہے۔ تم نے میری گردن میرے شانوں سے الگ کر دی تھی لیکن اس کے باوجود میں زندہ ہوں۔ میں نے اپنی گردن واپس اپنے

”ہاں! لیکن کیا یہ ممکن ہے؟“
 ”ممکن اور ناممکن کا تجزیہ تو تمہیں اس وقت ہو جائے گا۔“
 ”کیسے؟“

”پہلے یہ بتاؤ کیا میری باتوں نے تمہیں متاثر کیا ہے؟ کیا تم وہ سب کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہو جو میں چاہتا ہوں؟“

”ہاں ہو سکتے ہیں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور قاسم خان کی طرف دیکھا۔ قاسم خان نے بھی آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی تھی۔ گویا وہ میرے جواب سے مطمئن تھا۔ پروفیسر لنکونا کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے اور اس نے کہا۔
 ”آہ! کتنے اچھے لوگوں کا انتخاب کیا ہے میں نے۔ اب تک تم جن مراحل سے گزرے ہو اور میں نے تمہارے اندر جو خوبیاں پائی ہیں تم میں یہ خوبی ہے کہ تم انسان دوست ہو۔ انسانوں سے محبت کرتے ہو۔“

”تمہاری اپنی دنیا کے انسانوں سے۔ ہماری اپنی دنیا کے انسانوں نے ہمیں ٹھکرایا ہے۔ ہمیں مجرم قرار دیا ہے۔ اور ہم شاید ان کے لئے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں پاتے۔“

”خیر اس سلسلے میں تم سے کوئی بات کر کے تمہاری دل آزاری نہیں کروں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کیا تم میرے ساتھ اس وادی میں چلنے کو تیار ہو جہاں میں تمہیں لے جانا چاہ رہا ہوں۔“
 ”کیوں نہیں؟“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکالی۔ یہ تین گھوڑے انتہائی تعجب خیز تھے جن کا رنگ بالکل ایک جیسا تھا۔ جن پر زین کسی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے ہمارے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ بات وادی سحر کی تھی۔ اور بات ایک ایسے آدمی کی تھی جو اپنی کئی ہوئی گردن کو دوبارہ اپنے شانوں پر رکھ کر جوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ان گھوڑوں کی آمد پر ہمیں حیرت نہیں ہوئی اور جب ہم ان پر سوار ہو کر آگے بڑھے تو یوں لگا جیسے ہمیں ایک طویل ترین سفر طے کرنا ہو اور واقعی ہم نے ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ اور اس کے بعد ہم جس پہاڑی وادی کے کنارے پہنچے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وادی کافی گہرائیوں میں اترتی تھی۔ نیچے جانے کے لئے

کچھ مخصوص راستے تھے۔ ان راستوں کے بغیر ان پہاڑی دیواروں سے گہرائیوں میں زنا ناممکن تھا۔ یہ راستے ایک طرح سے خفیہ راستے کے جاسکتے تھے۔ اور بہت غور کے بعد ہی انہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ حیران کن بات تو یہ تھی کہ وادی کی دیواروں میں اردوں کے دہانے تھے۔ اور جب ہم ان راستوں سے گزر کر ان دہانوں تک پہنچے تو باری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ غار ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زیر زمین میلوں تک پھیلے دئے تھے۔ صاف شفاف ایک غار سے دوسرے غار تک جانے کا راستہ گویا پہاڑوں کی گہرائیوں میں اک پوری دنیا آباد تھی۔ عورتیں مرد بچے سب ہی یہاں موجود تھے۔ ذرتی روشنی کے بعد ان غاروں کو مشعلوں کی روشنی سے منور رکھا جاتا تھا۔ یہاں لوگ سیاہ لبادوں میں ملبوس رہتے تھے۔ عورتیں مرد سب ایک ہی انداز کے۔ ہم نے ایک بڑے غار میں پناہ لی۔ پروفیسر لنکونا ہمیں اس غار میں بہت دیر تک سیر کراتا رہا پھر اس کے بعد ہم اس غار تک پہنچے تھے یہاں آنے کے بعد پروفیسر لنکونا نے کہا۔

”اور بہتر یہ ہو گا کہ تم اپنے طور پر یہاں صورت حال کا جائزہ لے لو۔ مجھے تو ہل سے جانا ہو گا۔ لیکن پھر لو میں تمہاری نگہداشت کے لئے بندوبست کئے دیتا ہوں۔“ وہ وہاں سے چلا گیا تو قاسم خان نے کہا۔

”بہت سی فلمیں دیکھی ہیں میں نے اور میرا پسندیدہ موضوع یہی رہا ہے۔ یعنی لیدنچر۔ اور پراسرار انسانوں کی پراسرار زندگی۔ لیکن تصور میں بھی نہیں آتی تھی یہ بات کہ میں خود ایسے ماحول کا جائزہ لوں گا جو ناقابل یقین ہو گا۔ غرض یہ کہ پروفیسر لنکونا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ اس کے ساتھ سیاہ لبادوں میں ملبوس دو ہم شکل ٹیکس تھیں اتنی ہم شکل کہ دیکھو تو ناقابل یقین تصور کا احساس ہو۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان کے نقوش بڑے جاذب نگاہ اور مقامی باشندوں سے بہت مختلف تھے۔ لنکو نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”یہ ایراسہ اور یہ ایلاہ۔ دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ تمہیں اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں میں کہ یہ مقامی لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ نسلاً یہ سندالی ہیں۔ لیکن ہم نے انہیں بچپن سے اپنے درمیان پرورش کیا ہے۔ اس وقت جب ان کے ماں باپ کو نڈالیوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر کے ان کی لاشیں پہاڑوں میں پھینک دی تھیں۔ اور یہ دونوں جڑواں بہنیں تھوڑی دیر کے اندر گوشت خور پرندوں کا شکار بننے

والی تھیں۔ ان پرندوں کو بڑی مشکل سے ہلاک کر کے ہم نے ان دونوں بہنوں بچایا۔ اور اس کے بعد سے ہم نے انہیں ہمیں پرورش کیا۔ یہ سندالیوں کے لئے میں نفرت رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے ماں باپ کے قاتل تھے۔ اور اب یہ ہمارے مقصد کی تکمیل کے لئے ہر طرح سے ہماری مدد کو آمادہ ہیں۔ ایک دلچسپ اور حیران ناک بات تھی ان لڑکیوں کو دیکھنا۔ کیونکہ ان کے جسم ان کے لباس ان کی شکل صورت، آوازیں اتنی ملتی تھیں کہ اچھے سے اچھا یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے ایرا کون ہے اور ایلاہ کون؟ بہرحال ان دونوں نے ہمارے یہاں زندگی کے سنبھال لئے اور اس کے بعد دن کی روشنی میں انہوں نے ہمیں اس پوری وادی کی کرائی۔ وادی کافی طویل و عریض تھی۔ اور یہاں کالے لبادوں والے راہبوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ راہب تو ان کو لنگوٹا نے کہا تھا۔ ہم انہیں ان کے نام سے جہل کرتے ہیں۔ اور اب جبکہ تم ان کے دشمن کی حیثیت سے سامنے آ چکے ہو۔ تو وہ کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بالکل عام دنیا کے عام آدمی تھے۔ بس اتنی ہی نہیں ہلاکت میں ڈالنے کے لئے کہیں اور کسی بھی جگہ ان ہتھیاروں کا استعمال کر سکتے بات تھی کہ وادی کے ایک مخصوص گوشے میں بنی ہوئی عبادت گاہ میں یہ سب باتا رہے۔ ہم دونوں نے یہ باتیں سنیں اور میں نے مسکراتے ہوئے ایرا سے کہا۔ عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ آسمان کے پجاری تھے۔ چمکتے آسمان کے پجاری۔ اور اس بات کا ہمیں بہت جلد ایلاہ اور ایرا کے ذریعے علم ہو گیا۔ یہ دونوں لڑکیاں بہت خوش مزاج بنی ساتھی لڑکی کو دیکھا اور بولی۔ تھیں۔ انتہائی طاقتور وجود کی مالک۔ جس کا مظاہرہ انہوں نے ہمارے سامنے کیا تھا۔ ہم کئی دن تک وہاں رہے۔ پروفیسر لنگوٹا اس دن کے بعد سے ہمارے پاس نہیں آئے۔ لیکن انہیں یہ سب ہماری ذمہ داریاں سب سے بڑی زنجیر ہوتی ہیں۔ لیکن ہم تھا۔ لیکن ایلاہ اور ایرا اس کی آواز تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ کس طرح ہمیں اپنے کام آغاز کرنا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے کہا۔

”اور اب تمہیں واپس قبیلہ غازال جانا ہے۔ تاکہ وہاں کے سردار غازال سے مل سکو۔“

”غازال سے مل کر؟“

”ہاں۔ ہم تمہیں اس بارے میں تمام تفصیلات بتا دیں گے۔ لیکن ایک بات خصوصاً تمہیں خیال رکھنا ہو گا۔ وہ یہ کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ تم یہاں کسی کی نگاہوں میں نہیں آ سکتے ہو۔ سندالی تمہارے بارے میں اچھی طرح جان چکے ہیں۔ اور وہ تمہارے خلاف ہر قدم اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں پہلے سے ہوشیار رہنا ہے۔ اب تمہیں ایک ایسی جگہ دکھانا چاہئے ہیں جسے دیکھ کر تمہیں یقینی طور پر حیرت ہو گی۔ لیکن

”کیا ہم اپنی زندگی کے سب سے عجیب دور سے نہیں گزر رہے؟ کیا کبھی خواب میں بھی یہ دیکھا تھا ہم نے کہ کچھ ایسے لمحات ہم پر آ سکتے ہیں۔ کیا ہی دلچسپ اور کیا عجیب بات ہے۔ یعنی اب ہم سیاہ لمبے لبادے والوں کو تربیت دیں گے اس بات کی کہ وہ دشمنوں سے جنگ کریں۔ کتنا بڑا مقام ملنے والا ہے ہمیں۔“

”بڑا مقام؟“ میں نے اپنے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ جس نے ایک ٹھوکر مارا تھا۔

اس کے بعد بلندی سے گرنے والے پتھر۔ گرد و غبار کا ایک طوفان لے کر ہم تک پہنچ گئے۔ اور پھر اچانک ہی میرے اندر ایک جنون ابھر آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یقینی طور پر ڈائنامائٹ کا دھماکہ ہے۔ اور اس طرح سے ہم لوگوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گھوڑے کو زور سے ہاتھ مار کر میں نے قاسم خان کو اشارہ کیا اور ایک بلند پہاڑی کی جانب چھلانگ لگا دی۔ چٹان پر پہنچنے کے بعد ہم گھوڑے کو اوپر چڑھانے لگے۔ قاسم خان مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ وہیں رک گیا۔ اور اس کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ لیکن مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ گھوڑا آگے نہ بڑھ سکا تو میں نے اس کی پشت چھوڑ دی اور چھلانگیں مار مار کر چٹانوں سے دیوار کی بلندی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی تھی۔ غالباً انہوں نے مجھے بلندی کی جانب آتے دیکھ لیا تھا جو اس دھماکے کا باعث تھے۔ گویا ان کی ترزاہٹ سنائی دی اور اس کے بعد اگر ایک لمحہ چوک جاتا تو یقینی طور پر میرا جسم تک چھلنی ہو جاتا۔ میں نے اپنے آپ کو چٹان کی آڑ میں لیا۔ اور چٹان کی کبجیاں اچھل اچھل کر میرے بدن پر گلنے لگیں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ یہ کافی بلندی پر تھے اور وہاں تک پہنچنا ایک مشکل کام تھا۔ البتہ اگر اس وقت میں نے ان کو معاف کر دیا تو حقیقت یہ ہے کہ پھر ان پہاڑوں میں ہمارے وجود کا کوئی امکان باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں بدستور ان چٹانوں کو سہارا بنا کر اوپر چڑھتا رہا۔ حالانکہ اس وقت یہ ایک مشکل کام تھا۔ ذرا سی لغزش مجھے موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ میرے بدن پر رانفل بھی تھی۔ اور کمر میں کلہاڑی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ بلندی پر جانے کی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ اور میں ان لوگوں تک پہنچ جاؤں جو اس دھماکے کے ذمہ دار تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس وقت ایک جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لوگ زندہ بچ گئے تو ہمیں بڑی مشکل کا شکار ہونا پڑے گا۔ بالآخر میں نے آخری چٹان عبور کی اور یہاں کے ٹکڑے میں ان لوگوں کو دیکھنے لگا جنہوں نے دھماکہ کیا تھا۔ اور اب رانفلیں سنبھالے ہوئے گردن اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ غالباً اب وہ مجھے کھو بیٹھے تھے لیکن قاسم خان اب بھی خطرے میں تھا۔ اگر اس نے ذرہ برابر بھی بے وقوفی کی تو پھر وہ نہ بچ سکے گا۔ میں نے ایک لمحہ کے اندر یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں ان دو افراد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ جس جگہ یہ دونوں اپنا

”ہاں مقام تو واقعی بڑا ہے۔ وہ کرنا پڑ رہا ہے جو کبھی نہیں کیا تھا۔“
 ”چھوڑو کیا فائدہ ان باتوں سے۔ اب جو حقیقت سامنے آگئی ہے۔ اس سے کئی کرو۔ ان باتوں سے کچھ نہیں حاصل ہو گا ہمیں۔“ پھر ہم آگے بڑھتے رہے۔
 تک ہم دریائے سنا کی فضاؤں میں آ رہے تھے۔ دریائے سنا کے بہاؤ کی آوازیں
 پر مسلط تھیں۔ کنارے کنارے پھیلے ہوئے جنگلات میں کہیں جانوروں کی سرسراہٹ
 سنائی دے جاتی تھیں۔ اکثر گیدڑ بھی چیخنے لگتے تھے۔ اور ان کی آوازیں بھیانک
 میں کچھ اور بھیانک لگ رہی تھیں۔ قاسم خان نے کچھ لمحے کے بعد کہا۔
 ”یہ لازمی امر ہے کہ اس جنگل میں درندے بھی موجود ہوں گے۔“
 ”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن گھوڑے ہمارے بہترین رہنما ہیں۔“
 ”گھوڑے۔“

”ہاں! سنا ہے جانوروں کی حس زیادہ تیز ہوتی ہے۔“ میں نے کہا اور قاسم خان
 ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ دیکھو اب کم
 مذہب دنیا میں جانا نصیب ہو یا نہ ہو؟ بہر حال ہم نہایت احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے
 یہ فاصلہ عبور کر کے اس جانے پہچانے علاقے میں داخل ہوئے جسے پہلے بھی دیکھا
 تھے۔ وہ پہاڑی بلند دیوار سے کچھ فاصلے پر شروع ہوتی تھی۔ جو بستی غازال کے اطراف
 میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کا اختتام غازال کی آبادیوں کے انتہائی سرے پر ہوتا تھا
 لیکن اچانک ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور گھوڑے پوری طرح سیدھے ہو گئے۔
 کے حلق سے آوازیں نکلی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ماہر گھوڑے
 نہیں تھے۔ لیکن وقت خود بخود بہت سی کیفیتوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہم ماہر گھوڑ
 سواروں ہی کی مانند اپنے آپ کو گھوڑوں سے گرنے سے بچا سکے تھے۔ لیکن اعصاب
 شکن دھماکہ بڑا عجیب تھا۔ پھر اس کے بعد پتھروں کا وہ طوفان ان دیواروں سے
 اترنے لگا۔ جس کے بارے میں ایک لمحے کے لئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جتنی تعداد
 یہ پتھر گر رہے ہیں۔ اگر ہم تک پہنچ گئے تو نہ صرف ہمارا بلکہ ہمارے گھوڑوں کا
 قیمہ بن کر رہ جائے گا۔ ہمارے حواس انتہائی کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن سنبھالنا پڑا
 کو۔ کیونکہ اس وقت لمحوں کے اندر زندگی کا وہ کھیل ختم ہونے والا تھا۔ دھماکے

کہ ممکن ہے غار کے اندر ان کے اور آدمی بھی موجود ہوں۔ میں دم سا دھے انتظار کرتا رہا اور ہوشیار ہو گیا کہ اگر کوئی آئے تو اس سے نپٹ لوں۔ لیکن بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں صرف ان دونوں کو ہی تعینات رکھا گیا ہو۔ البتہ بڑی عجیب و غریب بات تھی کہ انہوں نے صرف دو آدمیوں پر بھروسہ کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں آدمیوں نے بھی اپنے طور پر جو خوفناک کارروائی کی تھی اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ہم لوگوں کا گھوڑوں سمیت ان پتھروں میں پس جانا لازمی امر تھا۔ جب مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ واقعی اب اور کوئی نہیں ہے تو میں دو قدم آگے بڑھا اور جھک کر ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ اب چونکہ یہاں خاصا وقت گزر چکا تھا اور میں صورت حال سے واقف ہو گیا تھا اس لئے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ وہ درحقیقت سدا ہی تھے۔ اس اطمینان کے بعد میں اس غار کے دہانے کی جانب بڑھ گیا اور اس کے اندر داخل ہو گیا لیکن غار اتنا کشادہ نہیں تھا کہ اس میں کوئی قیام کر سکے۔ باہر سے تو اس کا دہانہ بے شک بڑا تھا لیکن اندر سے زیادہ دور تک نہیں تھا۔ البتہ اس میں ان کا ساز و سامان موجود تھا۔ میں نے ساز و سامان کا جائزہ لیا۔ کھانے پینے کی اشیاء اور اسلحے کے ڈھیر۔ اس کے علاوہ کھانے کی جو خوراک وہاں موجود تھی وہ کافی تھی۔ پھر میں نے ڈائنامائٹ کے ڈبے دیکھے۔ جو قدیم طرز کے تھے۔ لیکن بارود بھرے ہوئے یہ ڈبے بہت تباہ کن ہوتے تھے۔ اور غالباً ان ہی میں سے ایک ڈبے کی تباہی کا نظارہ ابھی ابھی ہو چکا تھا۔ ان میں خاص قسم کے بارود کے فیلے لگے ہوئے تھے۔ اور ان فلیوں کو آگ دکھا دینے سے یہ دھماکہ ہوتا تھا۔ جو پتھروں کو بھی ان کی جگہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ کافی دیر تک میں اس سامان کی تلاشی لیتا رہا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اگر ان چیزوں کو اپنے پاس رکھ لیا جائے تو یہ بڑی کارآمد ہو سکتی تھیں۔ چونکہ میں خاصی بلندی پر آچکا تھا اور قاسم خان نیچے تھا۔ اس لئے میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ یہاں تھیلوں میں ڈائنامائٹ کے ڈبے رکھے۔ جو قیمتی چیز مجھے وہاں ملی وہ میں نے اپنے ساتھ سمیٹ لی۔ اور اپنے شانوں کے ساتھ تسموں سے کس لی۔ اس مال غنیمت کے ساتھ آخر کار میں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ البتہ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ میں نے قاسم خان کو دیکھا جو چٹانوں پر ہاتھ ٹکا کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیسے ایسا نہ ہو میری آہٹ پا کر قاسم خان مجھ پر گولی چلا دے۔ ”قاسم خان یہ میں

کام سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا غار بھی بنا ہوا تھا۔ اور بلندی پر یہ غار انتہائی محفوظ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا لیکن اب میں نے انہیں دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ وہ غالباً اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ جس شخص کو انہوں نے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے وہ کہاں تک پہنچا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اگر ذرہ برابر آہٹ ہو گئی تو پھر انہیں پانا میرے لئے ممکن نہیں رہے گا۔ ویسے اب تک میری کوشش انتہائی کارآمد رہی تھی۔ اور میں لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک محفوظ جگہ پہنچنے کے بعد جہاں سے میں آسانی سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ ابھی تک انہیں میرے یہاں پہنچنے کا علم نہیں ہے۔ میں نے اپنی رائفل اتار کر خاموشی سے ایک چٹان کی آڑ میں رکھی اور کمر میں بندھی ہوئی بیٹی سے کلمائزہ نکال لیا۔ اور تھوڑا سا فاصلہ اور طے کرنا تھا۔ اور میں ان کے قریب پہنچ سکتا تھا۔ میں نے یہ سفر بھی طے کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب بھی یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے جو کارروائی کی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ لیکن ان میں سے کسی کو آہٹ محسوس ہو گئی۔ اور دوسرے لمحے ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ پلٹا۔ اب میں ان کے بالکل سامنے تھا اور انہیں موقع نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر موقع مل گیا تو پھر میں خطرے میں پڑ سکتا ہوں۔ اس وقت ہماری ہوشیاری ہی ہم میں سے کسی ایک کو بچا سکتی تھی۔ کلمائزہ میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور میں جانتا تھا کہ کلمائزہ کا استعمال خوبصورتی سے ہونا چاہئے۔ چنانچہ میرا ہاتھ گھوما اور اس شخص کی پسلیوں پر وار کر کے میں کلمائزہ کی بھرپور قوت سے اس کی پسلیوں کو کاٹتا ہوا دور نکل گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی دھاڑ ختم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے آدمی نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اسے اپنے سر پر سے گزار دیا تھا۔ میں نیچے بیٹھا اور چھلانگ لگانے والا میرے سر پر سے گزرتا ہوا اس غار کے دہانے سے جا نکل گیا جسے میں ان کے عقب میں دیکھ چکا تھا۔ اور اس جگہ سے اس کا سر زخمی ہوا لیکن میں نے کلمائزہ واپس گھمایا اور اس کی پشت پر پیوست ہو گیا۔ اس کی ہڈیاں غالباً کٹ گئی تھیں اور ریزہ کی ہڈی کٹ جانے کا مطلب فوری موت کی شکل میں واقع ہوتا ہے۔ زمیں پر ان دونوں کا خون پھیلنے لگا۔ اور ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں سے گر گئیں۔ میں ایک دم سے آڑ میں ہو گیا۔ اصل میں مجھے یہ خوف تھا

بات کا یقین دلا دیا کہ ہم دوست ہی ہیں، تھوڑی دیر کے بعد ہم غزال کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”آہ تم لوگ... تم لوگ... ہم نے ایک خوفناک آواز سنی تھی جیسے پہاڑ گرجے ہوں جبکہ آسمان شفاف تھا، یہ آواز کیسی تھی؟“

”ہم نے اس آواز کو قید کر لیا ہے غزال۔“

”کیا مطلب؟“

”ابھی نہیں، تم یہ بتاؤ کہ تم اس آواز کو سن کر بنی ادھر آئے ہو؟“

”ہاں۔“

”تو غزال بے فکر رہو ہم نے یہاں اپنا کام شروع کر دیا ہے اور اطمینان رکھو سندالیہ کا اس طرف اب رخ نہیں ہوگا، ہم نے ان سے بچہ کشی شروع کر لی ہے۔“

”یعنی؟“

”یعنی یہ کہ ان سے ہمارا بھرپور مقابلہ ہو گا۔“

”ہوں تم جو کچھ کر رہے ہو واقعی بڑی عظمت کا حامل ہے، میں تمہیں اس کے لئے سلام کرتا ہوں۔“ قاسم خان اور میں خاموش ہو گئے تھے۔ بہر حال ہم نے اپنے طور پر اپنے جی چند راستوں کو اختیار کیا تھا، اب آگے کا سفر انہی راستوں کے مطابق ہو سکتا تھا اور ہم اس کے لئے تیار تھے۔



ہوں، نیچے آ رہا ہوں۔“ میں نے صحیح عمل کیا تھا۔ قاسم خان نے چیخ کر کہا۔

”کیا تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم نیچے اترو۔ اور اس جگہ پہنچ جاؤ کیا تم نے اپنا گھوڑا پیچھے چھوڑ دیا ہے؟“

”نہیں میں نے دونوں گھوڑوں کو باندھ دیا ہے۔“

”ٹھیک۔“ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں نیچے پہنچ گئے تھے۔

”کیا تھا یہ سب کچھ! کیا تھا؟“

”جو کچھ تھا اب وہ ختم ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اوپر دولا شیں پڑی ہوئی ہیں۔“

”اوہ تم نے انہیں قتل کیا ہے؟“

”نہیں وہ خود بخود قتل ہو گئے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔

پھر ہم نے اپنے گھوڑے سنبھالے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ رائفلیں ہم نے ہاتھوں میں لی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کی لگائیں دانتوں میں دبائی ہوئی تھیں۔ ہمیں خود حیرت تھی کہ ان سنگلاخ چٹانوں اور ناقابل یقین جنگلوں میں سفر کرنا ہمیں کیسے آگیا ہے۔ ہم ذرا ماہرانہ انداز میں اپنے یہ گھوڑے دوڑا رہے تھے اور قاسم خان اونٹ کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر دور دور تک کے راستے دیکھ رہا تھا پھر اچانک ہی اس نے کہا۔

”اوہو کوئی سامنے ہے۔“ ہم نے ایک دم سے رائفلیں وغیرہ سیدھی کر لیں اور احتیاط سے گھوڑوں کو آگے بڑھانے لگے حالانکہ رات کے سنائے فضاؤں میں ابھی خاصے اتر آئے تھے لیکن شاید ہماری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں، بہت دور سے ہم نے غزال کو دیکھا جو بہت سے افراد کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ غزال نے بھی شاید ہمیں دیکھ لیا اور اس کے بعد اس نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے حلق سے ایک آواز نکالی۔ یہ آواز عام طور سے یہاں اس پلٹ کے لئے نظر ہوا کرتی تھی کہ اگر دوست ہے تو اس کا جواب دے اور اگر دشمن ہے تو دشمنی کا آغاز کرے۔ چنانچہ ہم نے فوراً ہی اپنے حلق سے آواز نکالی۔ اور غزال کو اس

”اچھا ایک بات بتاؤ؟“ قاسم خان بولا۔
”ہاں پوچھو۔“

”کیا تمہیں ایرا پسند نہیں ہے؟“ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کابھوں کی اس پراسرار آبادی میں ایرا اور ایلاہ کا وجود اتنا دلکش تھا کہ اگر وہ بھی نہ ہوتیں تو یہاں دل لگنا مشکل ہوتا۔ وہ بہت دلنشیں کیفیت کی حامل تھیں۔ محبت کرنے والی، معصوم فطرت کی مالک، ان کے ہر انداز سے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ وہ ہماری ہر خوشی کے لئے جیتی ہیں۔ قاسم خان جو میری سمت بغور دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔
”اور اب تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“
”بے وقوف ہو تم۔“

”یہ کوئی جواب ہوا۔“

”دیکھو تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو لیکن میں ہوش مند ہوں۔ کیا تم وادی سحر میں داخل ہونے کے بعد یہاں ایسی انوکھی چیزیں نہیں دیکھ سکے۔ جن پر تمہاری عقل بھی کلام نہ کر پائے۔ مجھے بتاؤ۔ کیا ہم اس وادی سحر میں کسی بھی چیز کو اپنی دنیا سے مطابقت دے سکتے ہیں؟“

”تمہاری بات کا میرے پاس جواب ہے۔“ قاسم خان نے کہا۔

”کیا جواب ہے بتاؤ؟“

”دوست! کیا تم اس وادی سحر سے نکال کر لے جاسکتے ہو؟“ قاسم خان نے سوال کیا۔

”مطلب؟“

”ہم یہاں موجود ہیں نا۔ پروفیسر لنگونا کی اس پراسرار سازش کے تحت ہم یہاں موجود تھے۔ لیکن یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ اور اگر نکل نہیں سکتے تو پھر ان پہاڑوں اور پتھروں سے سر نکرا کر مرجانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ جس ماحول میں جی رہے ہیں اس میں رہ کر عمل کرنا کیا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہونا تم۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جب ماحول یہ ہے تو ہم اس میں اجنبی کیوں رہیں؟“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جب انسان عورت کے جال میں پھنستا ہے تو دوسروں کو سمجھانے کے لئے اس کے پاس لاکھوں، تاویلیں ہوتی ہیں۔ قصور تمہارا نہیں ہے۔ بلکہ

طبیعت میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ ہم لوگ مشکل کا شکار ہو کر یہاں آئے تھے۔ اور ان ساری کارروائیوں میں ہماری اپنے خوشی کا دخل نہیں تھا۔ لیکن اب یوں لگتا تھا جیسے ہم ذہنی طور پر اس تمام کام کے لئے تیار ہو گئے ہوں۔ جو ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ پروفیسر لنگونا کیا دنیا کی کوئی قوت ہمیں ہوش و حواس کے عالم میں اس بات پر راضی نہیں کر سکتی تھی کہ ہم اس طرح کے کام کریں لیکن بہر حال وہ نہ جانے کونسی پراسرار قوت تھی جس نے آخر کار ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ قاسم خان بھی اس بات کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ غزال کے ساتھ ہم واپس قبیلے میں آ گئے تھے اور غزال نے ہمیں معمول کے مطابق ہماری آرام گاہ میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں ہم نے اپنا وہ سامان محفوظ کر دیا تھا جسے ہم ان غاروں سے ساتھ لے کر آئے تھے اور ساتھ ہی بندوقیں بھی جنہیں ہم صحیح معنوں میں یہ لوگ سمجھ بھی نہیں پارہے تھے اور انہوں نے ہمارے ساتھ موجود سامان پر صرف حیرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی نہ سمجھنے والے انداز میں۔ رات کی تاریکی میں قاسم خان نے کہا۔

”یار ایک بات کہنے کو دل چاہ رہا ہے چونکہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس لئے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”کیوں کیا بات ہے؟“

”وہ دونوں لڑکیاں غالباً وہ ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔“ میرے دل سے بے اختیار ایک ققمقہ نکل گیا تھا۔

”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں ان سے عشق ہو گیا ہے۔“

”ان سے نہیں۔ اس سے۔ اس سے جس کا نام ایرا ہے۔“ قاسم خان نے کہا اور میں مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔

”قاسم خان! انسان کسی بھی حیثیت کا کسی بھی سطح کا ہو۔ کیا عشق کے بغیر اسے چھٹکارا حاصل نہیں ہے۔“

لئے دلچسپ تھا۔ اور ہم اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر میں نے غزال سے کہا۔
 ”غزال دیکھو! سندالیوں کے بارے میں جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے۔ اس کے بعد
 میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ سندالیوں کے خلاف کام کروں۔ اور انہیں تمہاری
 اس آبادی سے دور رکھنے کی کوشش کروں۔ یا اگر کوئی ایسا سنگین نقصان پہنچانا چاہتا
 ہوں جس کے لئے مجھے باہر کی دنیا میں جانا پڑے گا۔“ غزال سوچ میں ڈوب گیا پھر اس
 نے کہا۔

”لیکن تم تو تنہا ہو۔“

”میں ظاہر ہے ان سب سے مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ لیکن کم از کم اس کے بارے
 میں معلومات تو حاصل کرنا ضروری ہے۔“

”ایک بات جانتے ہو؟“

”کیا۔۔۔؟“

”سندالیوں نے آخر کار اپنی بستی کا نام سندالیہ رکھ کر اس کا قیام کر لیا ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“

”شاید میں واضح الفاظ میں اپنی بات بیان نہ کر سکا یا تو مجھے ان تمام باتوں کے
 بارے میں ولغیت نہیں ہے بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سندالیوں نے اب اپنی باقاعدہ
 آبادی کا اعلان کر دیا ہے۔“

”کب اور کیسے؟“

”کچھ لوگ جو آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک سفر کرتے
 ہیں اور ایک دوسرے کی خبریں ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے یہ خبریں
 یہاں تک پہنچائی ہیں کہ سندالیہ نامی ایک قبیلہ آباد ہو گیا ہے۔ اور بڑی عجیب و غریب
 جگہ ہے وہ۔ ان لوگوں نے پتھروں کے جھونپڑے بنائے ہیں۔ پہاڑوں کو ان کی جگہ
 سے ہٹا دیا ہے۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے انہیں جھونپڑوں کی شکل
 دی ہے۔ انہوں نے اپنا ایک حصار بھی قائم کیا ہے۔ اور ایک حصار کے اندر رہتے
 ہیں۔ وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ اطلاع بہر حال ہمارے لئے
 تشویش ناک ہے۔ کیونکہ اندر ہی اندر وہ قوت حاصل کر کے آخر کار وہ ہماری پوری
 آبادیوں کو تباہ کر دیں گے۔“

اس حسین صورت کا ہے۔ جو تمہارے حواس پر مسلط ہو گئی ہے۔“
 ”اپنی کو اپنی کہو۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“

”گذا! گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں ایلاہ سے عشق نہیں ہے؟“

”ارے بھائی ہم واپس قبیلہ غزال میں آگئے ہیں۔ اب ایلاہ کا عشق ہمارے کس
 کام کا؟“

”کیا بات کرتے ہو یا؟ اس کا مطلب ہے کہ تم اسی قبیلے میں رہنا چاہتے ہو؟“

”جب ہم اس قبیلے کے تحت کام کر رہے ہیں تو یہاں تو رہنا ہو گا۔“

”اور وہاں جو تم نے کالے لباس والوں کو آتشیں ہتھیاروں کی تربیت دینے کا وعدہ

کیا ہے، اس کا کیا ہو گا؟“

”وہ وعدہ تم پورا کر دو۔“

”دیکھو مذاق مت کرو۔ تم جانتے ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”واقعی؟“ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”ہاں! اب بھلا اس کا کیا امکان ہے؟“

”تو پھر ایرا کا کیا ہو گا؟“

”کیوں؟ کیا تم ایرا کی جگہ میری تمام ضرورتیں پوری کر دو گے؟“ قاسم خان نے

کہا اور میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔

”میں نے کہا نا کہ جب انسان کسی ایسے جال میں پھنستا ہے تو اپنے لئے بہت سے

راستے پیدا کر لیتا ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ آئندہ کے لئے کیا پروگرام ہے؟“

”یار بہر حال ہم ان لوگوں کو تربیت تو دیں گے نا۔“

”اور غزال سے کیا کہو گے؟“

”نہیں، پروفیسر لنگونا کا راز ابھی ہم غزال کو نہیں دے سکتے۔“ بہر حال ہم دونوں

اس بات پر متفق تھے کہ پروفیسر لنگونا نے جو ذمہ داری ہمارے سپرد کی تھی ہم جانتے تھے

کہ اسے پورا کئے بغیر وادی سحر سے نجات ناممکن ہے۔ ابھی تو یہ دیکھنا تھا کہ ہمیں کیا کیا

کرنا ہے۔ بہر حال سارے معاملات چلتے رہے۔ تین چار دن ہم غزال کے ساتھ رہے۔

وہ بھی ایک اچھا انسان تھا۔ قبیلے کے رسم و رواج، یہاں کا طرز زندگی سب کچھ ہمارے

لکڑی کا براہ تھا۔ جس میں لاتعداد خوشبو کے خزانے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

”صندل کی خوشبو نہیں ہے یہ۔“

”ان کی اپنی کوئی ایجاد ہوگی۔“

”لیکن یہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”معلوم کرتے ہیں آؤ۔“ اور پھر انہوں نے ہمیں دیکھا تو خوشی سے کھڑی ہو

گئیں۔ انہوں نے بھی غالباً ہمارا انتخاب ہماری پسند کے مطابق کیا تھا۔ ایرا تو قاسم خان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ایلاہ میرے پاس آگئی۔ یہ چھوٹے قد کی مالک ایک حسین لڑکی تھی۔ دلکش نقوش مقامی ہونے کے باوجود دلکشی کے حامل تھے۔ میرے پاس پہنچ گئی۔ اور بڑی آسودہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

”آگئے تم؟“

”آنا تو تھا۔“

”نہیں تم نہ آتے اگر میں تمہیں نہ بلاتی۔“

”تم نے مجھے بلایا ہے؟“

”تو اور کیا سمجھتے ہو تم؟“

”مگر کیسے؟“ میں نے سوال کیا اور وہ الاؤ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”ادھر نہیں دیکھ رہے؟“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ ہماری کوششیں ہیں۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”یہ جادو ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔“

”اچھا تو تم ہم پر جادو کر رہی تھیں۔“

”تم پر نہیں۔“

”تو پھر؟“

”تمہیں بلانے کے لئے ہم نے یہ عمل کیا ہے۔“ بہر حال یہ ان لوگوں کا اپنا انداز تھا۔ یعنی وہ آگ کا یہ الاؤ جلا کر اپنا کوئی ایسا منتر پڑھ رہی تھیں۔ جس کے ذریعے انہوں نے ہمیں یہاں بلا لیا تھا۔ لیکن ہمارا یہاں آنا تو بالکل ہی الگ سی بات تھی۔ خیر

”ہونہ ہو سکتا ہے لیکن کیا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے ان کے خلاف عمل ممکن ہو جائے گا۔“

”نہیں۔“

”ہم اپنی حیثیت کے مطابق ان کے خلاف کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور دیکھیں ہیں کہ ہمیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔“

”میرے لئے کیا خدمت ہے؟“

”کچھ نہیں بس ہم ذرا کچھ دن کے لئے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ وقت لگ جائے۔“

”مگر میں تمہارے لئے تشویش زدہ رہوں گا۔ سندالیوں کو تمہارے بارے میں اندازہ ہو چکا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ تم پر دھماکوں کی بارش کیسے کرتے۔ ضرور انہیں کچھ پتہ لگ گیا ہے۔“

”اب جو بھی ہو گیا ہے وہ دیکھا جائے گا میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی کام بن سکے۔“ اور پھر غارال نے ہمیں اجازت دے دی تھی۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ اور آخر میں قاسم خان نے کہا۔

”یہ سندالیئے ایسا لگتا ہے جیسے اس علاقے کے باشندے نہ ہوں۔ بلکہ کہیں اور سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہوں۔“

”تم نے سنا نہیں ان کا تعلق یونان سے بتایا جاتا ہے۔ بہر حال اب یہ تو ان کی قربت سے ہی پتہ چلے گا۔ کہ وہ کون ہیں کہاں کے باشندے ہیں اور ان کے پاس مزید کیا کیا ذرائع ہیں؟“

”فی الحال کیا پروگرام ہے؟“

”کچھ نہیں ہم اسی غاروں والی بستی میں چل رہے ہیں۔ بہر حال پروفیسر لنگونا کے ذریعے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس سے منحرف تو نہیں ہو سکتے۔ پھر خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم غاروں کی آبادی میں واپس پہنچ گئے۔ اور جب ہم نے آبادی کے راستے کی جانب قدم اٹھائے تو وہاں ایرا اور ایلاہ کو بیٹھے ہوئے دیکھا دونوں نے آگ کا الاؤ بنا رکھا تھا اور آگ کے اس علاؤ میں وہ کوئی ایسی چیز بار بار ڈال رہی تھیں جس سے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ اور فضا میں خوشبو بکھر جاتی تھی۔ غالباً یہ درخت کی کسی

ہیں سربراہ کی سی کیفیت حاصل تھی۔ اور ہم یہاں آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ہمارا مقصد آرام کی زندگی بسر کرنا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے مقصد کی تکمیل ہو جائے اس کے بعد ہی ہمارے مقصد کی تکمیل ہوگی۔ بہر حال بہت سے خیالات دل میں آتے تھے۔ جینے کے لئے خیالات کا سارا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ہم جی بھی رہے تھے اور یہاں اپنا عمل بھی کر رہے تھے۔ ایرا اور ایلاہ ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ بعد میں مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ ممکن ہے پروفیسر لنکونا نے انہیں ہمارا دل لگانے کے لئے مشین کیا ہو۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں اب بھی قاسم خان کی طرح یہاں کے مہلات میں بری طرح موٹ نہیں ہوا تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ قاسم خان نے جس طرح سے یہاں کی زندگی اپنا لی ہے وہ بہترین نشانہ باز تھا۔ اسلحہ چلانے کا ماہر۔ لیکن یہاں وہ اپنی فنکاری جس انداز میں دکھا رہا تھا اس سے اس کی خوشی اور اطمینان جھٹکتا تھا۔ جب کہ میرے دل میں یہ خیال بار بار آ جاتا تھا کہ کچھ بھی ہو یہ ہماری اپنی زندگی نہیں ہے۔ اور ایک نہ ایک دن ہمیں اس زندگی کو خیر باد کہنا ہو گا۔ یہ سارے کام اسی انداز میں ہو رہے تھے۔ اور اب یہاں باقاعدہ سیاہ لباس والوں کی پوری آبادی گولیاں چلانا سیکھتی جا رہی تھی۔ آتشیں اسلحے کے استعمال سے وہ لوگ بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن میں نے ایک کمانڈر کی طرح اس آتشیں اسلحہ پر بھی سپرہ لگا رکھا تھا۔ اور اسے احتیاط سے خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر لنکونا سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ اپنے کام میں پتہ نہیں کھلے مصروف ہو گئے۔ ہم اپنا کام کر رہے تھے۔ البتہ اتنے دن ان لوگوں کے ساتھ رہنے سے ان کے لئے بھی دل میں انیسیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی ہم سے بہت محبت اور دلچسپی سے پیش آتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ معاملہ صرف پروفیسر لنکونا کا معاملہ نہیں بلکہ کچھ اپنا اپنا سا ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر غزال قبیلہ اپنے طور پر ہمارے لئے توجہ اور دلچسپی کا باعث بنا تھا اور ادھر پروفیسر لنکونا کی ہدایت کے مطابق ہم عمل کر رہے تھے۔ بس دونوں ہی کا مقصد ایک تھا۔ یعنی یہ کہ سندالیوں سے نجات حاصل کرنا۔ سندالیوں کے بارے میں کبھی کبھی رپورٹیں ملتی تھیں وہ یہ ہوتی تھیں کہ آخر کار سندالی تمام بستیوں کو اپنا محکوم بنانے کا عمل کر رہے ہیں اور تھوڑی عرصے کے بعد وہ موت اور تباہی کی شکل میں قرب و جوار کی بستیوں پر حملہ آور ہوں گے۔ اور جو ان کا نافرمان ہو گا اسے نذر آتش کر دیں گے۔ باقی لوگ ان

اگر ان کی خوشی ہوتی ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا۔ لنکونا کا یہاں کوئی ایسا پتہ نہیں تھا۔ جس مقصد کے لئے ہم یہاں آئے تھے اس کے لئے آخر کار ہم نے کچھ لوگوں کو منتخب کیا۔ یہ تین افراد تھے۔ جن کے مقامی نام تھے جنہیں ہم نے اپنا نائب بنایا۔ اور پھر ذخیرہ گاہ سے بندوقیں اور ایمونیشن نکال لیا گیا۔ ہم نے ان تین آدمیوں کو سب سے پہلے بندوق چلانا سکھائی۔ اور باقاعدہ انہیں چاند ماری کرانے لگے۔ وہ نشانے لے کر بندوق چلاتے ہوئے بڑے حیرت زدہ ہوتے تھے اور اس عمل سے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ہمیں بھی یہ عمل اچھا لگا تھا۔ ہم نے تو اپنی پہلے کی زندگی میں آتشیں اسلحہ کا بہت زیادہ استعمال کیا تھا۔ اس لئے ہمیں ہر طرح کا اسلحہ استعمال کرنا آتا تھا۔ لیکن یہ لوگ بڑی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوتے۔ دھماکہ ہوتا تو یہ خوشی سے قہقہے لگاتے۔ اور ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ وہ بڑی مہارت سے یہ سارے کام کر رہے تھے۔ جب یہ تین آدمی بندوقیں چلانے کے ماہر ہو گئے اور اپنے ہدف پر نشانہ لگانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔

”اب تم ایسا کرو کہ اپنے اپنے گروپ الگ الگ بنا لو۔ بیس بیس آدمیوں کے گروپ ہونے چاہئیں۔ تم بندوقوں کا یہ استعمال انہیں سکھائو۔ تینوں الگ الگ اپنے لئے ایسی جگہیں بناؤ اور پھر وادی میں یہ ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے چار چار آدمیوں کا سپرہ بھی لگا دیا تھا۔ جو بلند یوں پر جا کر یہ دیکھتے کہ دور دور تک کوئی انسانی وجود تو نہیں ہے؟ حالانکہ وادی میں بندوقوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ تو یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں کچھ لوگ ادھر متوجہ نہ ہو جائیں۔ یہ چار چار آدمی اس بات کے لئے متعین کئے گئے تھے کہ اگر چاند ماری کے وقت قرب و جوار میں کوئی موجود ہو تو یہ اپنے مخصوص انداز میں آواز نکال کر ہمیں اطلاع دیں۔ جو یہاں کا طریقہ کار تھا اور اسکے بعد ہم لوگ کچھ دیر کے لئے فائرنگ بند کر دیں۔ لیکن تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ اس طرف کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ غالباً اس جگہ کی جغرافیائی کیفیت ہی ایسی تھی۔ لیکن اس جغرافیائی کیفیت سے ہمیں خاصا فائدہ ہوا تھا۔ ادھر ایرا اور ایلاہ ہمارے لئے دل و جان نچھاور کئے ہوئے تھیں۔ کھانے پینے کی ایسی پسندیدہ اشیاء جو ہم اپنے طور پر بھی حاصل کرتے تھے تیار کر کے وہ ہمارے سامنے پہنچاتی تھیں۔ اور بہر حال یہاں اس چیز کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس طرح سے

”بس میں یہی چاہتا ہوں کہ ہم کوئی عمل کریں جس سے لنگوٹا کا مقصد بھی پورا ہو اور ہماری خواہش بھی۔“

”کیا ایسی کوئی بات تیرے ذہن میں ہے؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔“

”تو مجھے بتا۔ میں خود بھی ان لوگوں کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہوں۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پروفیسر لنگوٹا کے مقصد کی تکمیل تو ہم کسی حد تک کر چکے ہیں۔ اب ہمیں باقی عمل کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم اصل صورت حال کی طرف توجہ دیں۔ سندالی اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ کیا کیا کر چکے ہیں یہ ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن کیا ہماری بے خبری ان لوگوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہے؟“ قاسم خان پر خیال انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

”اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ تیرے ذہن میں کوئی خوفناک منصوبہ جنم لے رہا ہے۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

”ہاں قاسم خان! تو تو صرف عشق کر رہا ہے۔ اور میں ان لوگوں کی بہتری کے لئے کوئی بہتر قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے تو یقین کر یہ جتنے اچھے لوگ ہیں۔ یہ سے میری مراد صرف یہی نہیں جو کالے لباس والے ہیں بلکہ میں غزال کے بارے میں بھی کتا ہوں۔

یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں میں تیرے ساتھ عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”ہم نے سندالی اور سندالیہ کے رہنے والوں کو دیکھا ہے۔ اگر ہم ان جیسا حلیہ بنا

کر ان میں شامل ہو جائیں تو یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ سندالی کیا کر رہے ہیں؟“

”مگر کیسے؟“

”اگر تو چاہے تو میں اس کے لئے تنہا کوشش کروں۔“

”مطلب۔“

”مطلب یہ کہ تو ایرا کے ساتھ یہاں رہ۔ میں سندالیوں کی تلاش میں جاتا

ہوں۔“

”نہیں خیر ایسا بھی نہیں۔ میں تمہیں چھوڑنا پسند نہیں کروں گا۔“

”میں دیکھتا ہوں کہ ہم سندالیوں کے پاس کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں

کے اپنے غلام ہوں گے۔ صبا یا ہولیہ کی بات نہیں تھی بس سندالی سب ہی کے خلاف عمل پیرا تھے۔ صبا تو اپنی موت مر گیا تھا۔ یا پھر اس نے بھی شاید سندالیوں میں ہی پناہ لی ہو۔ یہ سارا کھیل اسی انداز میں چل رہا تھا۔ اور کم از کم میری ذاتی دلچسپیاں اس کھیل میں شامل ہو گئی تھیں۔ جب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اب سیاہ لباس والے یعنی لنگوٹا کے سادھو اپنا کام بخوبی سرانجام دینے لگے ہیں۔ تو میں نے ان ہی تینوں افراد کو جنہیں میں نے خاص چھان بین کے بعد منتخب کیا تھا۔ یہاں سربراہ مقرر کیا۔ اسلئے کے استعمال اور اس کے خرچ کے بارے میں ہدایات دیں۔ اور اس کے بعد پھر میں نے قاسم خان کے ساتھ وقت گزارا۔ جو باقاعدہ ایرا سے منسلک ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”بے وقوف آدمی دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ ایلاہ کے ساتھ یونہی رنگ رلیاں

مناؤں۔ جو تو منا رہا ہے۔ لیکن مجھے بتا! کیا ہماری دنیا یہیں تک محدود ہے؟“

”بات اصل میں یہ ہے کہ میں ٹوٹ کر محبت کرنے والوں میں سے ہوں۔ یا تو

کسی کو چاہتا نہیں ہوں۔ یا اگر چاہتا ہوں تو اس کا ساتھ نبھا دیتا ہوں۔ ہمارے پاس اور

کوئی راستہ تو نہیں ہے نا۔“ ایلاہ ایرا سے شکایت کر رہی تھی کہ تم اسے وہ پذیرائی

نہیں دے رہے جو میں ایرا کو دے رہا ہوں۔“

”تو اپنی بات کر بے وقوف۔ میری بات جانے دے۔“

”دیکھو! میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ تمہیں بھی تو میں اتنا ہی چاہتا ہوں کیا

تمہیں میری اس بات پر یقین نہیں ہے۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔ اصل میں تو ایرا میں کھو کر اپنی باقی ذمہ داریاں بھول گیا ہے۔

جب کہ میرے دل میں ان لوگوں کے لئے محبت کے جذبات ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں

کہ انہیں کوئی ایسا تحفظ دوں جو لنگوٹا کی مرضی کے مطابق ہوں۔ کیا یہاں بیٹھے رہ کر

ہم یہ کام کر سکتے ہیں۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“

”تو پھر ایسا نہ کر۔ اور ان کے بارے میں بہتر انداز میں سوچ۔“

”تو یقین کر میں ان کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور اس کے لئے

تیری مرضی اور تیری رائے کا منتظر بھی ہوں۔“

تیرے بغیر ادھورا ہوں تو یہ خیال اپنے ذہن سے نکال پھینک۔
 ”نہیں تو میرے بغیر ادھورا نہیں ہے۔ لیکن میں تو تیرے بغیر ادھورا ہوں۔ میں
 نہا جا تو رہا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ کیا تمنا میں یہ سب کچھ کر سکوں گا؟“
 ”بس۔ بس سب کچھ سمجھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اس کے بعد خاموشی اختیار کر
 لی۔ اس کا گھوڑا میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور ہم بہت عجیب سی
 کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ پھر شام تک یہ سفر جاری رہا۔ اور جب ہم تھک گئے تو
 ایک جگہ قیام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میرے کسے بغیر قاسم خان نے شکار کا بندوبست کیا۔ اور
 اب تو ہمارے پاس رانٹیلی تھیں۔ ایک معصوم ہرن قاسم خان کی گولی کا شکار ہو گیا۔
 قاسم خان نے اسے ذبح کیا اور پھر خود ہی ساری لکڑیاں وغیرہ تلاش کر کے اسے بھوننے
 لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تیری ناراضگی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”تو اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھتا ہے نا۔“

”کبھی میں نے اس کا اظہار کیا ہے؟“

”نہ سہی لیکن تیرے انداز سے یہ پتہ چلتا ہے۔“

”کیا کہا تھا ایرا نے؟“

”بکواس مت کر۔“ وہ غصیلے انداز میں بولا۔ اور میں قہقہے لگانے لگا۔ لیکن قاسم

خان کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے کلام سرانجام دیتا رہا۔ اور اس نے
 مجھے بھی گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا پیش کیا۔ میں نے کہا۔

”دیکھو قاسم خان بات بات پر ناراض ہو جانا بری بات ہے۔ مذاق اپنی جگہ ہوتا

ہے۔ لیکن یہ چیز تو بہتر نہیں ہے۔“

”ایرا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔“

”تو ٹھیک ہے نہ کہا ہو گا۔“

”ظاہر ہے تیرے بغیر میرے لئے کچھ کرنا مشکل ہے۔“

”چلو یہ بھی مان لیا۔“

”پھر تو ایرا کا نام کیوں لیتا ہے بار بار۔“

”یار بس ایسے ہی۔“

تمہیں اس کے بارے میں اطلاع دوں گا۔ اور تمہیں بھی میرے ساتھ مصروف مل
 ہونا پڑے گا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میرے بغیر کچھ
 بڑا کارنامہ سرانجام دینے نہ چل پڑتا۔ ایرا کی محبت اپنی جگہ۔ تیرا مقام اپنی جگہ۔ جب
 یہ تمام کام کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تو اطمینان رکھ ایرا کی محبت کو سینے میں چھپا
 کر میں تیرے ساتھ مصروف سفر اور مصروف عمل ہو جاؤں گا۔“ بات یہاں آ کر ختم ہو
 گئی تھی۔ لیکن جب میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے نکلا اور گھوڑے پر بیٹھ کر
 تھوڑی ہی دور چلا۔ تو میں نے اپنے عقب میں کسی گھوڑے کے قدموں کی آوازیں
 سنیں۔ رانٹل سیدھی کر کے میں آنے والے کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور وہ
 جب مجھے نظر آیا تو میں نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ قاسم خان ہی تھا۔ گھوڑا لے
 کر میرے قریب پہنچ گیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

”مجھے غیرت آئی۔“

”کیا مطلب؟“

”یقین کر یہ غیرت مجھے خود بخود آئی ہے۔ ایرا نے مجھ سے اس بارے میں کچھ
 نہیں کہا۔“ اس نے جس انداز میں یہ الفاظ کہے تھے۔ انہیں سن کر مجھے بے اختیار ہنسی
 آگئی۔ میں نے کہا۔

”قاسم خان جب تو جھوٹ بولنے لگتا ہے نا تو تیری بائیں آنکھ زور زور سے
 پھڑکنے لگتی ہے۔ میں نے اس وقت تجھے یہ بتا دیا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ جھوٹ
 بولتے ہوئے تو با آسانی پکڑا جاتا ہے۔“

”ک۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ قاسم خان نے غصیلے انداز میں کہا۔

”خیر ایرا ویسے بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ اگر اس نے تجھے اس سلسلے میں غیرت

دلائی ہے تو یہ بھی اس کی اچھائی ہی کا ایک ثبوت ہے۔“

”یار تو پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے“ تو سوچتا ہے کہ تو بہت ذہین انسان
 ہے اور ہر شخص کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔“

”اب یہ بتا تیرا ارادہ کیا ہے؟“

”نہیں تو نے مجھے بور کر دیا ہے۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اگر سمجھتا ہے کہ تم

بڑھتا چلا گیا۔ قاسم خان کی باتوں پر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ لیکن بہر حال ٹھیک ہی تھا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کا دل ہی لگ گیا تھا۔ ویسے ماضی میں اس طرح کھو کر ایک انوکھی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر پھولوں کے کج کے پاس رک کر میں نے گہری گہری سانس لیں۔ اور خوشبو کا حسن اپنے سینے میں اتارنے لگا۔ لیکن وہ سرسراہٹ میرے کانوں سے محفوظ نہ رہی تھی جو عقب میں ابھری تھی۔ ایک لمحہ کے اندر مجھے احساس ہوا کہ شاید قاسم خان اس طرف آگیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ ایک ڈیڑھ میٹر آدمی تھا جسٹنی طور پر بے پناہ طاقتور اس کے ہاتھ میں ایک تیز چمکدار کلباڑہ چمک رہا تھا۔ اس نے کچھ اس طرح کلباڑے کو گھمایا کہ فضا میں عجیب سی سنسنیٹ کی سی آواز بلند ہونے لگی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس دیو قامت کو دیکھ کر ہی دل کو دہشت کا ماحساس ہوتا تھا۔ پھر اس کے کلباڑا گھمانے کا احساس حالانکہ وہ ایک وزنی کلباڑا تھا۔ لیکن اس کے مضبوط بازو اس کلباڑے کو اس طرح گھما رہے تھے کہ کوئی آدمی آسانی سے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی چونکہ اس سے میرا زیادہ فاصلہ تھا۔ چنانچہ مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ لیکن اچانک ہی ایک تیز سنسنیٹ کے ساتھ کلباڑا اس کے ہاتھ سے نکل کر میری جانب لپکا۔ اس نے مجھ پر کلباڑے سے بھرپور وار کیا تھا۔ لیکن میں نے اس کا وار خالی دیا۔ کلباڑے والا بے پناہ طاقتور اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں زمین پر بیٹھا اس نے پھر کلباڑے کو وہیں سے مار کر میرے اوپر اس کا بھرپور وار کیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ چھوڑی۔ البتہ اس بار وہ کلباڑے کو فضا میں سنبھال نہیں سکا تھا۔ کلباڑا زمین پر پڑا۔ اور زمیں میں اتر گیا۔ یہ موقع میرے لئے بہت ہی اچھا تھا میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اپنی کمر سے بھی کلباڑا کھینچ لیا۔ دوسری طرف کلباڑے والا بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اور پھر میں نے پینترے بدلنے شروع کر دیے۔ میں اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کبھی بہت ہی لمبا ترنگا آدمی تھا۔ بال ضرورت سے زیادہ لمبے چہرے پر گھنی داڑھی، آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار ایک لمحہ کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سندالی ہے۔ وہ اپنا کلباڑا گھما کر پینترے بدلتا رہا۔ اور ایک بار پھر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ لیکن بہر حال اب اتنا فوری نہیں تھا کہ میں اس سے خوفزدہ ہو جاؤں۔ ابتدا کی بات الگ تھی۔ اب میں

”ارادہ کیا ہے اب؟“

”قاسم خان میرے ذہن میں وہی منصوبہ ہے۔ اپنا حلیہ سندالیوں جیسا بنا کر میں چاہتا ہوں کہ خود سندالیوں میں داخل ہو جاؤں۔ اور اپنے آپ کو سندالی ظاہر کروں اس طرح ہم ان کے بارے میں اندر سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

”یہ آسان ہو گا؟“

”مشکل کیا ہے؟ تم نے جس سندالی کو دیکھا۔ اس میں اور ہم میں بس اتنا ہی فرق ہے۔ اگر ہم اپنے چہرے پر پیلے رنگ کی مٹی مل لیں تو سندالی تصور کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ مٹی یہاں بکثرت موجود ہوتی ہے۔“

”اور لباس؟“

”اس سلسلے میں ہماری مدد سندالی ہی کریں گے۔“

”کیسے؟“

”یہ تو سندالیہ میں داخل ہو کر ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں یا پھر ممکن ہے سندالیوں سے ہماری ملاقات کہیں راستے ہی میں ہو جائے۔ اور ہم ان سے لباس حاصل کر کے انہیں پتھر کی کسی چٹان کے نیچے اس طرح روپوش کر دیں کہ ان کی بدبو بھی فضا میں نہ پھیلنے پائے۔“ قاسم خان کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہمارا تو کام ہی یہ تھا اور ظاہر ہے کہ ہمیں اس کام میں کوئی دقت نہیں پیش آسکتی تھی۔ قاسم خان نے کہا۔

”یقین کرو اب تو قتل و غارت گری بھول ہی گئے۔ ایسا لگتا ہے یار جیسے ہم شریف آدمی بننے جا رہے ہوں۔ اور یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔“ میں ہنسنے لگا تھا۔ بہر حال بہت وقت گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے قاسم خان کے خرائے سے رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ چاند نمودار ہونے لگا۔ جس علاقے میں ہم لوگوں نے قیام کیا تھا۔ وہاں چاروں طرف اونچی اونچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ اور ان کے درمیان سرسبز و شاداب گھاس لہرا رہی تھی۔ پھولوں کے خود رو حسین پودے جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ اور ان میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوائیں ان پھولوں کی خوشبو کو منتشر کر رہی تھیں۔ یہ منظر مجھے بے حد حسین محسوس ہوا۔ قاسم خان کو سوتا چھوڑ کر میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور کافی دور تک آگے

”خیال ہے تیرا ذرا دیکھ، اس کی جسامت دیکھ۔ ایک دفعہ اگر تو اس کے قبضے میں آجاتا تو پھر تجھے زندگی بچانا مشکل ہو جاتی۔“ میں نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے قاسم خان کو دیکھا اور کہا۔

”ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا قاسم خان۔ کبھی میرے مد مقابل مت آنا۔ اور اس غلط فہمی کا شکار نہ رہنا کہ میں جسمانی طور پر کم پڑ سکتا ہوں۔“

”بس بس غور کی بات مت کر۔ میں نے تو یہ محسوس کیا تھا کہ وہ شخص تجھے قتل کرنے ہی والا ہے اور اس کے بعد میں بالکل تیار رہ جاتا۔ وادی سحر کی تنہائی میرے لئے بڑی مشکل ہوتی۔“

”ایرا تو تیرے ساتھ ہے۔ احمق گدھے۔“

”تو کیا واقعی تو سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہے؟“

”تو اور کیا...؟ یہ سندا لی ہے میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سندا لیہ اب کس سمت ہے اور وہاں جانے کے لئے اب کیا کرنا چاہئے؟“

”یہ میں تجھے بتا سکتا ہوں۔“ قاسم خان نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”تو یوں کر کھڑا اپنے سر پر مار لے۔ دوسری دنیا میں تم لوگوں کی ملاقات ہو جائے گی۔ اور تو اس سے یہ معلوم کر لینا کہ سندا لیہ کدھر ہے؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا میں اس شخص کے قریب بیٹھ گیا اس کی سانس ختم ہو چکی تھی۔ اور میں اس کے سینے کے سوراخ کو دیکھ رہا تھا۔ دل کے بالکل قریب تھا ظاہر ہے چند ہی لمحوں میں اس کا کام تمام ہو گیا ہو گا۔

”اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں نے صرف تیری جان بچانے کے لئے کوشش کی تھی۔ اور میں نیند سے جاگا تھا۔“ غرضیکہ اب وہ مر چکا تھا۔ ہم اس سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ میں قاسم خان کے ساتھ واپس آ گیا۔ ہم لوگ پریشان سے بیٹھ گئے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ صبح کو تقریباً چار یا ساڑھے چار بجے کا وقت ہو گا کہ اچانک ہی زمین ہلنے لگی۔ اور ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ قاسم خان بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ واقعی چٹانیں ہل رہی تھیں۔ پھر ہمارے کانوں نے ایک عجیب سی آواز سنی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ہی گھوڑے بھی آہستہ آہستہ ہنہانے

خود بھی اس کے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ اس بار میں نے اپنے کھڑے پر اس وار روکا تھا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان قوت آزمائی ہونے لگی۔ وہ بلا ٹبر مجھ سے کہیں زیادہ لمبا ترنگا اور طاقتور تھا۔ لیکن اس وقت میری فطرت میں وحشت ابھر آئی تھی۔ چنانچہ کھڑے والے کو فوراً ہی یہ احساس ہو گیا کہ میں جسامت میں اس سے بے شک چھوٹا ہوں۔ لیکن مجھ سے مقابلہ آسان نہیں ہو گا۔ لیکن وہ کھڑے کے داؤ پیچ دکھانے لگا۔ اور اپنی سی ہر ممکن کوشش کرنے لگا کہ کھڑے کو میری کمر میں مار کر ریڑھ کی ہڈی دو ٹکڑے کر دے۔ میں نے غور کیا تھا کہ اسے زیر کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ اب وہ دیوانوں کی طرح حلق سے دھاڑ نکال رہا تھا۔ اور ان دھاڑوں میں بے بسی تھی۔ اندازہ یہ ہوتا تھا کہ اب اس پر دیوانگی سوار ہو رہی ہے۔ ایسی جنگ میں اگر انسان ذہنی طور پر دیوانہ ہو جائے تو نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ غالباً اس شخص نے زندگی میں بہت کم لوگوں سے شکست کھائی ہو گی۔ اور اس وقت وہ اپنی ناکامی سے پریشان ہو گیا ہو گا۔ بہر حال ہم دونوں بری طرح لڑ رہے تھے۔ پھر اچانک ہی میں نے اسے زور سے دھکیلا۔ اور وہ کلا پیچھے ہٹ کر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور زخمی کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس نے مجھ پر حملہ کیوں کیا ہے؟ لیکن اچانک ہی مجھے اپنے عقب میں سے ایک گرج کی آواز سنائی دی۔ اور دوسرے لمحے کھڑے والے کے سینے میں سوراخ ہو گیا۔ وہ کھڑا ہاتھ میں لئے لئے کئی قدم لڑکھڑا کر آگے بڑھا اور پھر اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ جبکہ میں نے پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ وہاں سے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو مجھے قاسم خان نظر آیا۔ جس کی بندوق کی نال سے دھوئیں کی لکیر بلند ہو رہی تھی۔ قاسم خان کو دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”یار یہ کیا کیا تو نے؟“ قاسم خان رانفل سیدھی کر کے چٹانوں پر چھلانگیں لگاتا ہوا میرے نزدیک پہنچ گیا۔

”کیا کہا تو نے؟“

”بے وقوف ہے تو قاسم خان۔ کیا تو نے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ میں نے اسے آخر کار زیر کر لیا تھا۔“

کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی بار ہم نے جنگلی بھینسوں کو اس قدر تیز رفتاری سے دوڑتے دیکھا تھا۔ لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ راستے میں چند جنگلی بھینسوں نے ٹھوکر کھائی اور ان کے گرنے کے ساتھ ساتھ ہی جنگلی بھینسوں کے دوڑنے کی رفتار کچھ کم ہو گئی۔ ان میں سے بہت سے جنگلی بھینسے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرنا شروع ہو گئے تھے۔ جب کہ فائزوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ جبکہ یہی آوازیں بھینسوں کو خوفزدہ کر کے دوڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں اور قاسم خان اپنے گھوڑے کو کلنی آگے نکل لے گئے تھے۔ لیکن اب بھی بے شمار جنگلی بھینسے منہ کے بل گرنے والے بھینسوں سے کلنی آگے نکل آئے تھے۔ اور ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ البتہ اب ان کی رفتار اس طرح تیز نہیں تھی۔ جس تیز رفتاری سے وہ پہلے آ رہے تھے۔ دریائے سانا کے کنارے کنارے یہ مختصر وقت تیز ترین سفر کا ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ ہمارے گھوڑے بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ ہم ظاہر ہے جنگلی بھینسوں کے اس غول کو روک نہیں سکتے تھے۔ اور یہ بلائے عظیم جس طرح ہمارا تباہی پانچا کر دیتی اس کا بھی ہمیں بخوبی اندازہ تھا۔ اور ہمارے گھوڑے بھی یہ بات بخوبی سمجھ رہے تھے البتہ ایک بات ہم نے محسوس کی تھی کہ اب فائزوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ جنگلی بھینسوں کو ہم پر دوڑانے والے شاید اپنی کارکردگی سے غیر مطمئن تھے۔ اور انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم ان کی گرفت سے نکل گئے ہیں۔ بہت دیر کی بعد یہ احساس ہوا کہ جنگلی بھینسے بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود گھوڑوں کو ابھی نہیں روکا جاسکتا تھا۔ اب ہم ایک وسیع و عریض میدان میں دوڑ رہے تھے۔ جہاں دریائے سانا کے کنارے پھیلے ہوئے تھے اور اس کی رفتار بھی ست ہو گئی تھی۔ لیکن دریا کے کنارے جگہ جگہ دلدل بنی ہوئی تھی۔ اور ان دلدلوں سے بچ کر ٹکنا بڑی احتیاط کا کام تھا۔ دلدلوں میں کہیں کہیں درخت بھی آگے ہوئے تھے۔ بہر حال خاصا فاصلہ طے کر لیا گیا اور رات کا ایک طویل و عریض حصہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ آگے کچھ تھکن کا احساس ہوا۔ تو میں نے چیخ کر کہا۔

”قاسم خان یہ جگہ محفوظ ہے۔ کیا خیال ہے یہاں رکا جائے؟“ قاسم خان خود بھی بری طرح تھک گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی رک گیا۔ پھر گہری رات نے سارا ماحول اپنی

لگے۔ زمین مسلسل دھک رہی تھی۔ پھر ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہمارے بائیں سمت دریائے سانا کے مشرقی کنارے پر یہ آوازیں ابھر رہی ہیں۔ گرد و غبار کا ایک طوفان بھی ادھر سے اٹھ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لئے تو ہم بالکل نہ سمجھ سکتے۔ لیکن ہمارے گھوڑے سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے رے ترانا شروع کر دیئے تھے۔ ہم نے چونکہ ان کے رے دو بڑے پتھروں کے نیچے دبا رکھے تھے اس لئے انہیں دقت نہیں ہوئی۔ اور انہوں نے اچانک ہی چھلانگیں لگا دیں۔ ہم حیران کھڑے اس خوفناک منظر کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہی ہم نے ان کی کلنی بلاؤں کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور ایک لمحہ کے اندر اندازہ ہو گیا کہ وہ جنگلی بھینسوں کے غول ہیں۔ بہت بڑے غول تھے۔ اور اسی طرف رخ کیا ہوا تھا انہوں نے۔ گو ادھر چٹانیں تھیں۔ لیکن بہر حال اگر ہم اس غول کی لپیٹ میں آ گئے۔ تو ہڈیوں کا سرمہ ہو جائے گا۔ اور پھر روشنی نے بھینسوں کے غول کو نمایاں کر دیا۔ اور ہماری جان ہی نکل گئی۔ بھینسوں کا یہ غول بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ تعداد اتنی تھی کہ یقین کرنا مشکل ہو جائے۔ وہ دوڑتے ہوئے اسی سمت چلے آ رہے تھے۔ اور اب اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ گھوڑوں کو پکڑا جائے اور ان پر سوار ہو کر بھینسوں کی مخالف سمت دوڑنا شروع کر دیا جائے۔ ہم نے اپنی نگاہیں اٹھا کر ان گھوڑوں کو دیکھا وہ بہشت زدہ سے ایک جہنم پر چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ ہم ان کی جانب دوڑے۔ اور چند ہی لمحوں میں ہم دونوں نے اپنے گھوڑوں کی لگائیں پکڑ لیں۔ پھر اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ بھینسوں کا یہ گروہ بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہماری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اور ہم نے گھوڑوں کو ان کی مخالف سمت اندازاً دوڑا دیا تھا۔ لیکن اچانک ہی ہمارے کانوں نے فائزنگ کی آوازیں سنیں اور ہمیں بخوبی یہ اندازہ ہو گیا کہ غول کو اس سمت دوڑانے میں انسانی عقل کارگر ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے جنگلی بھینسوں کے غول کا رخ اس جانب کر دیا ہے اور پھر صرف ایک ہی صورت حل تھی وہ یہ کہ دریائے سانا کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کو اتنی تیزی سے دوڑایا جائے کہ بھینسیں ہم تک نہ پہنچنے پائیں۔ چنانچہ ہم نے اس سمت اپنی پوری توجہ مبذول کر دی۔ جنگلی بھینسے پھنکارتے ہوئے اسی جانب آ رہے تھے ان کی آوازوں سے ان کے غیض و غضب کا اندازہ ہوتا تھا۔ گھوڑے بھی اپنی جان بچانے کے لئے

کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہمارے آدمیوں کو بھی جس طرح چاہیں استعمال کرتے ہیں۔ دل سے کوئی ان کے ساتھ نہیں لیکن سب کو اپنی زندگی پسند ہے۔ تھوڑے دن پہلے کی بات ہے کہ ہولیہ نامی بستی میں خوفناک تباہی پھیلی تھی اور اب وہ بستی غیر آباد ہے۔ جو شخص تباہی پھیلانے کا سبب بنا تھا۔ اب وہ سندالیہ میں رہتا ہے۔ انہوں نے بے شمار مقامی لوگوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ انہیں ڈرا دھمکا کر یا انہیں لالچ دے کر انہوں نے انہیں اپنی مدد پر آمادہ کر لیا ہے۔ سندالیہ جو ہتھیار استعمال کرتے ہیں وہ آگ اور دھماکوں کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کو وہ آسمان کا جادو کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر سندالیوں سے کوئی مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچے تو آسمان کا جادو اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہ سب سے خراب مسئلہ ہے۔ اور ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ ”ہمیں بہت سی صورت حال کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں ایک بہت ہی بہتر بات ہوئی۔ وہ یہ کہ ہمیں سندالیوں کے لباس مل گئے۔ اور یہ لباس ہم نے اپنی جسامت کے مطابق محفوظ کر لئے تاکہ مناسب موقع پر وہ ہمارے کام آجائیں۔ پھر کافی دن تک ہم یہاں رہے۔ وہاں لکٹو کی خواہش کے مطابق سارا انتظام کر کے آئے تھے۔ اس لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ آخر کار یہاں کافی قیام کے بعد اور سندالیہ کا نقشہ مرتب کر کے ہم لوگ وہاں سے آگے چل پڑے۔ قاسم خان اب بہت زیادہ شرارتیں کرنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ اب زندگی کا تو کوئی امکان نہیں ہے۔ تھوڑی بہت زندگی جو باقی بچی ہے۔ وہ ان ہی پراسرار وادیوں میں گزر جائے گی۔ ”وادی سحر“ ہمیں زندہ واپس جانے کی اجازت کبھی نہیں دے گی۔ لیکن میں اس قدر ناامید نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے تو اگر مر گیا تو تیری لاش تو میں اٹھا کر جدید آبادیوں تک نہیں لے جا سکتا۔ لیکن ایک وعدہ تجھ سے کرتا ہوں کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے کسی مناسب جگہ تیری یادگار ضرور بنادوں گا۔ اور وہاں خود اپنے ہاتھوں سے پھول چڑھاؤں گا۔“

”خیر ایک بات میں بھی کتنا ہوں تجھ سے۔ اگر واقعی میں مرنے لگا تو اکیلا نہیں مرنے لگا۔ کوئی نہ کوئی ایسی ترکیب نکال لوں گا کہ تو بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔“ میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔ واقعی قاسم خان کا ساتھ چھوڑنا میرے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم اس بستی سے چل پڑے۔ ہمارے گھوڑے ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔

آغوش میں لے لیا۔ چاند شاید اس خوفناک منظر سے روپوش ہو گیا تھا۔ دریائے سنا کے کنارے کنارے اب اس جگہ درخت نظر آ رہے تھے۔ اور یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ کون کہہ سکتا تھا کہ ان درختوں کے نیچے دلدل ہو۔ چنانچہ ہم نے خاصا فاصلہ اختیار کر کے اپنے لئے قیام گاہ تجویز کی تھی۔ پھر کافی تھکن اتارنے کے بعد ہم نے آخر کار یہاں سے آگے کا سفر شروع کیا۔ دریائے سنا کے پھیلے ہوئے کنارے پھر سے سکنے لگے۔ اور اس کی روانی میں تیزی پیدا ہونے لگی۔ بہت دیر تک کے سفر کے باوجود کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی تھی۔ بھینسوں کا اب دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی شام کے ملکبوں میں ہم نے دھوئیں کے لہریئے دیکھے۔ جو نشیب سے اٹھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم اچانک ہی اس کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ ہم اس دھوئیں کی نوعیت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے۔ اور ظاہر ہے دھواں بستیوں سے ہی اٹھتا ہے۔ بستی جو کوئی بھی تھی شاید نشیب میں تھی۔ طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں وہ بستی نظر آئی۔ اور ہم نے ایک جگہ پوشیدہ ہو کر وہاں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ڈھلانوں پر کھیت بکھرے ہوئے تھے۔ بھیڑیں اور بکریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بستی معمولات سے بھرپور زندگی سے قریب اور تھوڑی دیر کے بعد ہم بستی کے پہلے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ بستی والے اچھی فطرت کے لوگ تھے۔ انہوں نے مہمانوں کو مہمانوں کی حیثیت سے خوش آمدید کہا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں پر مشتمل یہ بستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ہم نے ان سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ہمیں یہ معلوم ہوا کہ سندالیہ والے یہاں نہیں ہوتے۔ سندالیہ تو بہت آگے ڈھلانوں میں آباد ہے۔ بہر حال ساری باتیں اپنی جگہ یہاں تک پہنچ کر ہمیں بڑے سکون کا احساس ہوا تھا۔ مہمان نواز لوگ اور پرسکون ماحول بستی کے سردار کا نام ناگا تھا۔ ناگا سے ہم نے سندالیوں کے بارے میں پوچھا۔ تو ناگا نے ادھر ادھر دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ہماری بستی کا کوئی شخص سندالیوں کی برائیوں میں نہ ایک لفظ سننا پسند کرے گا اور نہ ہی تم سے کچھ کہنا۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں۔ ہم سندالیوں سے خوفزدہ ہیں۔ ابھی تم یہ بات نہیں جانتے کہ بے شمار سندالی یہاں مقامی لوگوں کی حیثیت سے آباد ہیں۔ اور یہاں سے ٹولیاں بن بن کر جاتی ہیں۔ اور بستیوں میں تباہی مچاتی ہیں۔ ہم ان سے

سندالیہ کے نقوش کی ترتیب جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ہو چکی تھی۔ تقریباً چھ دن چھ راتوں کا سفر طے کر کے آخر کار ہم ایک بڑی عجیب و غریب جگہ پہنچے۔ یہ ایسی پہاڑی چٹانیں تھیں۔ جو آگے جا کر ایک دم ختم ہو جاتی تھیں۔ اور ان کے نیچے خوفناک گہرائیاں تھیں۔ اور ان گہرائیوں میں سندالیہ آباد تھا۔ سندالیہ کی پہچان یہ تھی کہ پتھروں کی بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ اور ان عمارتوں کے درمیان انسان ننھے ننھے کھلونوں کی مانند چلتے پھرتے اور عمل کرتے نظر آتے تھے۔ یہاں رک کر ہم بہت دیر تک اس عجیب و غریب مملکت کو دیکھتے رہے۔ جس کا نام سندالیہ تھا۔ ہم یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ حالانکہ راستے میں ہم نے سندالیوں کے لباس پہن لئے تھے۔ اور اپنی رائفلوں اور ایمونیشن کے ساتھ مکمل طور پر سندالی بن گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے بعد ہی ہم ان کے درمیان جاسکتے تھے۔ ورنہ کوئی بھی خطرہ ہماری زندگیوں ختم کر سکتا تھا۔



اب اسے تقدیر کی راہنمائی کما جائے یا پھر تدبیر کی کارگیری کہ ہم ان لوگوں میں پوری طرح کھپ گئے تھے۔ اور بہتی کے کسی بھی شخص نے ہماری جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ہمیں یہاں پہلا دن اور پہلی رات بھی گزر گئی۔ لیکن کوئی ایسی کارروائی وجود میں نہیں آئی۔ جو مشکلات کا باعث ہوتی۔ جب ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہماری شخصیت یہاں بے داغ ہے تو ہم نے سندالیہ کی آبادی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ابھی ہمیں یہاں کے بارے میں مکمل معلومات درکار تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے کوئی ایسا ٹھکانہ دریافت کرنا تھا۔ جو ہمارے لئے قیام کی جگہ مہیا کر دے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ہم نے اس پوری آبادی کا چکر لگایا۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں کے رہنے والے ہمارے جیسے نقوش ہی رکھتے ہیں۔ اور ان کے چہروں میں اور ہمارے چہروں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ شاید یہی بات تھی۔ جس کی وجہ سے ہماری طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی۔ اینٹوں کے مکانات میں زندگی گزارنے کا انداز چند ہی لمحوں میں اپنی وضاحت کر دیتا تھا۔ ہم کسی ایسے عمل کی تلاش میں تھے۔ جو ہمارے لئے بہتری مہیا کرے۔ پھر قاسم خان نے یہاں اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ بوڑھی عورت روفتہ اپنا سامان اٹھائے جا رہی تھی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قاسم خان نے جلدی سے آگے بڑھ کر روفتہ کو روک لیا اور اس کا سامان اپنے شانوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

”بڑی ام! یہ تو بہت بری بات ہے کہ ہم جیسے جوانوں کا سامنا ہونے کے باوجود تم اپنا سامان خود اٹھائے جا رہی ہو۔“ بوڑھی نے ہمیں حیرت سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”کون ہو بیٹا تم؟“

”لو بڑی ام! بیٹا کہنے کے بعد پوچھ رہی ہو کہ کون ہیں ہم؟“ قاسم خان کی چرب زبانی پر میں مسکرا دیا۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر ایسے آثار نظر آئے۔ جیسے وہ رونے

”تو اب بڑی اماں کہہ کر تم جھونپڑے کو میرا کہہ رہے ہو۔“

”لو بھئی یہ تو بہت برا ہوا۔ بڑی اماں کو ہماری وجہ سے تکلیف ہو گی۔“

”بیٹا تمہاری وجہ سے مجھے یہی تکلیف ہو سکتی ہے۔ جو اس وقت ہوئی۔ یعنی یہ کہ میں اتنا بوجھ اٹھانے سے بچ گئی۔ میرے دو جوان بیٹے ہوں تو میری زندگی بٹ جائے گی۔“

”مگر بڑی اماں؟“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ اب تم میرے پاس ہی رہو گے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔ کمانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بڑی اچھی زمینیں ہیں میری۔ اس سے سبزیاں آتی ہیں۔ لیکن بس تنہا ہوں۔ دنیا میں۔ ایک بیٹا تھا جس کا نام تف تھا۔ اور بس اس کے بعد تف اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور میری زندگی میں کچھ نہ رہا۔ اب اگر مجھے تقدیر نے دو دو بیٹے عطا کر دیئے ہیں تو کم از کم میرے ساتھ یہ سلوک تو نہ کرو۔“ قاسم خان نے میری طرف دیکھ کر مجھے آنکھ ماری اور بولا۔

”یہ تو بہت بری ہو گی۔ بڑی اماں سمجھیں گی کہ ہم۔۔۔“

”کچھ نہیں سمجھوں گی میں۔ کچھ نہیں سمجھوں گی۔ تم بس میرا دل نہ توڑو۔“

ہاں ہماری یہ مشکل بھی حل ہو گئی اور بوڑھی عورت قاسم خان کو تف کہہ کر مخاطب کرنے لگی اور مجھے زالہ کہا گیا۔ لیکن نام کوئی بھی ہو۔ ہمیں تو اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ بوڑھی کی تھوڑی سی خدمت ہو جاتی وہ الگ منافع کی بات تھی۔ ظاہر ہے دعائیں ہی مل سکتی تھیں۔ یہ ساری صورت حال خاصی دلچسپ تھی۔ اور ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ سندالیوں کا سربراہ کون ہے اور کس طرح وہ ان لوگوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہماری سمجھ میں کافی دن تک یہ بات نہیں آ سکی تھی اور ہم مسلسل یہ جائزہ لینے کی کوششوں میں مصروف تھے اب چونکہ یہاں ہمارا ایک مقام بن گیا تھا اور بوڑھی کے ساتھ رہتے ہوئے کسی نے بھی ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا البتہ بچی کا چکر لگاتے ہوئے ہم نے یہ دیکھا کہ پوری آبادی میں بھنٹیاں لگی ہوئی ہیں اور ان بھٹیوں پر بہترین ہتھیار تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہتھیار لازمی بات تھی اس جنگ کے لئے تیار کئے جا رہے تھے جو یہ لوگ لڑنے والے تھے۔ ہم ان لوگوں کی مہارت کا

والی ہو۔ قاسم خان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”اپنا گھر بتاؤ! تاکہ ہم یہ سلمان تمہارے گھر پہنچا دیں۔“

”میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔“ اور ہم بوڑھی کا سلمان لئے ہوئے ایک چھوٹے سے کپے جھونپڑے پر پہنچ گئے۔ جس کا دروازہ بند نہیں تھا۔ سلمان اندر رگھنے کے بعد قاسم خان نے کہا۔

”اماں جب بھی کوئی کام ہو ہمیں آواز دے لینا۔“

”سنو بیٹا جا کہاں رہے ہو؟“

”بس اماں چلتے ہیں۔“

”بیٹا ایسے نہ جاؤ۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزار لو۔ آج تم نے میرے دل میں نہ جانے کیا کیا دے ہوئے دکھ تازہ کر دیئے ہیں۔“ قاسم خان جھونپڑی کی زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”بڑی اماں تم دکھی نہ ہو۔ یقین کرو جب ہم نے تمہیں سلمان اٹھا کر لڑکھڑائے قدموں سے جاتے ہوئے دیکھا تو ہمارے دل نے کہا۔ لعنت ہے ہماری جوانی پر جو تمہارے کام نہ آ سکے۔ بڑی اماں اپنے دل سے ہر دکھ نکال دو۔ ہمیں جب بھی آواز دو گی ہم تمہارے پاس آ جائیں گے۔“

”بیٹا سندالی ہو؟“

”ہاں بڑی اماں۔“

”تو پھر تھوڑا وقت تو میرے پاس گزارو۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”نہیں بڑی اماں ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”ارے کیا واقعی؟ اگر ایسا ہے تو کیا یہ جھونپڑا تمہارے لئے کارآمد نہیں ہو گا؟“

”نہیں بڑی اماں جھونپڑا تمہارا ہے۔“

”بڑی اماں بڑی اماں کئے جا رہے ہو حالانکہ جب میں نے تم سے سلمان اٹھانے کے لئے منع کیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ بیٹا کہہ رہی ہوں میں تمہیں۔ اور اس کے بعد سلمان تمہارے سر پر رکھوانے سے گریز کر رہی ہوں۔“

”نہ۔۔۔“ قاسم خان بولا۔

اچھی طرح جائزہ لے رہے تھے۔ اور اس بات کی تشویش کا شکار بھی تھے کہ بچا
آبادیوں والے کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے جا رہے ہیں۔ اور انہیں زیادہ تر اس
مصیبت کا علم نہیں ہے۔ بہر حال اس کے بعد قاسم خان نے کہا۔

”کیا خیال ہے شہباز! سندالیہ کی یہ آبادی تو بڑی سنگین نوعیت کا حامل ہے۔
کیوں نہ آگے بڑھ کر سندالیہ کا جائزہ لیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ ہم اچھی طرح سندالیہ کو دیکھیں اور اس پر غور کریں کہ یہ

کیا کیا ہے؟“

”بات بہتر ہے اور تجویز عمدہ۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں اس سے خاصی معلومات

جائیں گی۔“

”لیکن شرط یہ ہے کہ بڑے خفیہ طور سے یہ کام کیا جائے۔ اور ایک طرح سے

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے آپ کو کسی بھی شکل میں منظر عام پر نہ لایا جائے۔ کیا خیال
ہے تمہارا؟“

”اچھا آئیڈیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا کہتے ہو؟“

”نہیں میں سمجھتا ہوں ہمیں چلنا چاہئے۔“ اور پھر ہم دونوں نے تیاریاں کر لیں۔

بڑی املا یعنی روفتہ سے ہم نے اجازت مانگی۔ بوڑھی واقعی بڑی محبت سے ہم سے مل
تھی۔ اس نے کہا۔

”تم جلدی واپس آ جاؤ۔ اب جب تم نے مجھے یہ محبت دے دی ہے تو اس ع

میں مجھ سے یہ محبت چھیننے کی بات نہ کرنا۔“ بہر حال اس کے بعد ہم لوگوں نے مختصر
تیاریاں کیں اور پھر وہاں سے چل پڑے۔ ذہنی طور پر ہم بہت پہلے لنگوٹا کے منصوبہ

پر عمل کرنے کو تیار تھے۔ یہ بات تو طے شدہ تھی کہ لنگوٹا ایک زبردست جادوگر تھا اور
وادی سحر سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ ہمیں اس کی طرف سے ہر وقت مدد مل سکتی

تھی۔ اور باقی خطرات بہت ہی کم تھے۔ پھر ہم کافی طویل فاصلہ طے کر کے سندالیہ
دور نکل آئے۔ سندالی آبادی ہمارے لئے بڑی حیرتوں کا باعث تھی۔ اور ہم اس کے

اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ بلندیوں سے نیچے اترتے ہوئے دور دور تک گلابوں کی
بار چھائی ہوئی تھی۔ بادلوں کے سائے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گلاب کے
پتوں کی خوشبو دور دور تک منتشر کر رہے تھے۔ اور ہم اسے وادی گلاب کہہ سکتے

تھے۔ بڑی حسین جگہ تھی اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان علاقوں میں آنے کے
بد طبیعت پر ایک عجیب سا سحر طاری ہو گیا ہے۔ سفر کے پہلے مرحلہ میں ہم اس

ہولوں کی وادی سے گزرے۔ اس کے بعد ہمارا واسطہ ان گھنے جنگلوں سے پڑا جن کے
بلے روشنی کو زمین تک نہیں پہنچتے دیتے تھے۔ ان کی شاخیں آپس میں الجھی ہوئی

ہیں اور ان کے نیچے اندھیرا پھیلا رہتا تھا۔ اس جگہ گھوڑوں کے سفر کرنے میں کافی
پریشانی ہو رہی تھی۔ اور وہ جگہ جگہ بدک جاتے تھے۔ آگے چل کر یہ جنگل اور

ڈھانگ ہو گئے تھے درختوں کی شاخوں سے لمبے لمبے سانپ لپٹے رہتے جن سے بچ کر
ہمارے کی روشنی میں بھی دشوار تھا۔ رات کو یہ سفر بہت ہی خطرناک ہو گیا۔ لیکن اب

ڈھانگہ مہل آگئے تھے اس لئے واپس بھی نہیں جاسکتے تھے۔ البتہ ان علاقوں میں قیام
نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی لمحہ موت کا لمحہ بن سکتا تھا۔ البتہ یہی خوش بختی تھی

جنگلوں میں درندے نہیں تھے۔ اور یقینی طور پر ان کے یہاں موجود نہ ہونے کی
یہ خوفناک حشرات الارض تھے۔ بہر حال اس سنسنی خیز وادی کا اختتام اس وقت ہوا

کہ سورج بلند ہو گیا۔ رات کو ہم سفر جاری رکھنے پر مجبور تھے۔ لیکن جنگلوں کا سلسلہ
اُتوتے ہی ہمیں احساس ہوا کہ اب ہم تھکن سے بری طرح چور ہو گئے ہیں۔

ما کا سفر بے حد سنسنی خیز ہو گیا تھا۔ جنگل کے سرے پر تاحد نگاہ ویران پہاڑیاں
اُٹھتی تھیں۔ اونچی نیچی بھورے رنگ کی چٹانیں جگہ جگہ سر جوڑے کھڑی ہوئی

تھیں۔ اور ان کے درمیان کہیں کوئی ایسی پگڈنڈی نظر نہیں آتی تھی کہ جسے دیکھ کر
ہم کو ان راستوں پر بھی انسانی قدم آچکے ہیں یا ان پر سفر ہوتا رہا ہے۔ حشرات

ارض میں بھی پہاڑوں کے درمیان موجود تھے اور چٹانوں کے درمیان رینگتے پھر
تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں آس پاس کوئی چٹان نہیں تھی۔

پر بہت بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد ہم گھوڑوں سے
اُتارے۔ پھر ہم نے گھوڑوں کی پشت سے وہ سامان نیچے اتار لیا جسے ہم ساتھ لے کر

سفر جاری رکھنے کے لئے تیار تھے۔ اور ہم اس کے

ساتھ لے کر

”کون؟“

”پنانے والے۔“ وہ مخصوص انداز میں بولا اور مجھے ہنسی آگئی۔

”باب۔ تمہاری شادی کی خوشی میں فلزنگ ہو رہی ہے۔“

”مگر میں ناشاد ہوں۔“ وہ مغموم لہجے میں بولا۔

”کیوں...؟“

”بس مجھے زندگی کی خوشیوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہائے ایرا کیا سوچتی ہو گی تو اپنے دل میں۔ ایک محبوب ملا تو ایسا نامکمل کہ دوسروں کے قبضے میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔ انسان کبھی کبھی اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتا۔ فلزنگ کی آواز اچھی خاصی تیز ہو گئی تھی۔ اچانک ہی قاسم خان چونکا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ارے تم شہباز، اور ایکٹنگ کر رہے ہو۔ اچھی نہیں لگ رہی۔“

”ایکٹنگ کہو گے تم اسے۔ زندگی کے سب سے بڑے دکھ میں مبتلا ہوں۔ آہ!

ایرا۔ ارے باپ رے یہ گولیاں کہیں ہماری جانب رخ نہ کر لیں۔“

”آؤ دیکھیں۔“

”میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ اور مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ قاسم خان نے کہا لیکن میں اب اس ہنگامہ آرائی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔

”ارے، ارے، ارے اب اس بھرے جنگل میں کیا تنہا چھوڑ جانے کا ارادہ ہے؟

ملائے میں سخت بھوکا ہوں۔“ میں نے قاسم خان کی کوئی بات نہیں سنی۔ لیکن سامان

میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ قاسم خان میرا مطلب سمجھ گیا۔ چنانچہ کراہتا ہوا اٹھا۔ اور

خود بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ہم تیزی سے اس پہاڑی سلسلے کی جانب چل پڑے۔

دوہرے گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابھی ہم نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا

کہ اچانک پہاڑوں کے رخنوں سے ایک سر بلند ہوا۔ اور ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر

دوسری جانب سے رائفل کی گولیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ گولی قاسم خان کے پاؤں سے

نکل گئی تھی۔ میں چونکہ اس سے پہلے ہی اس سر کو دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے اپنا

آئے تھے۔ گھوڑوں کے پاس چارہ اور پانی رکھنے کے بعد ہم دونوں لمبے لمبے لیٹ گئے

اس سفر کی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس دوران میں نے یا قاسم خان نے آپس میں

کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ اصل میں یہ سب کچھ ہماری توقع کے خلاف تھا۔ پھولوں کی

وادئ گویا ان جنگلوں کی طرف آنے کی دعوت دیتی تھی۔ لیکن اب ہم اس وادی کو اتار

لئے خطرناک کہہ سکتے تھے کہ وہ ایک سرخ دھوکہ تھا۔ اور اس دھوکے کو کھا کر آئے

سفر جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔ اس دوران ہم نے آپس میں کوئی گفتگو بھی نہیں کی تھی۔

بہر حال اب آنکھیں کھلی رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ شاید ان جنگلوں میں داخل ہونے پر

بجائے دس بیس میل لمبا راستہ منتخب کر لیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ آگے چل کر یہ خیال

تھا کہ زیادہ سے زیادہ جنگلوں میں درندوں سے مدد بھیڑ ہو سکتی ہے۔ اور بہر حال یہ بات

ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی۔ قاسم خان تو بالکل نیم مردہ حی حالت میں نثر

پر پڑا ہوا تھا۔ میری اپنی حالت بھی بہتر نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے صاف ستھری نثر

پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے بعد میں بے خبر ہو گیا۔ مجھے نہیں

معلوم تھا کہ قاسم خان کی اس وقت کیا کیفیت ہے۔ لیکن بہر حال تھوڑی دیر تک میں

سوتا رہا۔ پھر آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔ میں نے ایک نگاہ قاسم خان کو دیکھا۔ وہ

سدا سو رہا تھا۔ ہم نے اب تک کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ یہ جگہ ہی اتنی خطرناک تھی

کہ کھانے پینے کا تصور بھی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ گھوڑوں نے البتہ کھاپی لیا تھا

ایک بار پھر میں نے قاسم خان کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ جاگ اٹھے تو

کارروائی کی جاسکتی ہے۔ بہت دیر سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اور جب تھوڑی سی حتم

دور ہو گئی تھی تو بھوک لگ رہی تھی۔ بہر حال قاسم خان کے انداز سے یوں لگتا

جیسے وہ بہت زیادہ تھکا ہوا ہے۔ اور نیند میں اس قدر مست ہے کہ کھانے کے بارے

میں نہیں سوچے گا۔ بہر حال زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ تھوڑا بہت کھانا پینا کر کے

سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ اچانک ہی فلزنگ کی آوازیں سنائی دیں اور میں اچھل

بیٹھ گیا۔ یہاں بھی مصیبتیں تعاقب کر رہی ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ قاسم خان

بھی یا تو نیند پوری ہو گئی تھی یا پھر فلزنگ کی آواز نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔

بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے بڑے عجیب سے انداز میں پوچھا۔ ”آگئے؟“

دیں۔ جس کی وجہ سے وہ زمین پر پڑے ہوئے شخص پر فائز نہ کر سکے۔ انہوں نے اس شخص کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر سات آٹھ افراد تھے۔ ان میں سے پانچ ہماری گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ دو بہ مشکل تمام گھوڑوں پر سوار ہو سکے۔ پھر انہوں نے گھوڑوں کو سرسٹ دوڑا دیا۔ انہوں نے جس سمت کو رخ کیا تھا ہم نے اس طرف دیکھ لیا تھا۔ اب ان کے جانے کے بعد یہ ضروری تھا کہ ہم زمین پر پڑے ہوئے شخص کا جائزہ لیں۔ چنانچہ ہم آگے بڑھے اور اس شخص کے سر پر پہنچ گئے۔ جس نے گولی چلا کر اس شخص کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن قریب پہنچ کر جب ہم نے اس شخص کی صورت دیکھی تو چونک پڑے۔

وہ مرد نہیں عورت تھی۔ اس کا پورا جسم کچڑ میں لپٹا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی چکنی مٹی کی موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں صاف تھیں۔ سر کے بال بھی مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اور یہ مٹی خشک ہو گئی تھی، شاید وہ کسی دلدل میں گر پڑی تھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا یا پھر ممکن ہے کہ اسے دلدل میں ڈبو کر باہر نکالا گیا ہو اس کی ٹانگوں سے بھی مٹی لپٹی ہوئی تھی لیکن اس مٹی سے ابلتا ہوا خون صاف دیکھا جا سکتا تھا یقینی طور پر اس کی ٹانگیں شدید زخمی کر دی گئی تھیں۔ میں نے قاسم خان سے کہا۔

”قاسم خان قرب و جوار میں دیکھ اور کوئی زخمی تو نہیں ہے۔“ قاسم خان نے گردن ہلائی اور اپنے گھوڑے کو چاروں طرف دوڑانے لگا، اوہ ادھر ادھر گھوڑے کو دوڑا رہا تھا کہ اچانک ہی زمین پر پڑی ہوئی لڑکی نے کروٹ بدلی اور اچانک ہی اس نے ٹھہر کر فائز کر دیئے، میں نے بمشکل تمام اس کے فائزوں سے اپنے آپ کو بچایا تھا اور پھر میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بے وقوف کی بیٹی، ہم تیری مدد کر رہے ہیں اور تو ہم پر ہی فائزنگ کر رہی ہے ایک بار پھر مجھے اچھل کر ایک طرف ہٹنا پڑا اور پھر اس کے بعد کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اس کے ہاتھ سے بندوق نکال لوں۔ چنانچہ میں نے اچھل کر اس کے ہاتھوں پر ٹوکرماری اور بندوق اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑی، لڑکی کافی تنومند تھی، لمبے لمبا بھرے بھرے بدن کا مالک، لیکن میں نے اچھلنا ہوا چھوڑ دیا، خوفناک لگا۔

رخ بدل دیا تھا۔ قاسم خان بھی سمجھ کر میری جانب لپکا لیکن دوسری جانب ایک آدمی نہیں تھا بلکہ ان کی تعداد کافی تھی۔ انہوں نے پہاڑی چٹانوں پر سے پتھروں کی آڑ لے کر گولیاں برسائی شروع کر دیں۔ اور ہمارے لئے گھوڑوں کی پشتوں پر بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا۔ لیکن اس وقت ہم نہایت مہارت سے شہ سواری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بار بار ہمیں گھوڑوں کی پشتوں پر جھکنا پڑتا۔ اور پھر سیدھے ہو کر ایسی چٹانوں کی آڑ تلاش کرنے لگتے جو فی الحال ان گولیوں سے محفوظ کر لیں۔ خاصا فاصلہ طے ہو گیا۔ گولیاں چلانے والوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ اتنا فائز کرنے کے بعد تو وہ ہم کیا ہمارے گھوڑوں کو بھی ہلاک کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ان سے بچتے رہے تھے۔ البتہ تھوڑے فاصلے پر اب ہمیں ایک ایسی چٹان نظر آ رہی تھی۔ جہاں ڈھلان بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہم یہاں پناہ لے سکتے تھے۔ یہاں صورت حال کچھ اور نظر آئی۔ ہم نے دیکھا کہ کوئی زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف بہت سے گھوڑے سوار نظر آ رہے ہیں۔ یہ گھوڑے سوار سندالی ہی تھے۔ خاص قسم کے لباس میں ملبوس۔ جس شخص کے گرد وہ کھڑے تھے وہ پتہ نہیں کون تھا۔ یہ بات بھی ذرا تعجب خیز تھی کہ انہوں نے سندالیوں کے لباس میں ہونے کے باوجود ہم پر گولیاں چلائی تھیں۔ بہر حال ان لوگوں نے ہمیں دیکھا۔ اور پھر اچانک ان لوگوں نے بھی ہم پر فائزنگ شروع کر دی۔ بڑی عجیب بات تھی اور کیا یہ لوگ سندالی نہیں ہیں۔ اگر سندالی ہیں تو کیا کسی مختلف گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہماری طرف ہونے والی فائزنگ آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس لئے مجبوری تھی کہ اب ہم بھی اپنی بندوقیں اتار لیں۔ چنانچہ مجھ سے پہلے قاسم خان نے گولی چلائی تھی اور انتہائی کامیاب نشانہ لگایا تھا۔ بلند چٹان پر سے ہمارا نشانہ لگانے والا شخص اوندھے منہ نیچے آ رہا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ جو شخص زمین پر پڑا ہوا تھا اس کے قریب ہی اوپر سے گرنے والا نیچے آیا تھا۔ اچانک ہی زمین پر پڑے ہوئے شخص نے اس زخمی شخص پر جھپٹا مارا۔ اور پھر دو فائز ہوئے۔ اور زخمی شخص جو قاسم خان کی گولی سے زخمی ہوا تھا اچھل کر دور جا گرا۔ یہ فائز یقینی نیچے کھڑے شخص نے کئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے اس کی طرف رائفوں کے رخ کر لئے۔ مجبوری تھی۔ چنانچہ ہم دونوں نے گولیاں برسائی شروع کر

تھا، صرف آنکھیں تھیں جو مٹی سے محفوظ تھیں، ورنہ مٹی میں اس کے تمام خد و خل چھپے ہوئے تھے۔

”اور کوئی زندہ نہیں ہے البتہ چند لاشیں پڑی ہوئی ہیں مگر یہ صاحبِ زادی حراز معلوم ہوتی ہیں۔“ قاسم خان نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اب کیا کیا جائے؟“

”اب تم سے کچھ کموں گا تو برا مان جاؤ گے۔“

”برا ماننے والی کوئی بات کسی تو صرف برا ہی نہیں مانوں گا بلکہ تیرے جبرے بھی توڑ دوں گا قاسم خان یہاں آ کر تو خاصا بگڑ گیا ہے۔“

”یار تو خود سوچ یہ بھی کوئی زندگی ہے نجانے ماضی کے کون سے دور میں بھٹک رہے ہیں مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہماری داستان ماضی میں ہی ختم ہو جائے گی۔“

”اصل میں میں نے ان تمام چیزوں پر کبھی غور نہیں کیا لیکن اب مجھے موقع ملا ہے تو میں ان باتوں پر غور کر رہا ہوں، یہ وادی سحر ہے، مانتا ہوں اس بات کو، لیکن ہم ماضی میں ختم نہیں ہو سکتے۔“

”کیوں...؟“

”اس لئے کہ ماضی پیچھے ہے اور ہم حال کے لوگ ہیں، ہمارا نقصان جو کچھ بھی ہو

گا، حال ہی میں جا کر ہو گا۔“

”اب ماضی، حال، مستقبل میں ان تمام باتوں کو نہیں سمجھتا، اوہو دیکھو، غالباً اس کی ٹانگیں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔“ قاسم خان نے کہا۔

میں پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی پر نقاہت طاری ہو چکی ہے اب ہمارے پاس اس طرح کے انتظامات تو تھے نہیں کہ اس کی ٹانگوں کی مرہم بنی کریں جو کچھ فوری طور پر ہو سکتا تھا وہ کر دیا لڑکی نے عجیب سی نگاہوں سے پانی کے

اس برتن کی جانب دیکھا جو شاید مرنے والوں میں سے کسی ایک کا تھا اور میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر پانی کا وہ برتن اٹھالیا، لڑکی نے بے اختیار دونوں ہاتھ پھیلائے اور میں نے پانی کا برتن اس کے ہاتھوں میں دے دیا اس نے دانتوں سے اس خاص قسم کی

چمڑے کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور پھر وہ بوتل منہ سے لگالی، سارا پانی پینے کے بعد ایک

دم اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، ہم اسے دیکھ رہے تھے، میں نے قاسم خان سے کہا۔

”یہاں کیا ہنگامہ آرائی ہوئی ہے؟“

”ان پانچوں لاشوں میں سے ایک بھی یہ بات بتانے کے لئے تیار نہیں ہے، ویسے میرا خیال ہے، یہ بھی مر گئی۔“

”نہیں یہ زندہ ہے۔“

”کیسے پتہ ہے؟“

”غور سے دیکھو۔“

”گویا تم اسے غور سے دیکھ رہے ہو۔“

”اس وقت میں بالکل مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”مرنے والوں کی تعداد پانچ یا چھ ہے۔“ قاسم خان نے کہا۔

”اب یہ بتاؤ کہ کیا کیا جائے، یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کے لباس کی پٹیاں پھاڑ کر اس کے ان زخموں پر کسی جائیں۔“

”چلو ٹھیک ہے اب یہ کام تم سرانجام دو۔“

”بت چونکہ ایک لڑکی کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ہر لڑکی کی زندگی بچانا

ہر مرد کا کام ہے، چنانچہ یہ کام میں سرانجام دوں گا۔“ پھر قاسم خان نے دانتوں سے لڑکی کے کپڑے پھاڑنے شروع کر دیئے، وہ لڑکی کے قریب پہنچ گیا تھا اور ابھی اس نے

لڑکی کے لباس سے منہ ہٹایا بھی نہیں تھا کہ لڑکی سانپ کی طرح ہلٹی اور اس نے پوری قوت سے قاسم خان کے سینے پر لات ماری، قاسم خان اچھا خاصا طاقتور آدمی تھا، وہ کئی

نرم پیچھے ہٹ گیا پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہر لڑکی ہر مرد کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے۔ او صورت حرام میں

نئی مدد کر رہا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا تو لڑکی وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی ال بار اس نے ایک الٹی قلابازی کھائی اور پھر ڈھپ سے زمین پر جاگری، بہتا ہوا خون

گہریں بہتا ہوا دور تک پھیل گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”اس کی کینٹی پر رکھ کر ایک گولی داغ دو، ورنہ اس کے دشمن نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔“ میں نے چونک کر قاسم خان کو دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ مار دی، تب میں نے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو، اس کی موت اس کی زندگی سے زیادہ پرسکون ہو گی۔“ قاسم خان نے کندھے سے رائفل اتاری تو لڑکی بے اختیار چیخ پڑی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے کیا، میں زندہ ہوں، ہوش و حواس میں ہوں، گلتا ہے تم اپنے ہوش و حواس کو بیٹھے ہو۔“

قاسم خان کے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا تھا۔

”دیکھا تم نے، اتنی دیر سے ہم کوشش کر رہے تھے یہ زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹ رہی تھی۔ یہ ہوتی ہے ترکیب نمبر ایک سو گیارہ (111) تو اے بولنے والی لڑکی اب تو بتا کہ ہم تیرے لئے کیا کریں، تیرے دشمن اگر واپس آ گئے تو تیرا حساب کتاب کر دیں گے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہو گا، وہ دیر سے یہ کوشش کر رہے تھے اور اس میں ناکام رہے ہیں۔“

”مگر تو.....؟“

”دیکھو تم یہاں سے چلے جاؤ تمہارا بہت بہت شکریہ، اسلحہ موجود ہے، اصل میں بڑے پاس اسلحہ ختم ہو گیا تھا، میرا مطلب ہے گولیاں، ورنہ جب تک میرے پاس گولیاں تھیں، میں نے انہیں اپنے قریب نہیں آنے دیا وہ تین دن سے میرا تعاقب کر رہے ہیں اور تین دن کے بعد اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”چلو تسلیم کر لیا لیکن اب تمہاری ٹانگیں بے کار ہو چکی ہیں ان کے بغیر تم کیا کر سکتے ہو؟“ لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

”میرا گھوڑا بھی مر چکا ہے کیا تم یہ دو رائفلیں اٹھا کر مجھے دے سکتے ہو، وہ جو لئے پڑی ہوئی ہیں۔“

میری نگاہیں ان رائفلوں کی جانب اٹھ گئیں یہ مرنے والوں کی رائفلیں تھیں جو لڑکیوں کا شکار ہوئے تھے، میں نے قاسم خان کو اشارہ کیا اور قاسم خان نے آگے

”یہ جنگل کی بلی ہے تمہارے ہاتھوں پٹیاں نہیں بنوائے گی۔ اسے یہ پٹیاں دو دو، ہو سکتا ہے یہ خود استعمال کر لے۔“

”ہوں پاک باز، صورت حرام کہیں کی۔“ قاسم خان نے پیوں کا ڈھیر لڑکی کے سامنے لگا دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا، تب لڑکی کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ایک پٹی اٹھائی اور تھوڑی سی پیچھے کھمک کر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی پھر اس نے اپنے زخم پر یہ پٹیاں باندھنا شروع کر دی تھیں، بہت دیر تک وہ یہ کام کرتی رہی، ہر آہٹ پر وہ وحشت زدہ ہرنی کی مانند چونک کر دیکھنے لگتی تھی، بہر حال ہم لوگ اس کے بارے میں اندازہ لگانے لگے، لڑکی کے نقوش بتاتے تھے کہ وہ بھی سندالی ہے لیکن اب بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے ہر اس شخص کو سندالی سمجھ لیا تھا جس کے نقوش تھوڑے بہت جاذب نگاہ تھے یا یہاں کے مقامی باشندوں سے مختلف ہو سکتا ہے کہ یہاں سندالیوں جیسی شکلوں کا کوئی اور بھی قبیلہ آباد ہو ہم بلاوجہ ہر ایک کو سندالی سمجھ رہے ہیں، لڑکی نے اپنے زخموں پر پٹیاں لپیٹ لیں، خون ان پیوں پر بھی آ گیا تھا لیکن اب زیادہ خون بہنے کا امکان نہیں تھا، لڑکی اب بھی کافی چاک و چوبند نظر آ رہی تھی، اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بہت طاقتور ہے اور پوری طرح ہوش و حواس میں ہے پھر میں نے کہا۔

”اب بتاؤ اس کا کیا کریں۔ یہاں پڑی پڑی تو یہ مرجائے گی اور یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کے دشمن کتنے فاصلے پر ہوں۔“

”مگر یہ گوئی اور بہری ہے ابھی تک اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا، ہم کیسے اس سے معلوم کریں۔“

”دونوں ٹانگیں زخمی ہیں اس کی، کیا خیال ہے اسے ساتھ لے چلیں؟“

”لڑکی کیا تو بولنا جانتی ہے اگر بولنا جانتی ہے تو ہماری باتوں کا جواب دے۔“

لیکن لڑکی نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا، قاسم خان نے

”میرا خیال ہے اس وقت اس کے ساتھ ہم صرف ایک احسان کر سکتے ہیں۔“

نہی کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوشش ضرور کر رہی ہے لیکن اس کی آنکھیں بار بار اس انداز میں مڑ جاتی تھیں جیسے وہ اپنی غشی کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے، قاسم خان نے گھوڑا لے جا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا اور پھر دو سراجیت انگیز منظر اسکی نگاہوں کے سامنے آ گیا، وہ رانفلوں کے بل پر اچھلی تھی اور ایک ماہر سوار کی طرح گھوڑے کی پشت پر جا بیٹھی تھی پھر اس نے ایک رانفل بلند کر کے ایک فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

”ابے، ابے، ابے۔“ قاسم خان کے منہ سے بے اختیار نکلا اس نے اپنی رانفل بدھ کر لی، لیکن میں نے اس کی رانفل پکڑ کر اسے اونچا کر دیا۔

”کیا احق پن کر رہے ہو؟“

”وہ سچ گچ گھوڑا لے گئی۔“

”تو پھر؟“

”تمہاری عقل ختم ہو گئی ہے کیا، ہم کیا کریں گے آخر؟“

”عقل تمہاری ختم ہو گئی ہے قاسم خان، پہاڑوں پر پانچ گھوڑے بٹک رہے ہیں ان مرنے والوں کے گھوڑے، ان میں سے کوئی گھوڑا ہمارے کام آ سکتا ہے، ان کا اسلحہ بھی موجود ہے۔“

”اوہ واقعی؟“ قاسم خان نے کہا۔

”لو تم میرا گھوڑا پکڑو، میں اپنے لئے گھوڑوں کا بندوبست کرتا ہوں، پھر میں نے کافی آگے جا کر ایک خوبصورت گھوڑا اپنے قبضے میں کیا تھا واپس پہنچا تو قاسم خان ان لوگوں کا اسلحہ اور کھانے پینے کی اشیاء بھی اکٹھی کر چکا تھا میں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کے بعد ہم دونوں چل پڑے۔ قاسم خان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے، کافی فاصلے تک وہ منہ سے آواز بھی نہیں نکال سکا، لیکن پھر یہ خاموشی طویل ترین ہو گئی تو اس نے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی نے ہماری کھوپڑیاں گھما کر رکھ دی ہیں، نجانے کون تمہی؟ کس مصیبت کا شکار ہوئی تھی ویسے جو کوئی بھی تھی حیرت انگیز تھی، دونوں ٹانگیں ٹالہ ہونے کے باوجود یوں لگتا تھا کہ جیسے ان ٹانگوں کا تعلق اس کے وجود سے نہ ہو“

بڑھ کر وہ دونوں رانفلیں اٹھائیں پھر انہیں لڑکی کے پاس رکھ کر بولا۔

”اب بولو۔“ لڑکی نے دونوں رانفلیں دونوں ہاتھوں میں پکڑیں اور اس کے بعد پھر میں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا، رانفلوں کو بیساکھی کی طرح بظلوں کے نیچے دبا کر وہ پھرتی سے کھڑی ہو گئی تھی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

”میں ان کے سارے چلی جاؤں گی ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔“ اس نے واقعی رانفلوں کے سارے سے کئی قدم آگے بڑھائے اور ہم دونوں حیران رہ گئے، بہر حال مجھے فیصلہ کرنا تھا، میں نے کہا۔

”سنو ہمارے گھوڑوں میں سے تم ایک گھوڑا لے جاؤ اور جہاں دل چاہے لے جاؤ، ہم تمہاری زندگی چاہتے ہیں۔“ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”نہیں میں اپنی مدد خود کروں گی، تمہارا شکریہ ادا کر چکی ہوں۔“

”نہیں کر پاؤ گی، زخموں سے بہہ جانے والا خون آخر کار تمہیں بے ہوش کر دے گا۔“

”مگر میں نے کہہ دیا ہے تم سے، تم میرے لئے جو کچھ کر چکے ہو اگر وقت نے اجازت دی تو میں تمہیں اس کا صلہ ادا کر دوں گی، بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی اور نہ ہی تم مجھے مجبور کر سکو گے۔“

”ہم تمہیں مجبور کر سکتے ہیں لیکن اب تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتے ہم، کیونکہ ہم تمہارے دوست ہیں دشمن نہیں۔“

”تم نے مجھے گھوڑا دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

”ہاں۔“

”تو لاؤ مجھے ایک گھوڑا دے دو۔“

”تم اس پر سوار ہو جاؤ گی؟“

”دے کر دیکھو۔“

”قاسم خان! یہ بہت زیادہ بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہے میرا خیال ہے اسے گھوڑا دے دو۔“

قاسم خان نے تفریحاً ایسا کہا تھا لڑکی کی جو کیفیت ہم دیکھ چکے تھے وہ صاف بتاتی

نہ اسے اپنے زخموں کی پروا تھی، کمال ہے واقعی کمال ہے۔“ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

راستے طے ہوتے رہے پہاڑ، ریتلے میدان، گھوڑوں کے قدموں تلے آتے رہے پھر بہت دور سے ہم نے ایک پہاڑی سلسلہ دیکھا، ایک عظیم الشان پہاڑی سلسلہ جس کے درمیان ایک دراڑ بنی ہوئی تھی، بالکل ایسا لگتا تھا کہ جیسے پہاڑ کو چوٹی سے لے کر زمین تک درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو، اگر یہ پہاڑی انسانی ہاتھوں کی تراش ہے تو ایک ناقابل تصور چیز ہے بہر حال ہم وہاں سے تھوڑے سے آگے بڑھے تو ہمیں پتھروں ہی سے بنی ہوئی وہ عمارت نظر آئی، جسے عمارت نہیں کہا جاسکتا تھا ایک عجیب و غریب سی جگہ تھی ہم رک گئے، قاسم خان نے کہا۔

”تم نے دیکھا شہباز۔۔۔۔۔“

“ہاں۔۔۔۔۔”

”اس کا مطلب ہے یہاں انسان موجود ہوں گے۔“

”امکانات تو ہیں۔“

”مگر جگہ کونسی ہے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”آؤ دیکھیں۔“ ہم لوگ بڑی احتیاط سے وہاں پہنچ گئے اور پھر ہم نے پتھروں کی اس عمارت کو غور سے دیکھا، خانقاہ کی سی کیفیت تھی لیکن ویران خانقاہ میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا ہم لوگ عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے یہاں اس قدر سردی تھی کہ بدن پر کپکپاہٹ کا سا احساس ہوا، جبکہ باہر کا موسم خاصا شدید تھا یہ عمارت کی ایک حیرت ناک شکل تھی ہم اسے اندر سے دیکھتے رہے اور اس کے بعد باہر نکل آئے، قاسم خان نے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ اس عمارت کو دنیا کی پر اسرار ترین عمارت کہا جاسکتا ہے۔“

”دنیا کی یہ اسرار چیزیں تو یہاں اور بھی بہت سی نظر آئی ہیں، کیا تم وادی سحر میں

کسی چیز کو معمولی سی چیز کہہ سکتے ہو۔“

”نہیں“ یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا

کریں، وہ دیکھو ادھر دیکھو، میں عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ چکا تھا اور ادھر جو میں نے دیکھا تو مجھے ایک بہت خوبصورت جھیل نظر آئی، بہت زیادہ وسعتوں میں نہیں پھیلی ہوئی تھی لیکن اس قدر حسین تھی کہ زبان سے ادا نہیں کیا جاسکتا اس کے کنارے بہت سے درخت نظر آ رہے تھے اور قریب ہی پھول موجود تھے، درختوں میں پھل لٹکے ہوئے تھے یہ بات ناقابل یقین تھی، قاسم خان کہنے لگا۔

”دیکھو دوست آج تک میں تمہاری تمام باتیں ماننا چلا آیا ہوں، اس وقت تمہیں مہری ایک بات ماننا ہو گی۔“

”بولو کیا؟“

”یہاں کم از کم ہم ایک ہفتہ قیام کریں گے اتنا تھک چکا ہوں میں کہ زندگی سے ہزار ہو گیا ہوں۔“

”تمہاری مرضی ہے جیسے دل چاہے کرو۔“

”واقعی صورت حال بڑی سنگین ہے اس وقت اگر ہم نے اپنے جسموں کو سکون

نہیں دیا تو ہم خود بھی بیمار پڑ جائیں گے۔“

”میں نہیں چاہتا کہ تم بیمار پڑو۔“

”تو پھر قیام کے لئے یہ عمارت جو باقاعدہ ایک ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کی حیثیت رکھتی ہے، غسل کے لئے یہ جھیل اور خوراک کے لئے اس کے کنارے آگے ہوئے درخت اور کیا چاہئے۔“ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ ان ساری چیزوں کو دیکھنے کے باوجود ایک خیال دل سے نہیں نکلتا تھا وہ یہ کہ یہ سارا سلسلہ جادو کا ہے اور ہم جدید دنیا سے جادو کے ذریعے اس سحر زدہ سرزمین تک آئے ہیں اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی لیکن سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہم کیا کریں، بہر حال خانقاہ کے ارد گرد کا ماحول اتنا خوبصورت تھا کہ ہم نے یہاں ہر قیمت پر قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ درختوں سے پھل توڑ کر کھائے، جھیل میں نہائے، قرب و جوار میں ابھی تک کسی کی موجودگی کا کوئی شبہ تک نہیں ہو سکا تھا، یہ اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ اُس پاس کوئی آبادی ہے بھی یا نہیں، تقریباً کسی گھنٹے نہانے کے بعد ہم واپس خانقاہ میں پہنچے، خانقاہ کی ٹھنڈک ایک عجیب و غریب کیفیت رکھتی تھی، ہم جب خانقاہ میں داخل

اپنے گھٹنوں میں جھکا لیا تھا اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ قاسم خان دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میں تم سے بڑی بی بی یہ سوراخ کے وہ سری طرف کیا ہے اور یہ روشنی کیسی ہے؟“ لیکن بوڑھی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے قاسم خان سے کہا۔

”اس نے ہمارا یہاں آنا ناپسند کیا ہے اس لئے تم اسے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ وہ ہمیں ہماری کسی بات کا جواب نہیں دے گی۔“ قاسم خان نے بوڑھی سے کئی سوالات کئے لیکن بوڑھی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا چنانچہ وہ بھی خاموش ہو گئی۔ بوڑھی اسی طرح ساکت پڑی رہی تھی خانقاہ میں قیام کرنے کے بجائے ہمیں باہر کا منظر زیادہ حسین معلوم ہوا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں اندر اس عمارت میں سردی ہے نہ تھی جبکہ باہر کا موسم نہایت خوشگوار تھا قاسم خان نے کہا۔

”کیا خیال ہے شہباز میرا خیال تو یہ ہے کہ اندر کی بجائے ہم باہر زیادہ پرسکون رہیں گے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ قاسم خان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی باہر آ کر وہ جھیل کے کنارے بیٹھ گیا پھر اس نے کہا۔

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔“

”کیا؟“

”وہ بوڑھی عورت نہیں ہے۔“

”کون؟“

”وہ جس کے پاس سے ہم آرہے ہیں۔“

”خانقاہ کے اندر۔“

”ہاں۔“

”تو پھر کون ہے وہ؟“

”کوئی جوان لڑکی۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تمہاری کھوپڑی خراب ہو گئی ہے۔“

ہوئے اور ہم نے اس کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، خانقاہ میں ایک گول سا سوراخ بنا ہوا تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا، اور پتھر کی چٹان میں خود بخود پیدا ہو گیا تھا لیکن پہلے ہم جس وقت یہاں آئے تھے تو یہ سوراخ تاریک پڑا ہوا تھا اب اس سوراخ میں مدھم مدھم روشنی تھی اس کا مطلب ہے کہ کوئی سوراخ کے دوسری طرف موجود ہے لیکن دوسری طرف جانے کا راستہ کس طرف موجود ہے یہ بات حیران کن تھی میں ادھر دیکھتا رہا، قاسم خان بھی اسی جانب متوجہ تھا پھر اچانک خانقاہ کے دروازے میں یعنی اس طرف سے جس طرف سے ہم داخل ہوئے تھے کسی سائے کا احساس ہوا اور ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے پھر روٹنگے کھڑے ہو گئے تھے، سیاہ کفن نمالباس میں ملبوس ایک بد شکل بوڑھی عورت وہاں کھڑی ہوئی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بدن میں رعشہ تھا اور اس کی گردن اس طرح ہل رہی تھی جیسے وہ اسے جان بوجھ کر ہلا رہی ہو، پھر اس کی کھرکراتی آواز ابھری۔

”دیوتلوں کے گھر میں تمہاری آمد کیا معنی رکھتی ہے یہاں صدیوں سے عبادت ختم ہو گئی ہے اور اب یہ ایک ویران مسکن ہے یہاں ایسا نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے دور چلے جاؤ۔ عورت کی آواز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی، ایک پراسرار کیفیت جو ایک لمحے میں سمجھ میں نہیں آتی تھی ہم دونوں اسے دیکھتے رہے پھر ہم نے کہا۔

”بزرگ خاتون ہم تمہارے پاس کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں“ یہ جگہ عام لوگوں کے لئے نہیں ہے تم جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ جوان سندالی جاؤ یہاں سے چلے جاؤ یہاں تمہارا رکنا تمہارے لئے خطرے کا نشان ہو سکتا ہے رات کی تاریکیوں میں یہاں جو آتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہوتے تمہارے لئے مشکل ہی مشکل ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو ہم مشکلات کو قابو میں کرنا جانتے ہیں۔“ قاسم خان نے کہا اور بوڑھی اسے گھورنے لگی پھر بولی۔

”تمہاری مرضی میں نے تمہیں ہوشیار کر دیا اب بیکار ہے۔ ہنو تھوڑا سا راستہ دو سمجھے۔“ وہ لرزتے قدموں سے اندر آ گئی اور قاسم خان اسے غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے بوڑھی کو ایک گوشے میں جاتے دیکھا وہ دوڑا نو بیٹھ گئی تھی اور پھر اس نے اپنا سر

”نہیں تمہاری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔“

”تم نے اسے غور سے دیکھا تھا۔“

”سو فی صدی۔“

”میں نے غور نہیں کیا۔ لیکن وہ۔۔۔۔۔“

”اس نے بوڑھی عورت کا میک اپ کیا ہوا ہے۔“

”زیادہ ماڈرن بننے کی کوشش مت کرو یہاں میک اپ کیسے کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن اس نے میک اپ کیا ہوا ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔“

”مان لو گے۔ میں جب صورت حال بتاؤں گا تو مان لو گے۔“

”کیا صورت حال بتاؤ گے۔“

”سنو اب بھی اگر تم پلٹ کر دیکھو تو یا تو خانقاہ میں کسی پتھر کے سوراخ سے یا

دروازے سے گردن نکال کر وہ ہمیں دیکھ رہی ہو گی۔“

”بہت زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“

”اچانک پلٹ کر دیکھ لو۔“ اس نے کہا۔ اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ درحقیقت

ایک سایہ سا دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے حیرت سے قاسم خان کو دیکھا اور بولا۔

”قاسم خان کیا واقعی؟“

”یار کہہ رہا ہوں کبھی کبھی قاسم خان کی بات بھی مان لیا کرو۔“

”مگر کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟“

”ہے۔ اب اس کے لئے ایک اور تجربہ چاہو تو کر سکتے ہو۔“

”کیا؟“

”گھوڑوں پر بیٹھو اور یہاں سے نکل چلو۔ اتنا فاصلہ طے کریں گی ہم کہ اس کی

نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔ گھوڑے کسی جنگل کے درخت سے باندھو۔ واپس آکر

اسے دیکھو میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔“ نبھانے کیوں مجھے قاسم خان کی یہ بات

دلچسپ محسوس ہوئی تھی میں نے کہا۔

”اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں۔ چنانچہ اس منصوبے کے تحت ہم خانقاہ کے دروازے پر آ گئے اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے، جیسے یہاں سے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہوں، اس وقت یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ رہی ہے، لیکن بہر حال ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل پڑے۔ قاسم خان کی بات نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ لیکن بہر حال وہ احمق نہیں تھا۔ کئی بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ ہم نے خاصا فاصلہ طے کر لیا۔ پھر میں نے کہا۔

”اب گھوڑے روکو گے یا نہیں۔ واپس خانقاہ بھی جانا ہے۔“

”ہاں یہ ٹھیک جگہ ہے۔ یہاں گھوڑے باندھ دو۔“

”اچھا خاصا پیدل مارچ کراؤ گے۔ چلو اب واپس چلیں۔“ اس نے کہا اور ہم چھپتے چھپتے وہاں سے واپس خانقاہ کی طرف چل پڑے۔



”خیر ایسا نہ کہو، مذہب سے دور تو نہیں ہوا ہوں میں، کیا سمجھے۔“

میں خاموش ہو گیا میرے ذہن میں بڑا تجسس تھا اور میں بھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی وہ عورت بوڑھی ہے یا نہیں، طویل فاصلہ طے کرتے ہوئے ہم لوگوں کو وقف آ گیا تھا پھر کچھ دیر کے بعد ہم چھپتے چھپاتے خانقاہ پہنچ گئے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر اسرار خانقاہ میں داخل ہوئے، خانقاہ میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور کسی انسان کا پتہ نہیں تھا اب تو ہمیں اور بھی حیرت ہوئی پھر میں نے اور قاسم خان نے خانقاہ کا چپا یا چھان لرا، لیکن پر اسرار اور ویران خانقاہ میں واقعی کوئی موجود نہیں تھا، میں نے دانت پیستے ہوئے قاسم خان کو دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ سامنے کرتا ہوا بولا۔

”خدا کی قسم یار میں، بس اب تو میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔“
 ”لیکن، میرے پاس بہت کچھ ہے۔“ میں نے بدستور، جھٹلائے ہوئے انداز میں کہا اور قاسم خان ہنسنے لگا پھر بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ یہاں سے بھاگ گئی؟“

”میرا کوئی خیال نہیں ہے صرف ایک خیال ہے جس کی تکمیل تجھے کرنی ہے۔“
 ”ہاں بولو، بولو، میں وعدہ کرتا ہوں تم جو کچھ کہو گے وہ کروں گا، یار بس کیا بتاؤں یہ اپنی دنیا تو تھی ہی شاطروں اور چال بازوں کی دنیا لیکن ان پر اسرار وادیوں میں بھی یہ سب کچھ ہوتا ہے جن کی تاریخ کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ خیر تم کہو، میں اپنی اس مملکت کا کیا کفارہ ادا کر سکتا ہوں۔“
 ”جاؤ دونوں گھوڑے لے کر آؤ۔“

”ارے باپ رے، مر گیا۔“ قاسم خان کراہتا ہوا بولا۔

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں واپس ان گھوڑوں تک جاؤں اور انہیں سے کر آؤں گا تو اس خیال کو دل سے نکال دو، میں کبھی ایسا نہیں کروں گا اور اگر تم نے اس خانقاہ سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تو میں اس کی مخالف سمت اختیار کروں گا اور گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے جائیں گے۔“

”نہیں پیارے بھائی نہیں میں وقت سے پہلے نہیں مرنا چاہتا لیکن ایک بات میں بھی کہے دیتا ہوں تمہاری شرط میں مان رہا ہوں، جاتا ہوں اور گھوڑے لے کر آتا ہوں لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس خانقاہ میں، میں ذرا لمبا قیام کروں گا۔ میرے اندر

شدت جوش سے ہم بہت دور نکل آئے تھے واپسی کے سفر میں، میں نے دانت پیستے ہوئے قاسم خان سے کہا۔
 ”تیری کیفیت بھی بہت عجیب ہے قاسم خان!“
 ”کیوں؟“

”بس، جب حماقتوں کے موڈ میں ہوتا ہے تو ایک سے ایک اعلیٰ پائے کی حماقت کرتا ہے۔“

”لیکن شہباز، اپنی فطرت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“

”مطلب؟“

”تمہارے اندر ایک خاص خوبی ہے اگر میں کوئی ٹھیک کام کر لیتا ہوں تو تم میری تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہو اور کہیں کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہو گئی تو بس قاسم خان تم یہ ہو، تم وہ ہو۔“

”اول تو یار ہم اس منحوس پروفیسر کے چکر میں پڑ کر اپنی زندگی کے نجانے کتنے سال کھو بیٹھے ہیں، اب تو یوں لگتا ہے جیسے اسی وادی سحر میں پیدا ہوئے اور اسی کعبخت وادی میں مرجائیں گے۔ یقین کر بعض اوقات تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی زندگی میں ایک چھوٹی سی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملتی ہے۔“
 ”یہ تو آسمانوں کی تاریخ ہے دوست، زمین پر اگر دوہرا دی جائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔“

”مثلاً؟“

”ایک چھوٹی سی غلطی نے ہی شیطان کو شیطان بنا دیا ورنہ کیا عیش ہوں گے اس کے، لیکن بس آگیا اپنے ہی جال میں۔“
 مجھے ہنسی آگئی میں نے کہا۔
 ”تو مذہبی باتیں بھی کر سکتا ہے۔“

اب ان پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹکنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”چولے میں جاؤ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اور قاسم خان منہ بناتا ہوا وہاں سے چلا گیا، یہ سزا اس کے لئے بہت بہتر تھی۔ اپنے آپ کو بہت زیادہ ذہین ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اس نے، پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے سوچا کہ بات تو واقعی سنگین ہے، چلو ٹھیک ہے وہ بوڑھی عورت بقول قاسم خان کے جوان لڑکی بے شک نہیں تھی لیکن تھی تو سہی، اور اگر تھی تو کہاں گئی، دفعہ مجھے اس جھیل کا خیال آیا جو یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی اور میں نے دل میں سوچا کہ ممکن ہے بوڑھی جھیل کے پاس ہو، چنانچہ میں باہر نکل آیا اور قاسم خان کے بارے میں تو مجھے بہت اچھی طرح اندازہ تھا کہ ایک بار اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے دوبارہ فوراً ہی اتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا وہ بہت دیر میں جائے گا، یہ الگ بات ہے کہ وہاں سے گھوڑوں پر بیٹھ کر وہ جلدی واپس آجائے لیکن اس دوران میں جھیل کا جائزہ لے سکتا تھا۔ خوبصورت اور حسین جھیل دور دور دور تک بکھری ہوئی تھی اس کے کنارے درختوں کی بہتات تھی اور ان درختوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔ اچانک ہی نجانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوا جیسے اس پر اسرار جادوگری کا یہ حصہ بھی خاصا پر اسرار ہو، ورنہ یہاں ان درختوں کے پھلوں کا کیا قصہ ہے بہر حال جھیل کا یہ دلکش منظر بے حد حسین تھا ابھی دور دور تک قاسم خان کا کوئی پتہ نہیں تھا چنانچہ کافی دیر تک جھیل کے پاس گزار کر اور کچھ پھلوں کو سمیٹ کر میں واپس خانقاہ میں آ گیا اب اتنی بد اخلاقی تو نہیں کر سکتا تھا کہ قاسم خان کے بغیر پھلوں کو کھانا شروع کر دیتا، پھلوں کو ایک جگہ رکھ کر میں نے سوچا، کہ ایک بار پھر ذرا خانقاہ کا جائزہ لے لیا جائے اور اس بار میں اس کا جائزہ بڑی گہری نگاہوں سے لیتا رہا، پھر اچانک ہی میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا یہ وہ دونوں رانفلیں تھیں جو میں نے اس زخمی لڑکی کو دی تھیں اور وہ انہیں بے ساهیاں بنا کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر ہوا ہو گئی تھی، میں نے سو فیصدی پہچان لیا یہی وہ رانفلیں تھیں، میرے خدا!.... میرے خدا! میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ وہ لڑکی تھی یا چھلوا اور پھر ان رانفلوں کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

قاسم خان واپس آ گیا اور جس حال میں واپس آیا اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی

تھی، میں نے دور ہی سے اسے دیکھ لیا تھا ایک گھوڑے کی پشت پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ دوسرا گھوڑا اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا، رفتار اتنی ست تھی کہ گھوڑے پر بیٹھنے کے ضرورت نہیں تھی اگر انسان تھا ہوا نہ ہو، قریب آنے کے بعد بھی وہ گھوڑے سے نیچے نہیں اترا تھا، میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

”کیا مر گئے؟“

”مرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کامیابی کتنی دیر میں حاصل ہو جائے گی۔“

”یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔“

”گھوڑے کی پیٹھ پر مرو گے یا نیچے آ کر۔“

”مرنا تو نیچے آ کر چاہتا ہوں مگر اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

”ابھی ایک منٹ۔“ میں نے کہا اور اچانک ہی گھوڑے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا، تھپڑ رسید کرنا تھا کہ گھوڑا دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا اور قاسم خان بڑے اطمینان سے نیچے آ رہا، البتہ گھوڑے نے دولتی ماری تھی اور اس سے قاسم خان بچ گیا تھا پھر وہ پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور مجھے گھورنے لگا۔

”یہ کیا حرکت....“

”گھوڑے سے اتارنے کا ایک آسان نسخہ۔“ میں نے جواب دیا اور قاسم خان گردن ہلانے لگا، پھر بولا۔

”نہیں مروں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”کہا نا نہیں مروں گا۔“

”کیوں ارادہ ملتوی کر دیا کیا؟“

”ایسے نہیں مروں گا۔“

”تو پھر کیسے مرو گے؟“

”تم اگر چاہتے ہو کہ میں مرجاؤں تو تم خود سوچو کہ تم عقل سے پیدل ہو۔“

”مطلب؟“

”یہ ”وادی سحر“ ہے۔“

”ہاں ہے۔“

”اور ہم ماضی میں سفر کر رہے ہیں۔“

”کر رہے ہیں۔“

”تو کیا میں ماضی میں مرجاؤں گا۔“ اس نے کہا اور میں چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا، پھر دفعتاً ہی میرے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا۔

”یار قاسم خان تو بہت چالاک ہے۔“

”اور تم اتنا ہی احمق۔“

”اچھا، کو اس مت کرو، چلو گھوڑے باندھو۔“

”یہ کام بھی میں کروں۔“

”تو اور کیا میں کروں گا۔“

”دیکھو پہلے کام کی تو تم نے مجھے سزا دی تھی۔“

”ہاں تو پھر۔“

”اب میں وہ سزا پوری کر چکا ہوں۔“

”یہ آخری ٹکے ہے۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”ہوتا ہے۔“

”نہیں ہوتا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے چھوڑ دو کھلے گھوڑے۔“ میں نے کہا، اور قاسم خان غصیلے انداز

میں مجھے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

”خدا کی قسم کھاتا ہوں گھوڑے نہیں باندھوں گا، چاہے یہ بھاگ ہی کیوں نہ

جائیں۔ میرا کیا ہے میں راہب حق بن کر اس خانقاہ میں بیٹھ جاؤں گا اور تم مجھے نہیں

لے جا سکو گے۔“ اب ذرا کچھ زیادتی سی محسوس ہونے لگی تھی چنانچہ میں نے گھوڑوں

کو باندھا اور ہم دونوں اندر آ گئے، قاسم خان نے پھلوں کے انبار دیکھے تو خوش ہو کر

ان پر جھپٹا اور ٹھنڈی زمین پر لیٹ کر پھل کھانے لگا پھر بولا۔

”زندگی میں یہ لطف بھی حاصل ہو گا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ویسے بات

واقعی پر لطف ہے، مزہ آ رہا ہے کیا اس وقت، ویسے ایک بات بتاؤ، میں نے تو اچانک ہی

سوچا تھا، بات سمجھ میں آتی ہے اور سچی لگتی ہے۔“

”کونسی بات؟“

”ہم ماضی میں مرنے نہیں سکتے، ایک نیا تصور، نیا خیال تھا اور میں خود بھی اس بارے

میں سوچ رہا تھا واقعی اگر ہم ”داوی سحر“ میں سفر کر رہے ہیں تو موت تو ہمیں مستقبل

میں آئے گی یعنی اس وقت میں جب ہم اپنا عمل طے کر رہے ہوں گے، یہاں تو صرف

ایک دیدہ ور کی حیثیت رکھتے ہیں، اور تھوڑے سے باعمل بھی ہیں۔“

قاسم خان پھل کھتا رہا اور میں سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔

”قاسم خان ایک عجیب بات بتاؤں تمہیں؟“

”یہاں ساری باتیں ہی عجیب ہیں۔ اور کوئی عجیب بات ہے تو وہ بھی بتا دو۔“

”ایک گوشے میں مجھے وہ بندوقیں مل گئی ہیں۔“

”کونسی بندوقیں؟“

”وہی جو زخمی لڑکی لے کر آئی تھی۔“

”کیا؟“ قاسم خان اچھل کر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔“

”اوہ میرے خدا۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”ایک بات میں بھی تمہیں بتاؤں؟“

”چلو تم بھی بتا دو میں کب منع کر رہا ہوں۔“

”وہ زخمی لڑکی جو ہمیں ملی تھی نا۔“

”ہاں۔“

”اس کے دانے ہاتھ پر ایک تل تھا اور میں تمہیں سچ بتاؤں اس بوڑھی عورت پر

ٹٹے بھی شبہ ہوا تھا کہ وہ بوڑھی عورت نہیں ہے وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر ہوا

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت اور نوجوان ہاتھ تھے اس نے اپنا پورا

پہ بدل لیا تھا لیکن ہاتھوں پر تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی اور اب

ہللف بستر پر ہمیں نیند آگئی، گہری اور پرسکون نیند، پھر ہم سوتے رہے اور وقت گزرتا رہا جب جاگے تو رات ہو گئی تھی، خانقاہ میں اسی طرح مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ایک پراسرار ماحول محسوس ہو رہا تھا طبیعت پر ایک عجیب سا بوجھ سوار تھا پھل موجود تھے، پیٹ تو بھرا جا سکتا تھا اس کے علاوہ جھیل کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے جنگل میں جانور بھی مل سکتے تھے لیکن رات اتنی ہو گئی تھی کہ اب شکار کاموڈ نہیں تھا اچانک ہی پھر قاسم خان نے کہا۔

”شہباز“

”ہاں۔“

”چلو جھیل پر نہائیں گے۔“

”میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے۔“

”سینے اور تھکن نے بدن بوجھل کر دیئے ہیں، نہانے کے بعد طبیعت خوشگوار ہو جائے گی۔“

”چلو۔“ ہم نے باہر نکل کر گھوڑوں کو دیکھا اور پھر انکی لگائیں کھول دیں یہ سوچ کر کہ وہ بھی چر لیں گے وفادار جانور مالکوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے اس لئے ہمیں اس بات کی امید تھی کہ گھوڑے ہمیں چھوڑ کر بھاگیں گے نہیں بلکہ اپنی خوراک لے کر واپس یہیں آ جائیں گے، گھوڑے ہماری امید کے مطابق تھوڑے سے آگے گئے اور جنگل کی گھاس چرنے لگے، جبکہ ہم دونوں درختوں کے پاس پہنچ گئے اور وہاں اپنے لباس اتارنے لگے لیکن ابھی ٹھیک طریقے سے لباس اتارے بھی نہیں تھے کہ ہمیں گنگنائے کی آواز سنائی دی، یہ کسی لڑکی کے گنگنائے کی آواز تھی ہم دونوں چونک کر ایک دم سنبھل گئے اور پھر ہم نے جھانک کر جھیل کی طرف دیکھا، ستاروں کی مدہم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی بے شک چاند نہیں نکلا تھا لیکن ستاروں کی روشنی میں ہم دور دور تک کا منظر دیکھ سکتے تھے اور ہمیں جھیل میں ایک شعلہ لپکتا ہوا نظر آیا، یہ وہی حسین لڑکی تھی جو اب جھیل میں نہا رہی تھی اس کا راہباؤں کا لباس جھیل کے کنارے رکھا ہوا تھا، دفعتاً قاسم خان نے کہا۔

”دیکھا تم نے؟“

”یار بڑی شاطر لڑکی ہے۔“

مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان ہاتھوں پر ایک تل بھی تھا۔“

”ناممکن ہے۔“

”اب تم جو کچھ بھی کہو یا کچھ اور کہو لیکن میں اپنی بات سچ کہہ رہا ہوں۔“

”مگر وہ تو زخمی تھی۔“

”کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ زخمی نہ ہو۔۔۔ ویسے تمہیں ایک بات یاد ہے؟“

”کیا؟“

”جب وہ وہاں پڑی ہوئی تھی اور ایسے پڑی ہوئی تھی کہ جیسی مر گئی ہو تو ہم نے اسے گولی مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”ہاں۔“

”اور اس کے لئے تیار بھی ہو گئے تھے؟“

”بالکل۔“

”اور وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔“

”ہاں۔“

”جس طرح وہ اٹھ کر بیٹھی تھی اس سے کیا تم یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ زخمی تھی؟“

”میں نے اتنا غور نہیں کیا۔“

”مگر میں نے غور کیا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ زخمی نہیں تھی۔“

”بالکل یہی مطلب ہے میرا۔“

”اور یہ بھی مطلب ہے تمہارا کہ یہ وہی لڑکی تھی۔“

”سو فیصدی۔“

”خیر سو فیصدی تو مت کہو، کیونکہ آدمی! میں نے تمہارے بغیر پھل نہیں کھائے اور

تم مجھے پوچھے بغیر پھل کھاتے جا رہے ہو۔“

”ارے کیا واقعی۔“ قاسم خان نے شرمندگی سے کہا اور اس کے بعد ہم پھل

کھاتے رہے، پیڑوں میں وزن پہنچا تو بدن ڈھلنے لگے اور ہم خانقاہ کی ٹھنڈی زمین

لیٹ گئے، واقعی یہ زمین اس وقت پر لطف بستر محسوس ہو رہی تھی، اور نجانے کب اس

”بالکل۔“
 ”یہ ممکن نہیں ہے۔“
 ”کیوں؟“

”اس لئے کہ پہلے اس نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔“
 ”وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائے گی۔“
 ”تو میں اسے ناکام ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ بولا اور مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 ”قاسم خان! تو واقعی بہت بدل گیا ہے۔“
 ”یار کیا کروں۔ وہ ایرا اور ایلا تھیں۔ وہ بھی چھن گئیں۔ اب کوئی نہ کوئی تو مرکز نگاہ ہو۔ کیا یہ واقعی ایک پراسرار نہیں ہے۔“
 ”یہ لڑکی۔“

”ہاں۔ ویسے قاسم خان تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ یہ لڑکی ہو سکتی ہے جسے ہم نے سارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا تھا اور اس کے بعد وہ وہاں سے فرار ہو گئی تھی؟“
 ”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شکل و صورت سے تو وہ نہیں لگتی۔ لیکن بڑی شاطر اور چالاک ہے یہ۔ مجھے تو پہلے ہی اس پر شبہ ہو گیا تھا۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”لڑکی کی گنگناہٹیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر جب وہ جھیل سے باہر نکلی تو میں نے قاسم خان کا گریبان پکڑ کر اسے آگے کھینچ لیا۔ اب اس سے زیادہ بد اخلاقی کی اجازت میں اسے نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں وہاں سے تھوڑی دور ہٹ گئے۔ تاکہ لڑکی لباس پہن لے۔ یہ فیصلہ ہم نے دل میں کر لیا تھا کہ لباس پہننے کے بعد جب وہ یہاں سے جانے کی کوشش کرے گی تو ہم اسے مخاطب کریں گے اور اس سے کہیں گے کہ اس نے ہمیں دھوکہ دیا۔ ہم نے اتنا وقت صرف کیا۔ جتنے وقت میں وہ لباس تبدیل کر لے اور اس کے بعد جب واپس پلٹے تو لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اور قاسم خان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ تاہم نظر اس کا پتہ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے زمین نگل گئی ہو۔ قاسم خان پھٹی پھٹی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔“

”باپ رے باپ اب تو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ وہ چھلاہو ہے۔ اور اسے تلاش

”کیا خیال ہے ہم بھی اس کے ساتھ شطرنج کھیلیں؟“
 ”کیسے؟“

”میں اس کے کپڑے اٹھا کر لاتا ہوں۔“
 ”نہیں قاسم خان یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔“
 ”اوہ میرے پیارے بھائی صاحب! یہ تم اچانک اخلاقی کیسے ہو گئے؟“
 ”ہم ماضی میں سفر کر رہے ہیں جبکہ ہمارا اخلاق حال میں بلکہ اب تو یہ کہنا چاہئے کہ مستقبل میں خراب ہوا تھا۔ ماضی میں اس اخلاق کو خراب نہیں ہونا چاہئے۔“
 ”قاسم خان نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی پھر میں نے کہا۔“
 ”تو پھر؟“

”بس دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے۔“
 ”دیکھنا بد اخلاق نہیں ہے۔“ قاسم خان مجھے گھور کر بولا۔
 ”اوہ گدھے تو وہاں جائے گا اس کا لباس اٹھائے گا تو کیا تجھے وہ دیکھ نہیں لے گی اور پھر ہمیں تو یہ اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ ہے کیا شے؟“
 ”جو کچھ بھی ہے خدا کی قسم لا جواب ہے۔“ قاسم خان نے گنگناتے ہوئے کہا۔
 ”دوسری جانب لڑکی کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی نجانے کیوں مجھ پر اخلاقیات کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور میں اسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔“
 ”قاسم خان!“

”بولو۔“
 ”تیرا اخلاق کچھ زیادہ خراب نہیں ہو گیا۔“
 ”کیوں؟“

”ہم نے ہر طرح کی جرائم کئے لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔“
 ”اس سے پہلے ہم ایسی کسی کیفیت کا شکار بھی تو نہیں ہوئے۔“
 ”پھر بھی انسانیت کوئی چیز ہوتی ہے۔“
 ”تو میں کیا کر رہا ہوں۔“

”آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا ہے۔“
 ”آنکھیں بند کر لوں؟“

نوبی دیر کے بعد خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ہم نے خانقاہ کے گوشے گوشے کو چھان مارا تھا لیکن وہ بوڑھی نظر نہیں آئی تھی۔ جس کے بارے میں باہر جا کر قاسم خان نے کہا تھا کہ وہ بوڑھی نہیں بلکہ کوئی نوجوان لڑکی ہے۔ اور اس کا جواز یہی پیش کیا تھا۔ غرض یہ کہ اس بار بھی ہم خانقاہ میں داخل ہوئے اس بات کا ہم بخوبی اندازہ لگا چکے تھے کہ خانقاہ میں کونسی جگہ اندر داخل ہونے کے لئے ہے۔ ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جس سے کوئی باہر نکل کر جاسکے۔ سامنے کا دروازہ بند کر دیا جائے تو خانقاہ بند ہو جاتی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ اور پھر خانقاہ کے اندرونی کمرے میں پہنچے ہمارے ذہنوں کو شدید جھٹکا لگا۔ وہاں پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ کافی مقدار میں یہ خون بہہ چکا تھا۔ اور یوں لگا تھا جیسے ابھی ابھی کسی نے اسے چھرا مار کر قتل کیا ہو۔ تھوڑے فاصلے پر ایک خون آلود چھرا بھی پڑا ہوا تھا۔ کچھ اور قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ہماری آنکھیں حیرت سے پھل گئیں کہ یہ وہی لڑکی تھی جو تھوڑی دیر پہلے جھیل پر نہا رہی تھی۔ قاسم خان کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ برا ہوا۔“

”مگر اسے قتل کس نے کیا؟“

”پتہ نہیں۔“ قاسم خان کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں بھی بڑا افسوس کر رہا تھا۔ قاسم خان نے کہا۔

”کاش یہ ہمیں اپنے بارے میں بتا دیتی تو ہم اس کی مدد کرتے۔ بھلا ہمیں کیا پڑی تھی کہ اسے کوئی نقصان پہنچاتے۔“

”واقعی یار بڑا افسوس ہوا۔ یہ جان کر ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ.... کہ....“

”ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اچانک ہی میں نے چونک کر کہا۔“

”قاسم خان!“

”ہاں؟“

”اسے قتل کرنے والا بھی کوئی ہو گا۔“

”تم یقین کرو۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔“

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“

کرنا ممکن کام نہیں ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک مدم سی مسکراہٹ پھیل گئی میں نے کہا۔

”قاسم خان یہ بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“

”نہ وہ چھلاوہ ہے نہ اسے تلاش کرنا مشکل کام ہے۔“

”مگر کیسے؟“

”آؤ۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ کر جھیل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں لڑکی کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں میں نے جھک کر زمین کو دیکھا۔ لیکن یہاں ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔ جس سے لڑکی کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔ قاسم خان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا تو میں نے جھلا کر کہا۔

”کیوں۔ دانت کیوں پھاڑ رہے ہو۔“

”جناب جاسوسی فرما رہے تھے نا۔ آپ کا خیال تھا کہ آپ اس کے قدموں کے نشانات تلاش کر کے آگے بڑھ جائیں گے۔“

”ہاں میرا یہی خیال تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔“

”حضور والا۔ وہ بھی کوئی اونچی ہی چیز معلوم ہوتی ہے۔ آئیے ذرا آگے آئیے۔“

نشانات یہاں نہیں ہو سکتا ہے آگے مل جائیں۔“ پھر ہم دونوں آگے بڑھنے لگے۔ لیکن حقیقت میں مجھے اس وقت بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی کیونکہ کوئی ایک بھی نشان نہیں تھا۔ اور میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ میں نے کہا۔

”کم بخت پھر بے وقوف بنا گئی۔“

”ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں اور اب مزید جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ کیا سمجھے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ قاسم خان کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

”آؤ۔“

”کہاں؟“

”خانقاہ کی طرف۔“ میں نے قاسم خان سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ اس بات کے امکانات میرے ذہن میں تھے۔ کہ ممکن ہے لڑکی ہمیں دوبارہ خانقاہ میں ملے۔ چنانچہ ہم

”کچھ نہیں۔ میں اس لڑکی کے لئے دکھی ہوں۔ اب ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس لڑکی کو اسی خانقاہ میں جلا دیتے ہیں۔“

”کیا؟“ میں نے چونک کر قاسم خان سے پوچھا۔

”جلا دیتے ہیں اس لڑکی کو۔“

”مطلب کیا ہے یار؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔“ قاسم خان نے کہا اور اس کے بعد اس نے یہاں ایسی چیزیں جمع کرنا شروع کر دیں جو باآسانی جل سکتی تھیں۔ میں اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک قاسم خان ایسی چیزیں جمع کرتا رہا۔ ان چیزوں کو اس نے لڑکی کے گرد جمع کر دیا تھا۔ پھر واقعی اس نے ان چیزوں میں آگ لگا دی۔ شعلے آہستہ آہستہ تمام چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ قاسم خان میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ پھر وہ خانقاہ سے بھی باہر نکل آیا اور ہم خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ میں نے قاسم خان سے کہا۔

”میرا خیال ہے اب تم اس لڑکی کی جگہ لینے کی کوشش کر رہے ہو۔“ قاسم خان ہنس پڑا پھر بولا۔

”سمجھا نہیں۔“

”تم بھی اب پراسرار حرکتیں کر رہے ہو۔“

”یار ایک بات بتاؤں۔“

”ہاں بولو۔“

”تم بے حد طاقتور آدمی ہو۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”واقعی دل سے اعتراف کر رہا ہوں کہ تمہاری جسمانی قوتوں کا میں بالکل مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”لیکن تمہاری کھوپڑی میں کچھ نہیں ہے۔“

”آپ تو بہت ذہین آدمی ہیں۔“

”پہلے تمہیں اپنے آپ سے ذہین سمجھتا تھا۔ لیکن اب اپنے آپ کو تم سے زیادہ ذہین سمجھ رہا ہوں۔“

”اس بے وقوفی کی وجہ؟“

”وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لڑکی اب بھی زندہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”لڑکی اب بھی زندہ ہے۔ مطلب وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”اور وہ لاش؟“

”لڑکی ہی کی ہے۔ اور یہ لڑکی جانتے ہو کون ہے؟“

”جی نہیں میں نہیں جانتا۔“

”سو فیصدی وہی لڑکی ہے۔ جو ہمیں زخمی حالت میں ملی تھی۔ اور شاید اس وقت بھی اسے صرف گھوڑا درکار تھا۔ باقی اس نے ڈرامہ کیا تھا۔“

”قاسم خان۔ بہت زیادہ اونچا اڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”جو کچھ ہو گا۔ ابھی دیکھتے رہنا۔ وہ اس وقت بھی لاش نہیں تھی بلکہ اس کا زخم ایسا ہی تھا جیسے اس وقت ہم نے اسے اپناج لڑکی کی شکل میں دیکھا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی بڑی شاطرہ ہے۔ ابھی قاسم خان یہی جملہ ادا کرنے پایا تھا کہ خانقاہ کے دروازے سے کوئی باہر نکلا۔ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور باہر نکلنے والا ہمارے پاس پہنچ کر رک گیا تھا پھر اس کی آواز ابھری۔

”رب عظیم تمہیں غارت کرے۔“ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہی لڑکی تھی واقعی وہی لڑکی تھی۔ جو ہمیں پہلے زخمی حالت میں ملی تھی۔ کرپہ دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”تم نے خانقاہ کو آگ لگا دی۔ میرا ٹھکانہ جلا دیا تم نے۔“

”روحوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا ڈیر۔ تم تو ایک روح ہو۔ ایک بھگتی ہوئی آوارہ روح جو کہیں اور کسی بھی جگہ اپنے آپ کو منتقل کر سکتی ہے۔ تمہیں بھلا

ٹھکانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”جنگلی ہو جاؤں گا۔ کینے بھی ہو۔“

”جانتی ہو ان گالیوں کے جواب میں تمہارے ان گلابی رخساروں پر اتنے تھپڑ

لگائے جاسکتے ہیں کہ ان کا رنگ سرخ ہو جائے۔“
 ”ہاں ہاں مار لو نا مجھے۔ مارنے ہی کے شوقین ہوتا۔“

”تو پھر تم نے یہ تمام حرکتیں کیوں کی ہیں؟“
 ”تم نہیں جانتے۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں گی ضرور بتا دوں گی کیونکہ ہم میں سے
 نہیں ہو۔ تم بالکل الگ قسم کے لوگ ہو مگر چالاک اور ذہین۔“
 ”گڈ گڈ ویری گڈ۔ اب کیا پروگرام ہی۔ بے وقوف بنانے کی کوئی نئی کوشش۔“
 ”نہیں۔ سنو میں تم سے تعاون کرنا چاہتی ہوں۔ کیا سمجھے۔ کرو گے مجھ سے
 تعاون؟“

”پتہ نہیں تم تعاون کسے کہتی ہو؟“ قاسم خان بولا۔ لڑکی نے غرائی ہوئی آواز میں
 کہا۔
 ”آؤ میرے ساتھ۔“ ہم دونوں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئے تھے۔ خانقاہ کے
 دروازے سے شعلوں کی زبانیں باہر لپک رہی تھیں۔



لڑکی مجھ سے چند قدم آگے چل رہی تھی اور میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ دلکش
 بدن کی مالک تھی۔ حالانکہ جو لباس اس نے پہنا ہوا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا کہ جس سے
 اس کا بدن نمایاں ہو۔ لیکن ہوا کے آوارہ جھونکے جب اس کے لباس کو اس کے جسم
 سے چپکا دیتے تھے تو اس کے بدن کی لطافتیں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ
 وہ کوئی بات کرے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے کافی فاصلہ طے کر
 لیا اور یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جھیل کی مخالف سمت پہنچ گئی۔ یہاں بڑی بڑی
 گھوری چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ جن کے اطراف میں سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ یہ
 علاقہ تو بے شک بڑا ہی خوبصورت تھا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ رکے۔ پھر اپنے بارے
 میں بتائے۔ پھر اچانک اس نے پلٹ کر کہا۔

”میرا نام سلالیہ ہے۔“ پھر وہ ایک دم چونک پڑی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں
 دوڑاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا ساتھ کس لیے ہے۔“ اس کے ان الفاظ نے مجھے بھی چونکا دیا۔ میں نے
 پلٹ کر حیرانی سے پیچھے دیکھا۔ قاسم خان موجود نہیں تھا۔ میں لڑکی کی طرف آنکھیں
 پھاڑنے لگا۔ لیکن اچانک ہی میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ جس جگہ
 میں کھڑا تھا یہاں ایک بڑی سی چٹان نظر آ رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر چٹان کی دوسری
 جانب دیکھا۔ دوسری جانب کچھ گہرائیاں تھیں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ ابھی میں ادھر جھانک
 ہی رہا تھا کہ اچانک دوڑتے ہوئے آدمیوں کی آوازیں قریب پہنچیں اور اس کے بعد
 مجھ پر کئی فائر ہوئے۔ زندگی بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ
 برق رفتاری سے اس کھائی میں کود جاؤں۔ کھائی میں، میں اس طرح کودا کہ اپنے آپ
 کو نہ سنبھال سکا۔ خاصی چوٹ لگی تھی۔ اور لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن زیادہ
 آگے نہیں گیا تھا کہ وہ میرے سر پر پہنچ گئے جنہوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی اور جن

مرے گزر کر دوسری طرف گرا تھا اور خود کو بچانے کی کوشش میں تھا۔ اس گولی کی زد میں آ گیا۔ گولی نے اس کی سر کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ میری نگاہ بے اختیار اس ذی کی جانب اٹھ گئی۔ جس نے یہ کھیل شروع کیا تھا۔ پہلے تو میرے ذہن میں یہی نہ کچھ تھا کہ ممکن ہے یہ لڑکی ہی کے آدمی ہوں۔ اور یہاں لا کر اس نے ہمیں ان کے جنگل میں پھنسانے کی کوشش کی ہو۔ لیکن اب میں نے اسے دیکھا تو وہ اپنی بہ بابا کا کھڑی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں جان بچانے کے لئے دوڑ پڑوں۔ چنانچہ میں نے سنبھل کر ایک بان کے عقب میں چلا گیا۔ میری بندوق کی زد میں آ کر جو لوگ گرے تھے وہ بے سنبھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے مجھ پر اندھا دھند گولیاں برساتنا شروع کر دیں۔ لیکن اب میں ان کے نشانے پر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے ان کے نشانے سے بچنے کے لئے زگ زگ بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے ایک بڑی چٹان کی آڑ ل گئی۔ اور اسکے پیچھے پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بندوق سیدھی کی۔ اور پھر اپنی لڑکھائی سے بھاگنے والوں میں سے ایک کو نشانہ بنا لیا۔ اپنے ایک ساتھی کے گرتے ہی میں عقل آ گئی اور پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔ اب میں خونی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو سامنے سے آ رہے تھے لیکن اس وقت مجھے اپنے بائیں سمت سے گراہٹ محسوس ہوئی اور میں سانپ کی طرح پلٹ پڑا۔ اگر وہ سریلی آواز میرے اذان میں نہ ابھرتی تو یقینی طور پر وہ بھی گولی کا شکار ہو جاتی۔ یہ وہی شیطان لڑکی تھی جس نے اپنا نام سلالیہ بتایا تھا چنانچہ سلالیہ دوڑتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے پتے ہوئے کہا۔

”اس طرح تم ان کے جنگل سے نہیں نکل سکو گے۔ مجھے اپنی گرفت میں لے لو اور اپنی ڈھال بنا لو ان سے کہو کہ وہ اپنی بندوقیں پھینک دیں ورنہ تم مجھے مار ڈالو گے۔“ لڑکی کے الفاظ نے ایک بار پھر میرے ذہن کو عجیب سے چکر میں ڈال دیا۔ پھر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟“

”خاتواہ کی بیٹی۔ وہ لوگ میری زندگی بچانے کے لئے بندوقیں پھینک دیں گے۔“

کے قدموں کی آواز میں نے سنی تھی۔ بہت ہی چوڑے چکے جسوں کے مالک خطرناک صورت والے لوگ تھے جن کی شخصیت سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت بے رحم اور کوئی خطرناک عمل کر ڈالنے والے ہیں۔ انہوں نے بندوقوں کی ٹالیاں میرے بدن سے لگا دیں۔ میرے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ میں نے ان کو دیکھا۔ ان کی تعداد چار تھی۔ پھر میں غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اور تمہیں یہ اندازہ ہے کہ تمہیں تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ مل سکتا ہے۔ ہٹاؤ بندوقیں ہٹاؤ۔“ لیکن میرے ان الفاظ پر ان میں سے ایک نے بندوق کی نال میرے پیٹ میں چبھوتے ہوئے کہا۔

”اب تم اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ بدن کے سوراخ گنے بھی نہیں جا سکیں گے۔“ اس کے لہجے میں جس قدر غراہٹ تھی۔ اس کا اندازہ ایک لمحے میں مجھے ہو گیا۔ اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ البتہ یہ احساس مجھے ہوا تھا کہ ان کے چہرے کے نقوش مقامی لوگوں جیسے نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے قاسم خان پر بھی غصہ آ رہا تھا اور اپنی حماقت پر بھی کہ اس طرح آسانی سے ان کے جنگل میں پھنس گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے ہوشیار رہنا چاہئے تھا۔ مسلسل دھوکے کھا رہا ہوں اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ یہ سب کچھ بھی لڑکی ہی کا کیا دھرا ہو۔ بس اس بات نے ذہن پر دیوانگی سوار کر دی۔ میں نے بندوق والے کی نال پکڑی اور دوسرے لمحے اسے زور سے جھکا دیا۔ شاید کچھ زیادہ ہی طاقت صرف ہو گئی تھی کہ بندوق والا میرے سر سے گزر کر دوسری جانب گرا تھا۔ لیکن بقیہ تین افراد نے بدحواسی میں گولی چلا دی۔ گولیاں چلیں اور میں بال بال بچا۔ چھینی ہوئی بندوق چونکہ میں نے نال کی طرف ہی پکڑی ہوئی تھی میں اسے سیدھا کئے بغیر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ لگائی اور بندوق کو لاٹھی کی طرح گھمایا۔ ان میں سے دو کے پاؤں بندوق کی لپیٹ میں آ گئے اور وہ بری طرح گرے۔ لیکن تیسرے نے اچھل کر خود کو بچا لیا تھا۔ اور چیختے ہوئے دوبارہ گولی چلا دی تھی۔ البتہ میں اب ہوشیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ گولی کی آواز کی ساتھ ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس لئے گولی مجھے تو نہ لگ سکی۔ البتہ وہ جس کی بندوق میری ہاتھ میں تھی اور میرے

”لڑکی پھر کوئی نئی چال چل رہی ہو؟“

”دیکھو جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو ورنہ....“ لڑکی نے کہا اور اس بار میں نے شدت نفرت سے اس کے خوبصورت بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ رائفل کا بٹ اپنا بغل میں دبا کر میں نے ان دونوں کو دیکھا جو زمین پر چھپکلی کی طرح ریگتے ہوئے اس سمت آ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے بندوق سیدھی کر لی اور ان میں سے ایک کا نشانہ لینے لگا۔ لیکن یہ بھول گیا تھا کہ شیطان لڑکی کوئی عمل کر سکتی ہے۔ اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایسی زور دار ضرب لگی تھی میرے سر کے پیچھے حصے میں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ چکرائی ہوئی آنکھوں سے میں نے لڑکی کی جانب دیکھا جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر سے میرے سر پر دوسری ضرب لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر دوسری ضرب لگی اور بندوق میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہوش کب آیا تھا۔ البتہ جب ہوش آیا تو تیز دھوپ اور گرم ہوا میرے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اوپر نگاہ دوڑائی۔ سورج میرے سر پر چمک رہا تھا اور اس کی تپش اور تیز روشنی مجھے تیر کی طرح اپنی آنکھوں میں گھستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی تو سر کی پشت کے زخم نے احتجاج کیا۔ اور میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ اب میری نگاہوں کے زاویئے بدل گئے تھے اور میرے سامنے کوئی لمبی لمبی چیز نظر آ رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لکڑی کے موٹے موٹے تنے ہیں۔ پتلے درختوں کے تنوں کو جوڑ جوڑ کر پنجرے بنائے گئے تھے اور ایسے ہی ایک پنجرے میں مجھے قید کر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے یہ تنے چاروں طرف سے میرے گرد احاطہ کئے ہوئے تھے۔ چھت بھی انہی تنوں کی بنی ہوئی تھی۔ اور دھوپ سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دروازے کو لکڑی ہی کے موٹے حصے سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرے قرب و جواب میں ایسے بہت سے پنجرے بنے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ پنجروں میں بے شمار افراد قید نظر آ رہے تھے۔ میں حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ نہ جانے میں کس قدر قیدی تھا۔ رفتہ رفتہ حواس جاگتے جا رہے تھے۔ اور گزرے ہوئے لمحات مجھے یاد آ رہے

تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان پنجروں میں قاسم خان کو تلاش کیا۔ لیکن قاسم خان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی اس بے بسی پر غصہ آنے لگا۔ مجھ سے بہتر تو قاسم خان ہی رہا تھا۔ جس نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ کر اسی وقت اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا جب میں لڑکی کے ساتھ آگے آ رہا تھا۔ واقعی بیشتر موقعوں پر اس نے مجھ سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ میں تو اس لڑکی کے جال میں پھنس گیا لیکن قاسم خان آسانی سے اس کے چنگل سے نکل گیا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ لڑکی نے میرے سر پر حملہ کر کے ان لوگوں کو مجھ سے نجات دلائی تھی۔ جو سو فیصدی اسی کے ساتھ تھے۔ میرے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

”قسم کھاتا ہوں اگر تم مجھے دوبارہ نظر آ گئیں تو میں تیرے سر کے تمام بال صاف کر دوں گا۔ تیری ناک اور کان کٹ دوں گا اور اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ تو کتنی ذہین ہے۔“ لیکن اس طرح لڑکی پر غصہ کرتے رہنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہاں مجھ پر توجہ دینے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ میری آنکھیں ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں جو مختصر سے لباسوں میں ملبوس ہڈیوں کی مالائیں پہنے ہاتھوں میں بڑے بھالے فخر اور کھٹایاں لٹکائے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ ان میں سے کوئی میری جانب متوجہ نہیں تھا۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور دور دور تک پھیلے پنجروں میں ان قیدیوں کو بھی۔ جو بے چارے تپتی ہوئی دھوپ اور سورج کی کرنوں میں مر رہے تھے۔ یہ بد حال لوگ نہ جانے کون تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کچھ لوگوں کا غول مجھے اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوا۔ یقیناً یہ سب اس سمت آ رہے تھے۔ سب سے آگے ایک بھرا ہوا دیو تھا۔ اتنے چوڑے چکے بدن کا مالک گوشت کے تودوں سے سجا ہوا کہ دیکھ کر خوف آئے۔ وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور چیختا پلاتا بھی جا رہا تھا۔ لیکن اس کے منہ سے نکلنے والی آواز میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر میں نے کچھ گھوڑے سواروں کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ لوگ بھرے ہوئے میری جانب کیوں آ رہے ہیں۔ پھر سب سے پہلے وہی چوڑا شخص پنجرے کے قریب پہنچا تھا۔ اور اس نے درختوں کے تنوں میں لٹائیاں گھسیڑ کر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے غرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

خدمت کی ہے۔ اسے مجھے دے دے سردار، اس آدمی کو مجھے دے دے۔“

”ایک آدمی کی قیمت جانتا ہے تو۔“ اس شخص نے کہا۔

”ساری زندگی تیری غلامی کرتا رہوں گا۔ بس اسے میرے حوالے کر دے۔“

”پاگل ہو رہا ہے تو پاگل ہو رہا ہے۔ میں تیرے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن ایسا نہ کر پہلے بھی تو ایک آدمی کو اپنے ہاتھوں سے فرار کرا چکا ہوں۔ تو نے نشے میں اس شخص کو یہاں سے بھاگنے کا موقع دیا تھا۔ میں نے تجھے معاف کر دیا تھا۔ اس بار آدمی کو میرے ہاتھوں سے ضائع نہ کر۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنا یہ ارادہ ترک کر دے۔“

”نہیں سردار۔ ایسا نہ کہہ میں یہ تیری بات نہیں مان سکوں گا۔ اگر تو ایسا نہیں کر سکتا تو یہ بھلا میرے سینے میں اتار دے۔ اپنے پستول کی ایک گولی مجھے بھی مار دے۔ لیکن مجھے میری اس قسم سے محروم نہ کر۔ جو میں نے اپنے بھائی کے قاتل سے بدلہ لینے کے لئے کھائی ہے۔“ رنگا نے کہا۔

”یہ پاگل ہو گیا ہے دیکھو اسے سمجھاؤ۔“ جس شخص کو سردار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے دوسروں سے کہا۔

”ہم نے اسے بہت سمجھایا ہے سردار۔ یہ جانتا ہے کہ تم کبھی اس کی اجازت نہیں دو گے۔ لیکن یہ پھر بھی نہیں مانتا کتا ہے اگر ایسا نہ ہوا تو یہ خودکشی کر لے گا۔“

”یہ میرا نقصان کرا رہا ہے۔ خیر اگر یہ ایسا ہی چاہتا ہے تو یہی سہی۔ یہ میرا بہت اچھا ساتھی ہے۔ میں اس کی بات ماننے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اور اس کے بعد وہ شخص خوشی سے کھڑا ہو گیا۔ سردار نے اجازت دے دی تھی۔ تو پھر دوسرے لوگوں کو بھلا کیا پریشانی ہوتی۔ قوی ہیکل آدمی مجھے خون آشام نگاہوں سے دیکھتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے بڑھ کر اس پنجرے کا تلا کھول دیا جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ پھر وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”باہر نکل کتے، باہر نکل اور دیکھ موت کیسی دلکش ہوتی ہے۔“ شاید آپ لوگ اسے میری خودستائی سمجھیں۔ اپنے آپ پر ناز کرنے کی کوشش سمجھیں۔ یا پھر یہ سمجھیں کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھتا ہوں۔ زندگی میں بے شمار پریشان کن

”او کتے او خنزیر باہر نکل۔ میں تیری ہڈیاں چبانے کے لئے بے چین ہوں۔ اور رب عظیم کی قسم میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے میرے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔ میں تیری آنکھوں کے حلقوں میں انگلیاں ڈال کر سب سے پہلے انہیں روشنی سے محروم کروں گا۔ پھر تیرے بدن کی چندیاں اڑا دوں گا۔ اور تیری ان ہڈیوں کو اپنے بازوؤں میں دبوج کر سرمہ بنا دوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تجھے۔“ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا اور میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ البتہ میں ابھی تو اس کے ہاتھوں کی زد میں نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

”بے وقوف کون تھا تیرا بھائی؟ اور کب میرے ہاتھوں مارا گیا؟“

”باہر نکل باہر نکل۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ آ تو سہی ذرا میرے چنگل میں۔“ جواب میں میں ہنس پڑا میں نے کہا۔

”مجھے باہر تو ہی نکال سکتا ہے۔ تو کوشش نہیں کرتا تاکہ تیری خواہش پوری ہو جائے۔“ اسی دوران گھوڑے سوار پنجرے کے پاس پہنچ گئے۔ اور انہیں دیکھ کر مجمع کے افراد پیچھے ہو گئے۔ یہ لوگ بھی مقامی باشندے ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اسی مختصر لباس اور وحشی فطرت کے ساتھ۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کون لوگ ہیں، ان کے حلیوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ننگ دھڑنگ رہنے والے یہ لوگ تہذیب سے نا آشنا معلوم ہوتے تھے۔ پھر ایک دراز قد آدمی گھوڑے سے نیچے اترا۔ اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا تو پاگل ہو گیا ہی۔ رنگا! موت آگئی ہے تیری۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی بجائے تو میرے قیدی کی پاس آیا ہے۔ تو جانتا ہے تو کیا بکواس کر رہا ہے۔“ جس شخص کو رنگا کہا گیا تھا۔ وہ واپس پلٹا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے سردار۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتا۔ اسے مجھے دے دے، اسے مجھے دے دے اس نے میری زندگی کا سارا چھین لیا ہے۔ آہ! اس نے میرے اکلوتے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہ کیا تو میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ دیکھ سردار میں نے ہمیشہ تیری غلامی کی ہے۔ تیری

نے اپنے ساتھی سے پستول مانگا اور اس کے ساتھی نے فوراً ہی پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اب میں اس پر مارشل آرٹس کے داؤ استعمال کروں۔ ایک تیز چیخ کے ساتھ میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور پھر زمین پر بیٹھ کر لوٹ لگائی اور ایک پاؤں اوپر اٹھا دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ ایک آدمی نے بڑھ کر پستول اٹھایا اور میرا نشانہ باندھا تو سردار نے غصیلی آواز میں کہا۔

”نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی دوسرا مداخلت نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ پستول استعمال نہیں ہو گا خبردار! اب اسے پستول نہ دیا جائے۔“ وہ شخص ایک دم پیچھے ہٹ گیا لیکن رنگا نے ایک بار پھر ایک چھوٹی کھماڑی اٹھالی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ سنبھل گیا ہو۔ یہ دو تین وار ناکام جانے کے بعد میری پھرتی اور مستعدی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ صورت حال مختلف ہے لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس طاقتور آدمی کے ساتھ پھرتی سے نمٹا جائے تو اپنی طاقت کا لوہا بھی منوایا جا سکتا ہے۔ لیکن چالاکی سے کام لے کر۔ اور جو نہی اس بار اس نے کھماڑی گھما کر مجھ پر وار کیا میں نے اس کی کھائی پکڑ لی اور اس کے بعد پھرتی سے اسے موڑ کر ایک گھونسا اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ اچھل کر نیچے گرا اور بے شمار لوگوں کے منہ سے آوازیں نکل گئیں۔ یہ بھی مارشل آرٹس کا کارنامہ تھا ورنہ صحیح معنوں میں میں اس کے جسم کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے خود بھی یہ اندازہ تھا کہ ایک پہاڑ سے نکل رہا ہوں نہانچہ پہاڑ کو پہاڑ ہی سمجھ کر مار رہا تھا۔ چونکہ اسے تین چار بار میرے ہاتھوں مار کھانا پڑی تھی اس لئے وہ اور زیادہ خونخوار ہو گیا تھا اس بار جب وہ نیچے گرا تو ایک پتھر اس کے منہ پر لگا تھا اور اس کی پیشانی پھٹ گئی تھی۔ خون بھل بھل کر کے بہتا ہوا اس کے پورے چہرے پر بکھر گیا تھا اور اس کی آنکھیں بھی اس خون سے متاثر ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے بار بار اسے آنکھیں بند کرنی اور کھولنی پڑ رہی تھیں۔ اس بار اس نے بہت ہی طوفانی انداز میں ہاتھ بڑھا کر مجھ پر کھماڑی سے وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں پیچھے ہٹ گیا اور جیسے ہی وہ جھکا جھکا آگے آیا میں نے بھرپور قوت سے اپنے پاؤں کی ٹھوک اس کے منہ پر مار دی میرے پاؤں کو بھی مزہ ہی آگیا تھا لیکن اس کا منہ بھی

واقعات پیش آئے۔ ہر جگہ فحش نہیں حاصل ہوئی مجھے۔ کہیں کہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور اچھی خاصی پریشانیاں اٹھائیں۔ لیکن ایک فطرت میرے اندر تھی جب مجھ پر دیوانگی سوار ہوتی تھی تو میں زمانہ قدیم کا وحشی بن جاتا تھا۔ قاسم خان میری نسبت عقل سے کام لینے کا عادی تھا۔ لیکن میں۔ جب کبھی حالات میری مرضی کے خلاف ہو جاتے تو عقل سے بیگانہ ہو جاتا۔ اور اس وقت میری وہ وحشیں عروج پر پہنچ جاتی تھیں۔ بہر حال جیسے ہی میں پنجرے سے باہر نکلا۔ وہ وحشی مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ گوشت کا یہ پہاڑ میری جانب بڑھا ہی تھا کہ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور وہ آگے بڑھ کر پوری قوت سے ستونوں والے پنجرے سے ٹکرایا۔ لیکن فوراً ہی سانپ کی طرح پلٹ پڑا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہاں موجود لوگوں نے دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے جگہ چھوڑ دی تھی یہاں تک کہ وہ شخص جسے سردار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام مجھ پر کیوں لگا رہا ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں میں نے اسے قتل کیا یا نہیں میں نہیں جانتا۔ لیکن بہر حال یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ایک ایسے شخص کو قاتل کہہ کر مجھ سے بدلہ لیا جا رہا ہے۔ جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نے کسے قتل کیا۔“ میں یہ جملہ ادا کر بھی نہیں پایا تھا کہ رنگا پوری قوت سے ایک بار پھر میرے پاس پہنچا اور اس نے میرے سینے پر ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار میں نے اس کی گردن پر ہاتھ جمایا اور اسے بالکل پیچھے ہٹا دیا۔ جیسے سین میں بل فائیٹر بھینے کو اپنے جسم کے پاس سے گزار دیتے ہیں۔ وہ ایک بار پھر پیچھے نکل گیا۔ اور اس بار اس نے پوری قوت سے تیسرا حملہ کیا تھا۔ پھر جب یہ تیسرا حملہ بھی ناکام رہا تو اس نے ایک طرف رکھا ہوا کھماڑا اٹھا لیا۔ جو اس کے ساتھی نے شاید اسی کے لئے رکھا تھا۔ کھماڑی کی مجھے پرواہ نہیں تھی۔ لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کے کچھ ساتھی آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ دیو قامت شخص نے کھماڑا اٹھایا اور اسے گھماتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ پھر جیسے ہی میرے قریب پہنچا میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ اور اس کے فوراً بعد گھوم کر ایک بھرپور لات اس کی گردن پر رسید کر دی تھی وہ نیچے جاگرا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اٹھ کر اس

میں خنقل کر دیا گیا۔ بہر حال مجھے اس صورت حال پر بڑی پریشانی تھی خاص طور سے اس لئے کہ قاسم خان میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس سے زیادہ غصہ مجھے اس شیطان لڑکی پر تھا۔ ہم نے تو اسے ہر طرح کا تحفظ دیا تھا لیکن اس نے گزبوا کر ڈالی تھی۔ اس دوران میں یہ جائزہ لیتا رہا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کے چنگل سے فرار ہونے کی کوشش کروں اور اپنے دو چار محافظوں کو مار کر یہاں سے نکل جاؤں تو مناسب نہیں ہو گا کیونکہ اس سے یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکے گا کہ یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے تھے اور ان کا چکر کیا ہے۔ البتہ یہ نئی جگہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ پہاڑوں میں بنا ہوا ایک غار تھا۔ جو کافی عظیم الشان تھا۔ اور جہاں تک لانے کے لئے مجھے ایک لمبی سرنگ سے گزارا گیا تھا۔ پھر میں ایک سلاخوں والے دروازے سے اندر داخل کر دیا گیا تھا۔ اس غار کے علاوہ ایک اور غار بھی موجود تھا جس میں کئی قیدی زمین پر پڑے سو رہے تھے۔ مجھے یہاں لانے والے دروازہ بند کر کے چلے گئے اور میں ان قیدیوں کو دیکھنے لگا پھر میں اس دوسرے سوراخ کی جانب بڑھ گیا اندر داخل ہوا تو آگے روشنی نظر آئی اور میں اس روشن جگہ پہنچ گیا۔ غار کی چھت میں مشعلیں روشن تھیں اور چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے یہ مشعلیں اوپر نصب کی گئی تھیں اس غار میں بے شمار سوراخ تھے اور ہر سوراخ کے دوسری طرف سے انسانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ نہ جانے یہ غار کتنی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے پورا پہاڑ اندر سے کھوکھلا ہو اور اس لمبا انسانوں کو قید کر دیا گیا ہو۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ میں ان اس غار میں ہوں لیکن چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچنا میرے لئے مشکل نہیں ثابت ہوا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا اور اس کے بعد آگے بڑھ کر ان قیدیوں کے پاس پہنچ گیا جو غار کی دیوار سے لٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے میری بات توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس طرح خاموش اور پرسکون تھے جیسے یہی ان کی قیام گاہ ہو۔ میں جس شخص کے پاس جا کر بیٹھا تھا اس نے گردن تک نہیں اٹھائی تھی پھر میں نے خود ہی اسے مخاطب کیا اور کہا۔

”سنو!“ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر گردن جھکالی۔

”میں تم ہی سے بات کر رہا ہوں۔“

خون سے بھر گیا تھا اور اب میرے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے اٹھنے نہ دوں۔ آخر کب تک میں اس کے حملوں سے بچ سکتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مذاق ہی مذاق میں کھوپڑی ترخ جائے یا گردن کندھوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ چنانچہ اس بار میں نے اس پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے کلباڑی والے ہاتھ کو زمیں پر لگایا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر مضبوط گھونسوں کی بارش اس کے چہرے پر کرنے لگا۔ وہ مجھے خود پر سے دھکیلنے کی فکر میں تھا۔ لیکن میری کوششوں نے اس کی قوت مدافعت ختم کر دی اور پھر میں نے اس کے کلباڑی والے ہاتھ پر ضرب لگائی اور اس کا پنجہ کھل گیا۔ میں نے کلباڑی کو ٹھوک ماری اور جیسے ہی وہ اچھلی میں نے اسے لپک لیا۔ اب میں اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا اور کلباڑی میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس بات پر یقین کر کے آنکھیں کھولنے کا انتظار کرتے لگے کہ مرنے والے کے حلق سے زندگی کی آخری چیخ نکلے۔ میں نے کلباڑی کو بلند کیا کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ کلباڑی آہستہ آہستہ نیچے جھکی اور پھر اس کے بعد میں اس کے قریب سے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام یہ مجھ پر کیوں لگا رہا ہے جبکہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور میں یہ نہیں جانتا کہ اس کا بھائی کون ہے یا کون تھا۔ لیکن میں اس پر فتح حاصل کر کے بھی اسے قتل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر یہ بے وقوفی کر رہا ہے تو میں بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا۔“ سردار نے اسے دیکھا اور پھر میری جانب متوجہ ہو گیا پھر بولا۔

”اسے بند کر دو۔ اور اس کے بعد واپس اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلا گیا۔ جیسے ہی وہ لنگھوں سے اوجھل ہوا وہ لوگ جو آس پاس بکھرے ہوئے تھے اس آدمی کو سنبھالنے لگے اور ان میں سے کچھ نے مجھے کٹہرے میں دھکیل دیا چونکہ میں صورت حال سے کوئی آگاہی نہیں رکھتا تھا اس لئے ابھی کوئی مداخلت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خاموشی سے کٹہرے میں پہنچ گیا تھا لیکن یہ جو ہنگامہ ہوا تھا یہ میری سمجھ سے باہر تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ بھی نہیں جانتا تھا میں۔ پھر دوپہر کے بعد جب سورج ڈھلا تو مجھے وہاں سے ایک اور پنجرے

”کالی دھاریاں تھیں اس کے بدن پر لیکن میں نے نہ سوچا اور اسے پکڑنے دوڑ پڑا پھر جب ایک پہاڑی میں چٹان کی آڑ میں پہنچا تو وہاں یہ لوگ پہلے سے موجود تھے انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور یہاں پہنچا دیا۔“

”تم چرواہے تھے؟“

”ہاں۔“

”بھیڑیں کہاں گئیں؟“

”جنم میں۔“

”کیا مطلب؟“

”کیوں میرے کان کھا رہے ہو۔ مجھے اپنا گھریا یاد آ جاتا ہے۔ جب میں ماضی یاد کرتا ہوں۔“ وہ رونے والی آواز میں بولا۔

”نہیں خود کو سنبھالو! اور مجھ سے باتیں کرو۔ مجھ سے باتیں کرنا ہو سکتا ہے۔ تمہارے حق میں فائدہ مند ہو۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تو میں نے پوچھا۔

”یہاں کتنے قیدی موجود ہیں؟“

”کیا تمہیں گنا آتا ہے؟“

”مطلب؟“

”ہم ایک دوسرے کو گنتے نہیں ہیں بس ان کی شکلیں دیکھتے ہیں اور اپنے گھریا یاد کر کے روتے ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”دنبو۔“ اس نے جواب دیا۔

”دنبو! دیکھو تقدیریں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ رب عظیم اگر ہماری مدد کرے گا تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کیا معلوم ہے؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بھیڑیں چرانے والا ایک آدمی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اپنے بچوں سے دور ہوئے مجھے بہت سے سورج بہت سے چاند گزر گئے اور یہاں جتنے لوگ موجود ہیں سب میری ہی طرح کے ہیں ان کا

”یہاں کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا۔“ وہ اواس لہجے میں بولا۔

”کیوں؟“

”میں نے کہا ناں۔ بات کرے گا تو وجہ بھی بتائے گا۔“

”دیکھو! میں تم سے مخاطب ہوں اور یہ بہت بری بات ہے کہ انسان۔ انسان کی

بات کا جواب نہ دے۔“

”انسان۔“ وہ تلخ انداز میں ہنسا۔

”ہاں۔“

”تم اب بھی خود کو انسان سمجھتے ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”اس وحشت ناک ماحول میں انسان تو نہیں رہ سکتے۔ مجھے تعجب ہے یا پھر یہ ہو

سکتا ہے کہ ابھی تمہیں صورت حال کا اندازہ نہ ہوا ہو اور تم اب بھی خود کو انسان سمجھ رہے ہو۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ تم خود کو انسان سمجھنا بھول جاؤ گے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ نہ یہاں چاند اترتا ہے نہ سورج۔ تاریکی وقت نہیں بتاتی یہاں موسموں کا

اندازہ بھی نہیں ہوتا۔“

”تم یہاں کب سے ہو؟“

”میں نے کہا نا کیسے بتا سکتا ہوں۔ البتہ اتنا بتا سکتا ہوں کہ جب مجھے یہاں لایا گیا تو

زمین بارش سے جل تھل تھی یعنی وہ موسم بارشوں کا موسم تھا۔“

”کون سے قبیلے کے باشندے ہو تم؟“

”سورج قبیلہ تھا میرا۔“

”وہاں کیا کرتے تھے؟“

”بکریاں چراتا تھا۔“

”ان کے قبضے میں کیسے آ گئے؟“

”وہ کالی بھیڑ جس نے میری تقدیر میں سیاہیاں بھر دیں۔“

”کیا مطلب؟“

اس کے بارے میں دینو نے واقعی صحیح کہا تھا۔ موٹی موٹی سادی چاول کی روٹیاں اور اس کے ساتھ ہی کسی طرح کی پکی ہوئی گھاس جس میں نہ نمک ہوتا تھا نہ مرچ۔ لیکن ایک بات ہے کسی بھی چیز کا مزہ اگر لیا جائے اور وہ تبدیل ہو تو بڑی عمدہ لگتی ہے۔ مجھے بھی یہ کھانا پسند تھا۔ میں نے امن پسندی کا ثبوت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کھانا لانے والے بڑے بڑے برتن ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ مسلح افراد کا ایک پورا گروہ موجود تھا۔ جو ایک ایک قیدی پر نگاہ رکھتا تھا۔ بڑے غار میں ان سب کو جمع کر کے کھانا تقسیم کیا گیا تھا۔ میں نے بھی کھانا گردن جھکا کر لیا تھا۔ اور ان لوگوں کے بارے میں اندازہ لگاتا رہا تھا۔ پھر دوپہر کو میں ٹھٹھا ہوا اس لوہے کی سلاخوں والے دروازے تک پہنچ گیا جس کے دوسری جانب پہرے دار موجود تھے۔ لیکن ان پہرے داروں میں میں نے جس لڑکی کو دیکھا اسے دیکھ کر مجھے جھرجھری سے آگئی اور میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ لڑکی غالباً ان پہرے داروں سے کچھ معلومات حاصل کر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ پھر وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی اور سلاخوں والے دروازے سے پاس پہنچ گئی پھر اس نے منہ سے اشارہ کر کے مجھے بلایا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔

”ادھر آؤ۔ براہ کرم ادھر آؤ۔“ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”سنو! کیا تم بتاؤ گے کہ تم اور تمہارا ساتھی یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ تم پر کیا معیت نوٹ پڑی تھی۔ کون سے قبیلے سے تمہارا تعلق ہے۔“ جواب میں مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔

”اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ تیرے حسن نے ہمیں تمہاری طرف متوجہ کیا تھا تو تیرا ہم لے کر میں اس زمین پر تھوکتا ہوں۔“ میں نے زمیں پر تھوک دیا۔ لڑکی کی پیشانی پر ہل پڑ گئے تھی۔ اس نے کہا۔

”اور تم جانتے ہو کہ اس کے نتیجے میں تمہاری گردن بھی کاٹی جاسکتی ہے۔“

”ہاں! کتوں نے میری گردن کاٹنے کی کوشش کی تھی۔“

”سنو! اس وقت بھی میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی، نہ ہی میں نے

تعلق مختلف قبیلوں سے ہے۔“

”یہ لوگ آخر تم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”ارے بھائی! کیوں میرے کان کھا رہے ہو۔ کسی اور سے معلوم کر لو۔“

”نہیں دینو! مجھے تم سے معلوم کرنا ہے اور خبردار! ضد مت کرو جو میں پوچھ رہا ہوں مجھے بتاؤ۔“ وہ ہنسا اور بولا۔

”ہاں! اب تم نے صحیح زبان میں بات کی ہے۔ مجھے ڈراؤ میں بات کروں گا تم سے۔“

”چلو یہی سہی۔ کھانے پینے کے لئے تمہیں کیا ملتا ہے؟“

”وہ جو ہم اپنے جانوروں کو بھی نہیں کھلاتے تھے۔“

”کیا تمہیں اپنی جگہ قیام کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے؟“

”نہیں۔ ان سرگلوں اور غاروں میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے ہمیں۔ ان غاروں کا دوسرا حصہ عورتوں کے لئے ہے۔ وہاں قیدی عورتیں، مرد بھی شامل ہیں۔“

”ان لوگوں نے کبھی یہ نہیں بتایا تمہیں کہ تم لوگوں کو یہاں کیوں قید کر دیا گیا ہے۔“

”نہیں۔ ان سے کون پوچھے گا؟“

”ٹھیک ہے۔ دینو فکر مت کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں نے کہا اور اس

کے بعد نہ جانے کیوں اپنے شانوں پر ایک ذمہ داری محسوس ہوئی تھی۔ اور میں نے سوچا تھا کہ اس بد نصیب گروہ کو ان لوگوں سے آزادی دلاؤں گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بد بخت پروفیسر لنکونا نے یہاں مجھے کس مقصد کے لئے بھیجا ہے۔ بات ہی ابھی تک سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ پتہ نہیں وہ شیطان ہم سے کیا چاہتا تھا لیکن اپنے کئے کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ پھنس گئے تھے اور لگ رہا تھا کہ نکلنا مشکل ہی ہو گا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ بہر حال اللہ مالک تھا۔ میں نے تمام غاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ لاتعداد قیدی یہاں بھرے ہوئے تھے۔ سرگلوں کے قدرتی جال ادھر سے ادھر پھیلے ہوئے تھے اور یہ ایک بے شمار قیدیوں کا قید خانہ تھا۔ پھر یہاں مجھے پہلی رات گزر گئی۔ دوسری صبح قیدیوں کو کھانا تقسیم کیا گیا۔ دو وقت کھانا دیا جاتا تھا اور جو کچھ دیا جاتا تھا

”سکتا ہے۔“

”فکر نہ کرو، کچھ وقت گزر جانے دو تم بھی روؤ گے۔“

میں ہنس پڑا تھا میں نے کہا۔

”شاید ایسا ہو لیکن ابھی اس کے امکانات نہیں ہیں ویسے میں تمہارے بارے میں

بانا چاہتا ہوں۔“

”بے کار ہے..... بے کار ہے!“ اس نوجوان نے کہا۔

”جو باتیں کبھی کبھی بے کار سمجھے جاتی ہیں وہ بڑی کار آمد ہوتی ہیں۔“ مجھے اپنے

بارے میں بتاؤ۔“

نوجوان نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا۔

”میں قبیلہ فولاہ کا رہنے والا ہوں، روایتوں کے مطابق مجھے سردار بنایا جانے والا تھا

اور سرداری کے حصول کے لئے مجھے ایک سیاہ ہرن جنگل سے پکڑ کر لانا تھا، میں ہرن

کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ مجھے کالا ہرن نظر آگیا اور میں نے اس کے پیچھے گھوڑا دوڑا

دیا، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میری بد نصیبی مجھے اس ہرن کے پیچھے لئے جا رہی ہے،

میں جب پہاڑوں میں پہنچا تو ایک جال ڈال کر مجھے پکڑ لیا گیا۔ جال میں پھنسے ہونے کے

بلجود میں نے ان میں سے تین آدمیوں کو ختم کر دیا تھا لیکن بہر حال انہوں نے مجھے

زخمی کر دیا اور میں پکڑا گیا۔“ میں نے محسوس کیا کہ یہاں جتنے لوگ موجود ہیں انہیں

ایسے ہی کسی نہ کسی طرح پکڑا گیا ہے لیکن اصل بات کہیں سے پتہ نہیں چلتی تھی آخر

یہ کون لوگ تھے اور یہ پکڑ دھکڑ کیوں کر رہے تھے، لعنت ہو اس بوڑھے شیطان پر

جس نے ہمیں اس جال میں پھنسا دیا تھا کوئی بات علم میں تو ہوتی تاکہ ہم اپنے طور پر

بچو نہ کچھ کر سکتے، یہاں تو بس جھک ہی مار رہے تھے، قاسم خان نجانے کہاں مر گیا ہو

گا ہو سکتا ہے ابھی وہ ان کے جنگل سے باہر ہو۔ اب یہ بات نہیں معلوم تھی کہ

انہوں نے کتنے قید خانے بنا رکھے ہیں اگر کہیں اور بھی یہ قید خانے ہوئے تو ممکن ہے

کہ قاسم خان ان میں سے کسی قید خانے میں ہو، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی،

میں نے اس سے لوگ مجھے ملے ان میں ایک شخص زرقان بھی تھا، زرقان بھی ایک شاندار

تماری گردن کاٹنے کی کوشش کی تھی، تم بلاوجہ ہی پھنس گئے، لیکن تمہاری زندگی

بچانے کے لئے تمہیں زخمی کرنا ضروری تھا، اگر میں ایسا نہ کرتی تو تم یقین کرو آخر کار

تم وہاں مارے جاتے، میں نے تمہیں بچانے کے لئے زخمی کیا تھا تاکہ تمہیں قیدی بنایا

جائے۔ لیکن میں تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک بہت بڑا مقام حاصل

ہے اور میں اگر چاہوں تو تمہیں اپنے خاص محافظوں میں شامل کر سکتی ہوں، لیکن

چونکہ تمہارا دماغ الٹ گیا ہے اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا

ہے، چنانچہ تمہیں یہ غلط فہمی دور کرنا ہوگی۔“

”میں تیرے اوپر تھوک چکا ہوں۔ کیا تیرے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔“ میں نے کہا

اور لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی پھر بولی۔

”ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو پھر تجھے اپنے اس عمل کا نقصان اٹھانا ہو گا

سمجھا۔“

جواب میں زور سے میں ہنس پڑا تھا۔

وہ تکیھی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

”یہ ہنسی تیری آخری ہنسی ہے اور اس کی بعد تو جب تک جیئے گا روتا ہی رہے

گا۔“ لڑکی نے غصیلے لہجے میں کہا، پھر پاؤں بٹختی ہوئی وہاں سے واپس چل پڑی اور کچھ

لمحوں کے بعد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، میں بھی وہاں سے ہٹ آیا اور سامنے

والی سرنگ سے ہوتا ہوا غار کے اندرونی حصوں کی جانب بڑھتا رہا پھر ایک جگہ جا کر

رک گیا یہاں موجود لوگ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد مردہ جانوروں کی طرح

ادھر ادھر لیٹ گئے، بہر حال میں جانتا تھا کہ وقت گزارنے کے لئے ان لوگوں سے

شناسائی ضروری ہے، سبھی کی کہانیاں انوکھی تھیں، میں ان سے معلومات حاصل کرتا رہا

اور اس کے بعد آرام سے لیٹ گیا، میرے ذہن میں بہت سے منصوبے آ رہے تھے

لیکن ان کی تکمیل کے لئے وقت لگتا تھا یہاں میں نے جس کی بھی کہانی سنی، ایک جیسی

تھی، ایک نوجوان سے میری ملاقات ہوئی جس کی آنکھوں سے میں نے ہمیشہ آنسو پٹکتے

ہوئے دیکھے تھے، میں اس کے قریب پہنچا اور میں نے کہا۔

”تم جس تن و توش کے آدمی ہو، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس جسامت کا شخص

”یہ لوگ جادوگر ہیں، یہ قرب و جوار کے تمام قبیلوں میں اپنی طاقت پھیلانا چاہتے ہیں۔ پہلے قبیلے کے جوانوں کو گرفتار کرتے ہیں تاکہ کوئی ان سے مدافعت نہ کر سکے۔ جنگ نہ کر سکے، پھر ایک دن یہ بادلوں کی طرح انھیں گے اور ہر جگہ اپنی طاقت پھیلا دیں گے۔“

”ایک دوسری بات۔“

”وہ بھی پوچھو۔ تم سے باتیں کر کے اچھا لگتا ہے۔“

”واقعی؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں۔“

”اس کی وجہ؟“

”تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔“

”کاش میں تمہاری رہائی میں مدد کر سکوں۔“

”تمہاری سینے میں بڑے نیک جذبے ہیں، لیکن ایسا مشکل ہو جائے گا۔“

”کیوں؟“

”اس سے پہلے بھی یہ کوشش ہو چکی ہے۔“

”آہا تو پھر؟“ میں نے دلچسپی سے سوال کیا۔

”نتیجے میں دس یا بارہ افراد مارے گئے، ان کی لاشیں ہمارے درمیان ڈال دی گئیں اور ہمیں بتایا گیا کہ یہ فرار ہونے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔“

”اوہ!“ میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”اب بھی ایک چھوٹے سے غار میں ان کے سوکھے پنجر پڑے ہوئے ہیں اور کبھی

کبھی ہمیں ان کے سامنے سے گزارا جاتا ہے۔ تاکہ ہم انہیں دیکھیں اور اس کے بعد فرار کی کوشش نہ کر سکیں۔“

میں خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ابھی تک ان پر اسرار لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

قید خانوں کے محافظ جن کے چہروں سے سفاکت نیکی تھی ہم پر نگرانی کرتے تھے میرے ذہن میں رہ رہ کر صرف قاسم خان کا خیال آتا تھا اب تک ایسی کوئی کوشش

پوچھا۔

”کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم یہاں کیسے آ چکے؟“

”بس میرے دوست تقدیر کی بات ہوتی ہے مجھے اپنی گرفتاری کا کوئی غم نہیں ہے

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ رہا بھی ان کی قیدی ہے۔“

”رہا کون ہے؟“

”وہ جسے ایک رات بھی میری قربت حاصل نہ ہو سکی۔ ہم شادی کے فوراً بعد اپنی

زندگی کے اس عذاب میں گرفتار ہو گئے۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی ان لوگوں کی قید میں ہے، عورتوں کے قید خانے میں۔“

”تو پھر یہ سمجھ لو میرے دوست زرقان کہ اب تمہاری رہائی کا وقت قریب آ گیا

ہے۔“

”ناممکن ہے، یہ لوگ بہت ظالم ہیں، بڑے ہی سفاک، قیدیوں کے ساتھ ذرا بھی

رحم نہیں کرتے انہیں دھوپ اور تپش میں چھوڑ دیتے ہیں اور وہ جب بے بس ہو

جاتے ہیں تو یہ لوگ ان سے اپنی مرضی کا کام لیتے ہیں۔ آہ تم شاید یقین نہ کرو، بہت

ظلم کرتے ہیں، وہ ہم پر، میں رہا کے بارے میں کیا بتاؤں تمہیں، اسے مجھ سے چھین

لیا گیا۔“

”ایک بات بتاؤ زرقان؟“

”ہاں پوچھو۔“

”کیا تم یہ جانتے ہو کہ ان کا مقصد کیا ہے؟“

”کوئی نہیں جانتا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ کسی کو کچھ بتاتے نہیں ہیں۔“

”کسی نے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی؟“

”بہت مختصر۔“

”کیا؟“

بہت محفوظ اور مضبوط ہیں ورنہ طوفان کے اثرات یہاں تک پہنچ سکتے تھے، محافظوں نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسی جگہیں حاصل کر لی ہیں جہاں وہ طوفان سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

میں خاموشی سے قاسم خان کی صورت دیکھتا رہا، قاسم خان کافی بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس نے یہاں بھی مجھ پر فوقیت حاصل کر لی تھی کیونکہ ایسا تندرست اور آ رہا تھا کہ میں رشک بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر میں نے کہا۔

”قاسم خان، کیا تم مجھے یہاں سے نکال لے جاسکتے ہو؟“

”نہ صرف تمہیں بلکہ ان تمام قیدیوں کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کر لیا ہے۔“ قاسم خان کے لہجے میں شدید سنسنی تھی اور میں خود بھی اس سے متاثر ہو گیا۔

”آج کی رات اور ابھی ہم کچھ نہیں کر سکیں گے ہمیں اپنے کام کے لئے وقت مل رہا ہے، چنانچہ تم آرام سے رہو۔“

”تم جا رہے ہو کیا؟“

”میں نے کہا نا بالکل نہیں مجھے جانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا، کیونکہ میں خود بھی تم سے دوری کے اثرات کا شکار رہ چکا ہوں۔“

میں نے پہلی بار محبت بھری نگاہوں سے قاسم خان کو دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ جیسی بھی فطرت کا مالک تھا یا جس طرح بھی کہا جائے کہ ہم ایک مشترکہ لالچ میں پھنسے ہوئے تھے، لیکن تھا اچھا انسان، پھر اس نے اپنی داستان کا آغاز یوں کیا۔

”تم نے اسے قتل کر دیا، میں نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، نجانے کیا یہ صبح مجھے منحوس سی محسوس ہوئی تھی۔ ایک ایسی صبح جو نحوستوں کا آغاز ہوتی ہے اور انسان کو فوراً ہی احساس ہو جاتا ہے کہ اس پر کوئی نہ کوئی برا وقت پڑنے والا ہے۔ میں خود کو تم سے جدا نہیں کرتا، ہمارے سارے معاملات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں لیکن یہ نصیبی وہی تھی اگر ہم اس لڑکی کی گنگناہٹ پر غور نہ کرتے تو معاملہ اب ہو جاتا یا پھر اتنا خراب نہ ہوتا، بہر حال تمہاری اس کیفیت سے میں ایک دم الجھ

کار آمد نہیں ہوئی تھی جس کے تحت میں کوئی موثر قدم اٹھا سکتا تھا بس خاموشی سے دوسروں کی داستانیں سنتے ہوئے وقت گزر رہا تھا اور طبیعت پر شدید بیزاری طاری ہوئی جا رہی تھی لیکن پھر ایک دن ماحول بدل گیا رات کا وقت تھا باہر خوفناک طوفان آیا ہوا تھا، محافظ دبک کر بیٹھ گئے تھے، غاروں میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تب ایک محافظ میرے قریب آ گیا، اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ مجھے حیرت ہوئی وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا، محافظ کے اس طرح بیٹھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن پھر اس کی مدھم سی آواز ابھری۔

”شہباز۔“ اور اس آواز نے میرے پورے اعصاب کشیدہ کر دیئے، میرا بدن جھنجھکا کر رہ گیا تھا، ساری باتیں اپنی جگہ لیکن قاسم خان کی آواز میں نے بخوبی پہچان لی تھی، قاسم خان میرے قریب بیٹھا ہوا تھا، میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ بولا۔

”نہیں.... نہیں کوئی سرگرمی دکھانے کی کوشش مت کرو، ابھی صورت حال ہمارے حق میں بہتر نہیں ہے۔“

”قاسم خان!“

”ہاں، ہاں میں ہی ہوں۔“

”تم.... تم ٹھیک ہو؟“

”ٹھیک نہ ہوتا تو تمہارے پاس کیسے آ سکتا تھا؟“

”تم محافظوں کے لباس میں ہوں۔“

”ہاں۔“

”اس طرح تمہیں یہاں کوئی بھی ختم کر سکتا ہے؟“

”اتنا آسان نہیں ہو گا، یہ سب اپنی اعصابی قوتیں کھو چکے ہیں اگر ان کے اندر کسی محافظ کو ختم کرنے کی جرات ہوتی تو اب تک یہ بہت کچھ کر چکے ہوتے۔“ قاسم خان نے جواب دیا۔

”لیکن قاسم خان تم۔۔۔۔۔“

”میں تم سے رخصت ہونے کے بعد کی پوری کہانی تمہیں سنا رہا ہوں، فکر مت کرو، باہر بلا کا طوفان ہے ایسا خوفناک طوفان کے چٹانیں تک اڑی جا رہی ہیں وہ تو یہ

گیا تھا، میں نے ان چاروں آدمیوں کو بعد میں دیکھا تھا جنہوں نے تم پر گولیاں برسائی تھیں۔ بہر حال میں اپنی جگہ سے غائب ہو گیا آگے بڑھتے ہوئے میں نے ایک چٹان پر آڑ میں پناہ لے لی تھی۔ اس وقت اتنا موقع بھی نہیں تھا کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ جس جگہ میں پوشیدہ تھا وہاں سے چٹان کے پیچھے کا منظر نظر نہیں آتا تھا چنانچہ مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم کس طرح ان کا شکار ہوئے۔ اس لڑکی کو بھی میں نے نظر انداز کر دیا تھا جس نے یہ مصیبت کھڑی کی تھی اور جو ہمارے لئے عذاب کی دہائی بنی تھی۔ میں نے اس وقت تمہیں دیکھا جب وہ تمہیں اس جگہ سے گھسیٹ کر لارہے تھے حالانکہ میرے لئے وہ لمحات برداشت کرنا بے حد مشکل کام تھا میں چاہتا تو ان تیرہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا لیکن میں کھیل خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اگر میں ناکام رہا تو پھر تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ چنانچہ میں نے عقل سے کام لے کر غامض سے یہ منظر دیکھا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کی بستی زیادہ دور نہیں ہے اونچے پتے مکانات اور جھونپڑے صاف نظر آ رہے تھے۔ تمہارے بارے میں مجھے یہ اندازہ تھا کہ تمہیں گولی نہیں لگی ہے، بہر حال میں اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا پھر یہ ان دونوں لاشوں کو دیکھنے لگا جو تمہارے شکار ہوئے تھے لیکن ان میں سے ایک اپنی ساتھی کی گولی کا نشانہ بنا تھا اس کے بعد جب وہ لوگ تمہیں لے کر کافی دور نکل گئے تو میں پھرتی سے اپنی جگہ سے نکل آیا اور اسی سمت دوڑنے لگا جہاں وہ دونوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ان دونوں کی صورتیں دیکھیں ایک کے سر میں گولی لگی تھی اس لئے اس کے سر کے چھیتھڑے اڑ گئے تھے اور چہرہ بری طرح بگڑ گیا وہ دوسرے کو وہ گولی لگی تھی جو تم نے چلائی تھی اور یہ گولی سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی اس لئے وہ شخص ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دفن دیکھا اس کی شکل کا تجزیہ کیا اور پھر میں نے اس کا لباس اس کے بدن سے اتار لیا چونکہ یہ لوگ ایک ہی طرح کے لباس پہنے ہوئے تھے اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لباس کسی خاص اہمیت کے حامل ہیں میں نے اس کا لباس اتار کر خود اپنے جسم پہنا اور اس کے جسم سے بننے والے خون کو اپنے چہرے پر جگہ جگہ مل لیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس کی لاش اٹھائی اور اسے لئے ہوئے ایک سمت چل

پڑا، مجھے کسی ایسی مناسب جگہ کی تلاش تھی جہاں اس لاش کو ضائع کیا جاسکے اور پھر میں نے اس کی لاش اس جھیل میں ڈبو دی، میں نے لاش کے ساتھ بڑے بڑے پتھر باندھ دیئے تھے اور لاش گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں واپس پلٹا اور تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا، جہاں تھوڑی دیر قبل وہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا خون اب بھی زمین پر پڑا ہوا تھا چنانچہ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اپنی پیشانی پر رگڑ دیا۔ میری پیشانی کی کھال جگہ جگہ سے ادھر گئی اور میرے مصنوعی خون میں اصلی خون بھی شامل ہو گیا، حالانکہ زخم لگانا آسان کام نہیں تھا تم اب بھی اس کے نشانات میرے چہرے پر دیکھ سکتے ہو لیکن جو کچھ میں سوچ رہا تھا وہ میرے لئے بڑا کارآمد ہو سکتا تھا جس شخص کا روپ میں نے دھارا تھا اس شخص کا نام مجھے نہیں معلوم تھا لیکن اس وقت یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا، چنانچہ میں اسی جگہ بیٹھا رہا، مجھے یقین تھا کہ تمہیں لے جانے والے واپس ضرور آئیں گے اور ان لاشوں کو یہاں سے اٹھا کر لے جانے کی کوشش ضرور کریں گی چنانچہ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے دور سے ان لوگوں کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا وہ یقیناً صورت حال معلوم کرنے کے بعد انہی لوگوں کو اٹھانے کے لئے آئے تھے چنانچہ میں اطمینان سے اوندھے منہ زمیں پر لیٹ گیا مجھے یقین تھا کہ لڑکی اس بات کی تصدیق نہیں کر سکے گی کہ یہ شخص بھی مر گیا تھا کیونکہ میں نے لڑکی کو ان لاشوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں زمین پر اوندھا پڑا رہا اور تھوڑی دیر کی بعد وہ لوگ میرے نزدیک پہنچ گئے، وہ سب چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، پھر میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی، کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا خاصی موٹی اور بھونڈی آواز تھی لیکن اس وقت میں کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا انہوں نے دوسرے کے ساتھ مجھے بھی سیدھا کیا اور پھر ان میں کوئی چیخا۔

”یہ زندہ ہے..... یہ زندہ ہے اس کے سر میں صرف زخم ہے۔ اٹھاؤ اسے جلدی سے لے چلو تاکہ اس کا علاج کیا جاسکے۔ پھر کچھ لوگوں نے مجھے ہاتھوں پر اٹھا لیا، میرا کام پورا ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ”معبود کریم یہ لوگ مجھے پہچاننے نہ پائیں۔“ لیکن بہر حال میں خطرات کی آغوش میں جا رہا تھا۔

وہ لوگ مجھے اٹھائے ہوئے ایک کشادہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے، میں نے آنکھوں میں جھری پیدا کر کے جھونپڑے کا ماحول دیکھا اور مجھے ایک دم احساس ہو گیا کہ یہ کوئی حکیم یا وید ہے جو یہاں موجود ہے اس کی داڑھی سفید نقوش بھدیرے اور چہرہ بے حد خوفناک تھا اس نے میرا زخم دیکھا پھر بڑبڑایا۔

”نہیں، زخم تو گہرا نہیں ہے پھر یہ بے ہوشی کیسی ہے؟“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھے نے میرے زخم کو صاف کر کے اس پر کچھ دوائیں لگائیں پھر ہرے رنگ کے کچھ پتے میرے چہرے پر رکھے اور اس کے بعد کوئی چیز اس پر چپکا دی، ان میں سے کسی نے پوچھا۔

”کیا ہم اسے اس کے جھونپڑے میں پہنچا دیں؟“

”ہاں اگر کوئی اور بات ہو تو میرے پاس لے آنا۔“

ایک باو پھر مجھے اٹھایا گیا اور ایک دوسرے جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا یہاں انہوں نے مجھے لٹا دیا تھا اور پھر وہ سب باہر نکل گئے، جھونپڑے کو خالی دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ابھی مجھے پہچانا نہیں جاسکا۔ پھر بھی میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا۔

”ہومان کا خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی اور تکلیف ہو جائے۔“ مجھے پتہ چل گیا کہ میرا نام ہومان ہے۔ دوسرے نے کہا۔

”بے چارہ زخمی ہو گیا، اس کی بد نصیبی اسے پہاڑوں میں لائی تھی لیکن اب اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔“ میں ان لوگوں کی باتوں پر غور کر رہا تھا ان کے دوسرے جملے میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے، ہومان کی بد نصیبی اسے کہاں سے پہاڑوں میں لائی تھی کیا وہ کہیں دور سے آیا تھا مگر کہاں سے، لیکن اس سوال کا جواب حاصل کرنا ضروری نہیں تھا البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی تو میرا جاننے والا ضرور ہو گا یہاں تک تو آگیا ہوں اور ابھی تک کسی کو شک نہیں ہوا لیکن شاید زیادہ دیر تک میں ان لوگوں کو بے وقوف نہ بنا سکوں، دو تین گھنٹے گزر گئے کوئی میرے جھونپڑے میں نہیں آیا تھا، پھر شام ہو گئی۔ شام کے بعد آکر کسی نے میرے جھونپڑے میں روشنی کی میں بستر پر لیٹا اسے دیکھتا رہا مجھے ایک لمحے کے اندر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے، روشنی جلا کر

اس نے مجھے دیکھا اور پھر میرے پاس آگئی، میں نے اب بے ہوش پڑے رہنے کی اداکاری نہیں کی تھی، عورت نے مجھے دیکھا اور بولی۔

”کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ میری شناسا ہو گی لیکن اس کے چہرے کی سرد مہری اور اس کا لہجہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ ہومان کو نہیں جانتی، میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور عورت چلی گئی۔ رات کو جھونپڑے کے باہر خاموشی چھا گئی تھی میں بہر حال اس طرح یہاں آرام تو نہیں کر سکتا تھا مجھے تمہاری بے حد فکر تھی شہباز، یقین کرو یا نہ کرو بہر حال اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے خاموشی سے باہر جھانکا ماحول سنان تھا اور قبیلے کے مکین آرام کی نیند سو رہے تھے، میں خاموشی سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد میں نے وہاں سے باہر جانے والے راستے اختیار کئے جہاں تک ممکن ہو سکا میں ان کی نگاہوں سے بچ کر سفر کرتا رہا، ویسے ایک بات بتاؤں، شہباز اس وحشی قبیلے کا طرز زندگی بہت ہی اعلیٰ تھا اور میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا ان میں ایک ترتیب نظر آتی تھی، مکانات بھی مضبوط اور سلیقے سے بنے ہوئے تھے بہر حال میں ایک میدان میں پہنچ گیا یہاں مجھے دور دور تک مخصوص طرز کے پنجرے پھیلے ہوئے دکھائی دیئے لیکن میں ان پنجروں کے درمیان تمہیں تلاش نہیں کر سکا۔ میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ یہاں کے رہنے والے ایک دوسرے پر توجہ نہیں دیتے، اس چمقل قدمی کے دوران کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں ہوا تھا، بہر حال کچھ عجیب نیم وحشی سی فضا تھی پھر اس علاقے میں نکل آیا جسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا، دور ہی سے جانوروں کی ہولناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں البتہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ جانور قیدی بنائے گئے ہیں، یہ جانوروں کا قید خانہ تھا اس قید خانے کے پاس چار آدمی آگ روشن کئے ہوئے بیٹھے تھے ان میں سے ایک نے مجھے دیکھا اور بولا۔

”آؤ شاید تم گشت پر ہو؟“

”نہیں۔۔۔ میں اپنی بھیڑ تلاش کر رہا ہوں۔“

”بھیڑ؟“

”ہاں۔“

”مگر وہ ادھر کہاں سے آگئی؟“

”مجھ سے عشق لڑا رہی تھی کبخت دھوکا دے کر بھاگ آئی۔“

”کیا؟“ وہ سب ہنس پڑے۔

”ہاں، وہ میری محبوبہ تھی۔“

”بھیز؟“

”ارے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”تم اپنی محبوبہ کو بھیڑکتے ہو؟“

”نہیں میں اپنی بھیڑ کو محبوبہ کہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سمجھ گئے..... سمجھ گئے ہم لوگ، کیوں بھی سمجھ گئے نا تم۔“

”ہاں، یہ نشے میں ہے، خیر فکر مت کرو، جاؤ اپنی جھوپڑی میں جا کر سو جاؤ،

تمہاری محبوبہ وہیں پہنچ جائے گی۔“

میں خاموشی سے گردن جھکا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا وہ لوگ ہنس رہے تھے

لیکن یہ ایک تجربہ تھا خاص طور سے تجربہ کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی صورت پر کوئی

توجہ نہیں دیتے، یہ بات میرے لئے باعث اطمینان تھی اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ

کم از کم میں تھوڑا بہت وقت ان لوگوں کے درمیان گزار سکوں گا، البتہ میں واپس

اپنے جھوپڑے میں نہیں آیا، بلکہ ایک اور جگہ بیٹھ کر ان حالات کے بارے میں

سوچنے لگا تھا۔

اپنی اس آزادی کو میں ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتا تھا اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس

ہو گیا تھا کہ میری شخصیت کسی خطرہ میں نہیں ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ شہباز لیکن

میری ذہنی کیفیت بالکل بہتر نہیں تھی میں اپنی جگہ بیٹھ سوچ رہا تھا کہ تم پر نجانے کیا

ہوئی ہے۔ میں بہت پریشان تھا تمہارا لئے اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا

چاہئے۔ وہ چنبرے میرے ذہن میں اچھے ہوئے تھے میں انہیں بہت قریب سے تو نہیں

دیکھ سکا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں وحشی جانور موجود ہیں خطرناک اور

خونخوار لیکن کیوں آخر کیوں؟ ایک بار پھر میں سے اب چنبروں کا چارہ لینے کا فیصلہ کیا

لیکن اس بار میں محتاط انداز میں یہ ہم کر چاہتا تھا کہ میں ان کے قریب نہیں پہنچ سکا

پھر بھی میں نے یہ دیکھ لیا کہ میری توقع کے مطابق وہاں وحشی جانور بند ہیں اور

انسان بھی۔ اس سے زیادہ کیونکہ میں فوری طور پر کچھ نہیں کر سکا تھا لیکن میں

یہ دیکھنا چاہا کہ اپنے جھوپڑے میں مجھے تحفظ حاصل ہے یا نہیں، کہیں ایسا تو نہیں

کہ ان لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا ہو، چنانچہ تجربے کے طور پر میں نے اپنے

پہرے کا رخ کیا تھا اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ میری شخصیت بالکل مستحکم

بہت سے افراد نے مجھے دیکھا، بلکہ مجھ سے میرا احوال پوچھا لیکن کسی نے بھی کوئی

بات نہیں کی جس سے مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ مجھے اجنبی سمجھ رہے ہیں۔ وہ

نہیں جس کا نام ہومان تھا اور میں نے جس کا روپ دھارا تھا اس کے بارے میں مجھے

ہوا تھا کہ وہ نیا نیا آیا ہے اور تمام لوگوں سے اس کی بہترین شناسائی نہیں ہوئی ہے،

انے والوں کے بارے میں البتہ مجھے اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں سے

آئے ہیں ممکن ہے ان کا تعلق کسی دوسرے قبیلے سے ہو اور وہ یہاں آ کر آباد ہو رہے

ہوں، البتہ یہ بات بھی بالکل درست تھی شہباز کہ وہ لوگ مجھے اپنی شکل و صورت

سندالینے نظر آ رہے تھے یعنی بہتر شکل و صورت کے مالک اور کسی حد تک

مالک، کچھ لوگوں سے میری شناسائی تھی یعنی ہومان کی حیثیت سے مجھے جانتے تھے

ان ایسے لوگ بھی میری طرف سے مشکوک نہیں ہوئے۔ ہاں ان میں سے ایک نے

یاد وہ تھا جس نے میری پیشانی پر پٹی باندھی تھی مجھ سے میری خیریت کے بارے میں

پوچھا تھا میرے زخم کی تفصیل جانی تھی پھر اس نے میری پیشانی کی پٹی بھی کھول کر

لمبی لیکن میں نے اس سے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی اور اس نے افسوس بھرے

ہاتھوں سے

”افسوس سر کی چوٹ نے ہومان کا ذہن متاثر کیا ہے۔“ یہ بات اس نے چند افراد

سے کہی تھی اور وہ ایک دوسرے سے کہتے پھرے گئے۔ پھر مجھے ایک دراز قامت

لڑکے کے سامنے پیش کیا گیا جو یہاں نہیں تھا۔ وہ ایک تھا۔ انتہائی خونخوار شکل و

ورت رکھتا تھا وہ لیکن اس نے مجھے دیکھا۔ وہ لیکن اس نے مجھے دیکھا۔ وہ لیکن اس نے

مجھے نہ پہچان سکیں البتہ اس نے میرے زخم دیکھے۔ وہ لیکن اس نے

”تم لوگ نہیں جانتے کہ یہاں ایک بہت بڑا جانور ہے اور وہاں دوسرے

بڑی اہمیت رکھتا ہے تم اس بات کو ذہن میں رکھو کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔
پائے۔“

بہر حال اس کے بعد میں یہاں کارروائیاں کرتا رہا میرا کام یہی تھا کہ قریب دروازے کے بارے میں معلومات حاصل کروں مجھے بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں وہ سندھالیہ ہی ہیں اور پوری بستی انہی کی ہے۔ پھر میں ایک دن ایک ایسے علاقے میں جا نکلا جہاں اونچی اونچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں یہاں بہت سے لوگوں کی ذمہ داریاں پہرے کے طور پر لگائی گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور ان میں سے دو تین میرے پاس پہنچ گئے، ان میں سے ایک نے کہا۔

”یہ ہومان ہے میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔“
”ہومان تم اس طرف کیسے آئے؟“

”میری محبوبہ بھاگ گئی ہے۔“ ہومان نے جواب دیا۔

”بیٹھو بیٹھو، کوئی بتا رہا تھا کہ تم اپنی بھیڑ کو محبوبہ کہتے ہو۔“

تب میں انہیں کہانیاں سناتے لگا، میں نے انہیں اس بھیڑ کی کہانی سنائی جو بہت خوبصورت تھی جس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی مانند تھے اور جس کی آنکھیں اور جس کا جسم سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ قہقہے لگاتے رہے انہوں نے میری خوب خاطر مدارت کی، اس کے بعد انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا اور میں ان پہاڑیوں میں بھٹکتا رہا، میں ان چٹانوں کے درمیان ہوتا ہوا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے میں ان پہاڑوں کا نظارہ کر سکتا تھا لیکن یہاں میں نے ایک چٹان دیکھی جس کے نشیب میں کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے، مجھے حیرانی ہوئی، نیم وحشی نظر آنے والے یہ لوگ درحقیقت اتنے وحشی نہیں تھے۔ سندھالیوں میں ایک خاص بات محسوس کی تھی میں نے وہ یہ کہ وہ ذہین ہیں اور مقامی باشندوں کی طرح بے وقوف نہیں، یہ رات میں نے وہیں گزاری اور اس وقت میں ایک چٹان کے عقب میں سو رہا تھا کہ مجھے کچھ نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں اور میں چونک کر جاگ گیا، یہ آوازیں چٹان کی دوسری جانب سے آرہی تھیں، وہیں میں نے چند لوگوں کو دیکھا یہ بھی مقامی باشندے تھے اور وہ عورتیں انہی کی ساتھ تھیں وہ چٹانوں کی نشیب میں ایک چھوٹے سے چشمے کے پانی

سے منہ ہاتھ دھو رہے تھے، میں انہیں دیکھتا رہا پھر میں نے ان کا پیچھا کیا، وہ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں درندوں کے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ میں نے ان کٹھنوں کو دیکھا، ان میں شیر، چیتے، بھیڑیے اور ایسے خوفناک اور خوانخوار جانور بند تھے جو انسانوں کے قاتل ہوتے ہیں ان کی تعداد بھی اتنی تھی کہ تم حیران رہ جاؤ گے بہر حال اس کے بعد تم یہ سمجھ لو کہ میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اور میں اپنے طور پر ایک منصوبہ بندی کرتا رہا، شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ میں ایک باقاعدہ منصوبے پر چل پڑا تھا، میں ہومان کے جھوٹے میں ہی رہ رہا تھا اور مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی پھر اس شام میں ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کر قہوہ پی رہا تھا کہ میری نگاہ اس شخص پر پڑی جسے میں نے عام طور پر ان جانوروں کے پنجرے کے پاس دیکھا تھا یہ ایک چوڑے شانوں والا آدمی تھا اور اپنے چہرے سے بڑا پریشان نظر آ رہا تھا میں اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے مجھے گردن اٹھا کر دیکھا پھر گردن جھکا لی پھر میں اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

”تم کچھ پریشان لگتے ہو بزرگ۔ اور تعجب کی بات ہے کہ تم یہاں تنہا ہو۔“
بوڑھے نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر گردن جھکا لی۔

”تم یہاں قہوہ پینے آئے ہو اور قہوہ پیو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“
”جی نہیں چاہتا اور پھر تمہاری شخصیت میں ایک ایسی بات ہے بزرگ، جو میری آنکھوں میں آنسو لا رہی ہے۔“

”کیا؟“ بوڑھا چونک کر بولا۔

”ہاں، تمہاری شکل میرے باپ سے ملتی جلتی ہے۔“

”کیا واقعی؟“ اس بار میں نے بوڑھے کے چہرے پر دلچسپی کے آثار دیکھے تھے۔

”ہاں اور اسی وجہ سے میں یہاں آ گیا ہوں۔“

”تمہارا باپ کہاں رہتا ہے؟“

”آسمانوں میں۔“

”کیا مطلب؟“

”جو کتنا چاہتے ہیں وہ بہت عجیب ہے شاید تم اسے قبول نہ کر سکو۔“

”میں کوشش کروں گا۔“

”ان جانوروں کو آزاد کر دو۔“

”آزاد کر دوں؟“

”ہاں۔“

”مگر کیسے؟“

”بنجروں کے دروازے کھول دو۔“

”یہ بہت خطرناک ہو گا۔“

”کیوں؟“

”آخر وہ وحشی جانور ہیں۔ اور یہاں بے شمار افراد موجود ہیں اور پھر تم کیا سمجھتے

ہو خود میری زندگی خطرے میں نہیں پڑ جائے گی؟“

”اس کی ایک ترکیب ہے۔“

”کیا؟“

”بنجروں کی چھت پر چڑھ کر دروازے کھول دو وہ نکل کر بھاگیں گے کوئی تمہاری

طرف متوجہ نہیں ہو گا لیکن تم سے ایک بات کہوں، شاید تم یقین نہ کرو۔“

”کہو۔“

”یہ آسمانوں کا اشارہ ہے مجھے خواب میں بتایا گیا تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گے اور

بہت سی زندگیوں کے لئے نجات کا راستہ بنو گے۔“

بوڑھے کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے تھے پھر اس نے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو میں دیوتاؤں کی خوشی کے لئے یہ سب کچھ کروں گا اور ڈیر شہباز

لیا آج رات ہونے والا ہے۔“

”کیا؟“ میں قاسم خان کی بات سن کر چونک پڑا۔

”ہاں، آج رات!“ قاسم خان کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی

تھی۔

”وہ مرچکا ہے۔“

”اوہو کب؟“

”بہت عرصہ ہوا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“

”لیکن میں..... میں تمہیں دیکھ کر پاگل ہو گیا ہوں محترم بزرگ۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ تم میرے باپ کے ہم شکل ہو۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں مجھے اپنا باپ بہت یاد آتا ہے تم مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں دیکھ لیا

کروں۔“

”یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے میں ان جانوروں کی نگرانی کرتا ہوں جو بنجروں میں

بند ہیں۔“

”آہ بنجروں میں بند جانور کتنے دکھی لگتے ہیں کیا تمہیں انہیں دیکھ کر افسوس نہیں

ہوتا؟“

”وہ خونخوار درندے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ہر زندگی زندگی ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے میں مانتا ہوں لیکن بہر حال یہ میری ذمہ داری ہے۔“

”بزرگ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسانوں کو انسان رہنا چاہئے، درندگی نہیں کرنی

چاہئے۔“

”اسی میں میری زندگی ہے۔“

”یہ صرف تمہارا خیال ہے۔“

”جہاں تم نہیں جانتے میں ان کا غلام ہوں۔“

”اس لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اپنی زندگی کا غلام ہوتا ہوں۔“

”ہاں بولو!“ قاسم خان مسکراتی نگاہوں سے دیکھ کر مجھے کہنے لگا اور میں ٹھنڈی ہانس لے کر خاموش ہو گیا۔ واقعی مہذب دنیا میں بھی تو ہمارا یہی کام تھا۔ بہر حال انسانی آوازیں بلند ہوتی رہیں، نہ میں جانتا تھا اور نہ قاسم خان۔ نہ ہی دوسرے وہ جو ہمارے ساتھ قیدی تھے لیکن سب کے سب سہمی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے ایک عجیب سی ہنگامہ پرور فضا تھی، دل دہل رہے تھے، ہولناک آوازیں ابھر رہی تھیں انسانوں کا خاتمہ ہو رہا تھا اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سے کون کون ان جانوروں کا شکار ہو رہا ہے۔ بہر حال یہ وحشت ناک فضا ساری رات جاری رہی، سورج کی روشنی ہوئی اور اس کے بعد سناتا چھاتا چلا گیا، ہم سب خاموش تھے، ایک لمحے کے لئے پلک نہیں جھپکی تھی پھر صبح کی روشنی ہوئی تو قاسم خان نے میرے ہاتھ میں ایک راکفل تھا دی اور کارتوسوں کی پیٹی بھی، اس کے اپنے پاس بھی راکفل موجود تھی، میں نے اسے دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”ہمیں باہر نکلنا ہے، رات تو گزار لی، دن تو یہاں نہیں گزارنا، بہر حال ہماری یہ نل نہیں ہے آگے چلنا ہو گا۔“

”لیکن قاسم خان، دوسرے لوگ، تمہارا کیا خیال ہے کیا پنجروں میں بند قیدی ان رندوں کا شکار نہیں ہوئے ہوں گے۔“

قاسم خان نے تعجب سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”شہباز کیا بات ہے؟ تم ان دنوں مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”اور تم مجھے انتہائی غیر سنجیدہ۔“

”کیوں؟“

”میں ایک سنجیدہ سوال کر رہا ہوں۔“

”لیکن وہ عقل سے خالی ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ قبیلے کے لوگ تو آزاد پنچھیوں کے مانند باہر کی زندگی گزار رہے تھے، قیدی پنجروں میں تھے، قیدیوں کو اگر خود ہی پنجروں سے باہر نکل کر جانوروں سے بڑے کا شوق ہوا تو الگ بات ہے ورنہ وہ تو پنجروں میں ہیں اور جانور پنجروں میں داخل

اور قاسم خان کا کہنا بالکل درست ہی ثابت ہوا۔ وہ درحقیقت اپنے معاملات میں مجھ سے آگے نکل گیا تھا اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تھا اور اس نے بڑی سنسنی خیز فضا پیدا کر دی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ اچانک شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی انسانی چیخیں، پھر یہ آواز بڑھ گئی اور انسانی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، لوگ چیخ رہے تھے۔

”بچاؤ.... بچاؤ، یہ جانور کھل گئے، بچاؤ۔“

میں نے قاسم خان کی طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر ایک سبک سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”قاسم خان!“

”ہوں۔“

”یہ تو واقعی....“

”تو تم کیا سمجھتے تھے؟“

”ایک بات بتاؤ قاسم خان؟“

”کیا؟“

”کیا ہم درندے نہیں بن گئے ہیں؟“

”کن معنوں میں کہہ رہے ہو؟“

”مطلب یہ ہے کہ یہ درندے تو انسان کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“

”یہ ان کا کام ہے۔“

”لیکن یہ ہمارے ذریعے ہوا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کیا مہذب دنیا میں ہم...“

کہ کس طرح اپنے آپ کو ہلاکتوں میں ڈالتی ہے اپنے جیسوں کو زندگی سے محروم کرنا اور اس سے خوش ہونا اور اس کے بعد خود موت کا شکار ہو جانا، درندوں نے بھی قیدیوں کی حیثیت سے رہائی پائی تھی اور اپنے قید کرنے والوں کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ایسی لاتعداد لاشیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں جن کی اعضاء درندے چبا گئے تھے۔ زرخرے ادھیڑ ڈالے گئے تھے۔ آنکھیں نکالی گئی تھیں، بازو غائب تھے، ٹانگیں غائب تھیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے کٹے ہوئے بازو اور کٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ زمیں پر گھسٹ رہے تھے اور زندگی تلاش کر رہے تھے جبکہ ان پٹانوں میں زندگی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ہم ان کی جانب توجہ نہیں دے سکتے تھے کیونکہ بات کسی ایک کی نہیں تھی۔ قاسم خان نے متاثر لہجے میں کہا۔

”اور اب اس کے بعد اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ گھوڑے تلاش کرو اور جتنی دور نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔ جانوروں کی بھی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ گھوڑے وغیرہ بھی بے چارے مارے مارے پھر رہے تھے بعض گھوڑے بھی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے ایک گھوڑے کو دیکھا کسی وحشی درندے نے اس کے بازو کا پورا گوشت چبا ڈالا تھا اور وہ لنگڑا لنگڑا کر ایک ایک قدم آگے بڑھا رہا تھا لیکن ہمیں ایسے چاک و چوبند گھوڑے مل گئے جو ہمارے لئے سواری کا کام دے سکتے تھے، جانور بھی انسانوں سے خاصا مانوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے وہ جانور جس کا انسانوں سے براہ راست تعلق رہتا ہو۔ ان دو گھوڑوں نے اپنے پیروں پر چلنے والے دو افراد کو دیکھا تو خود ہمارے قریب پہنچ گئے اور ہمیں اپنی سواری کی پیشکش کر دی۔ جیسے کہنا چاہتے ہوں جلدی چلو۔ یہاں سے دور نکل چلو اور ہم نے ان کی اس فرمائش پر عمل کیا تھا۔ ان کی پشت پر سوار ہو کر ہم نے انہیں دوڑا دیا اور اس وحشت ناک ماحول سے دور جانے کی کوشش کرنے لگے اس وقت یہ بستی موت کی بستی تھی، ان قیدی غلاموں کا بھی ہم جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ جن میں کچھ ابھی تک پنجروں میں قید تھے لیکن یہ بھی دیکھا تھا ہم نے کہ وہ پنجرے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بہر حال قدرت نے انسان کو بڑی طاقت بخشی ہے وہ اپنے تحفظ کے لئے کچھ نہ

نہیں ہو سکتے، وہ تو پنجروں سے نکلے ہیں اور کھلی فضا میں اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے ہوں گے، ہاں اگر قیدیوں نے فوراً بھاگنے کی کوشش کی تو پھر دوسری بات ہے۔“ میں واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔ قاسم خان ٹھیک تو کہہ رہا تھا پھر قاسم خان نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے قیدیوں سے کہا۔

”تم لوگ باہر نکلو گے، محافظوں کا اسلحہ پڑا ہوا ہو گا اگر وہ ہلاک ہو گئے ہوں گے تو یہ اسلحہ لے کر تم اپنی حفاظت کرتے ہوئے یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرو، کیا سمجھتے؟“

اس کے بعد اس نے وہ پنجرے کھول دیے، کیونکہ وہ ایک محافظ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا اس لئے اس کے پاس چابیاں بھی موجود تھیں۔ قیدیوں کی آزادی سب سے زیادہ اچھی محسوس ہوئی، پھر کچھ اور چیخیں سنائی دیں غالباً یہ وہ محافظ تھے جو درندوں سے بچ کر یہاں ان غاروں میں آچھے تھے اور اس وقت قطعی اس قابل نہیں تھی کہ قیدیوں سے مقابلہ کریں لیکن زیادہ تر وہ تھے جنہوں نے قیدیوں پر مظالم ڈھائے تھے اور یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے تو دوسرا اپنی باری کا انتظار کرتا ہے اور وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ خونخوار ہوتا ہے، کچھ فائر ہوئے کچھ دھماکے ہوئے اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی، میں اور قاسم خان صبر و سکون کے ساتھ گزرنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے، ہمیں جلدی نہیں تھی اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ تھوڑا سا وقت گزر جائے، ماحول کچھ سازگار ہو تو باہر کی صورت حال کا جائزہ لیں اور اس کے لئے ہم نے آدھے دن کا انتظار کیا۔ یہاں وقت کے اندازے تو سو گئے تھے، وقت کی ساری تفصیلات سورج کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتی تھی، ہمارے اندازے کے مطابق اس وقت دن کے کوئی بارہ بجے ہوں گے جب ہم رائفلیں سنبھالے ہوئے باہر نکلے۔ غار کے دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ریچھ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں پہروں کے بل کھڑے سر کھیا رہے تھے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ کدھر کا رخ اختیار کیا جائے۔ اب یہ ان کی بد قسمتی تھی کہ ہمارا راستہ انہوں نے روکا تھا چنانچہ میں نے اور قاسم خان دونوں نے گولیاں چلائیں اور ریچھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم باہر نکل آئے تھے اور باہر کا منظر درحقیقت ایسا تھا کہ عبرت ہوتی تھی کہ انسانی زندگی بھی کیا چیز ہے؟

نہیں پھر میں بھی قاسم خان کی طرح سونے کی کوشش کرنے لگا، نیند بہت سے احساسات کو سلا دیتی ہے، میں بھی سو گیا، پھر اس وقت جاگا جب آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور زمیں پر چاندنی کا سمندر بہہ رہا تھا، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ قاسم خان میرے پاس موجود نہیں ہے پھر اچانک ہی دور سے اس کی آواز سنائی دی۔

”شہباز! اگر تم جاگ گئے ہو تو اس طرف آ جاؤ ادھر اپنی داہنی سمت۔“

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا دور سے مجھے چاندنی میں قاسم خان نظر آ رہا تھا یک جگہ بیٹھا ہوا نجانے کیا کر رہا تھا دور کافی فاصلے پر دونوں گھوڑے پیٹ بھرنے کے بعد آرام سے زمین پر بیٹھے ہوئے سو رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ لذت نے انسانوں ہی سے نہیں جانوروں سے بھی ان کی خوراک دینے کا وعدہ کیا ہے در کہیں کہیں یہ بے زبان انسانوں پر فوقیت حاصل کر جاتے ہیں کیونکہ یہ کسی سے انک نہیں سکتے، چھین نہیں سکتے۔

میں اٹھ کر قاسم خان کی طرف چل پڑا اور چند لمحات کی بعد اس کے پاس پہنچ گیا میں نے دیکھا کہ قاسم خان ایک بڑا سا بالہ ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ کھا رہا ہے میں بڑان ہو گیا، قاسم خان کو کھانے پینے کی یہ چیز کہاں سے مل گئی لیکن پھر میں نے غور سے دیکھا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے واقعی خوشی ہوئی تھی یہ تربوز کی ٹیل تھی جو خاصے بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں درمیانے سائز کے تربوز لگے ہوئے تھے۔ بکے اور کھانے کے لئے تیار تربوز، بلاشبہ قدرت کی نعمتوں کا ہی بھی جگہ تعین کر لیا جائے انسان کے پاس شکر کے الفاظ ناکافی ہوتے ہیں۔ تربوز علم سیری کے لئے بہترین، بھوک اور پیاس کا انتہائی معقول انتظام ہوتا ہے۔ میں قاسم خان کے پاس بیٹھ گیا اور قاسم خان نے برابر رکھا ہوا ایک تربوز اٹھا کر میرے ہاتھ میں سے دیا اور پھر کا ایک نوک دار ٹکڑا، اور مجھ سے کہنے لگا۔

”اسے درمیان سے کاؤ، ہاتھ ہی سے کھانا پڑے گا۔“

میں نے وہ تربوز اس کے ہاتھ سے لے لیا، جانوروں کی طرح کھانا بھی کبھی کبھی کس قدر دلکش لگتا ہے، تربوز کا آدھا ٹکڑا توڑ کر میں نے برابر رکھا اور باقی میں انگلیاں داخل کر دیں اور اس کے بعد میں بھی وحشیوں کی طرح تربوز کا سرخ گودا کھانے لگا جو

کچھ کر ہی لیتا ہے ہماری کاوشوں نے ان قیدیوں کو قید کی مشکل سے نکال دیا تھا اب اس کے بعد زندگی بچانا ان کا اپنا کام تھا چنانچہ ہم نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ سمتوں کا تعین تو کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ بس جدھر منہ اٹھے تاحد نظر پتھر کی چٹانیں، پتھریلے میدان کہیں درخت، کہیں ریگستان، گھوڑے بھی شاید انتہائی خوفزدہ تھے اور ان کی یہی خواہش تھی کہ درندوں کی بستیوں سے دور نکل جلیا جائے۔ چنانچہ وہ بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا، سر پر دھوپ، نیچے پتھرلی زمین، لیکن گھوڑوں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ سورج ڈوبا تو ہوائیں ٹھنڈی ہو گئیں اور ان ٹھنڈی ہواؤں میں ہمیں ایک ہلکا سا جنگل نظر آیا گھوڑوں نے خود بخود اپنا رخ تبدیل کر دیا تھا ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آرہی تھی بہر حال ہم جنگل میں داخل ہو گئے، یہ بہت ہی معمولی سا جنگل تھا درخت بھی زیادہ گھنے نہیں تھے بس ہلکی ہلکی چھاؤں لیکن اب چونکہ سورج ڈھل گیا تھا اس لئے چھاؤں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی البتہ گھوڑوں کے لئے یہاں نہایت معقول بندوبست تھا اور ہم نے انہیں چھوڑ دیا، سب کچھ تقدیر کے حوالے تھا، قیدی انسانوں کی گرفت میں تھے یہ جانور بھی اگر وفا کا خیال رکھیں تو واپس ہمارے پاس آجائیں گے، آزادی چاہتے ہیں تو ہمیں حق حاصل نہیں کہ ان کی آزادی ان سے چھین لیں۔ چونکہ پورا دن گھوڑوں کی پشت پر گزرا تھا، ساری رات جاگتے رہے تھے اس لئے قاسم خان نے کہا۔

”شہباز بہتر یہ ہے کہ آرام کے لئے کوئی جگہ تلاش کی جائے۔“ میں نے ایک سمت اشارہ کیا یہاں بہت ہی لمبی لمبی گھاس تھی اور ایک درخت اس طرح اس گھاس پر سایہ کئے ہوئے تھا کہ جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کو دھوپ سے بچانے کے لئے اپنے دوپٹے کی چھاؤں میں لے لیتی ہے، یہی جگہ ہمارے لئے بہتر تھی، قاسم خان پر تو کچھ ایسی نیند طاری تھی کہ لیٹتے ہی سو گیا لیکن مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی، گھوڑے کی پشت پر ہڈیاں کڑکڑا گئی تھیں، میں لیٹ کر سوچنے لگا کہ کھانے پینے کا یہاں کوئی بندوبست نہیں ہے، دور دور تک نگاہیں دوڑا لی تھیں ایسے موقعوں پر ناریل کے درخت قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہوتے ہیں اور صحراؤں میں موجود نخلستان انسانی زندگی کو خوشیوں کی خبر سناتے ہیں لیکن یہاں وہ سب کچھ نہیں تھا میں نے نگاہیں دوڑا

معدے میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ٹھنڈک سارے وجود میں اتر گئی ہو اور اس کے بعد ہم تریز کھانے میں مصروف ہو گئے۔

غذا انسان کے لئے زندگی کا درجہ رکھتی ہے دل چاہ رہا تھا کہ یہ ٹھنڈی اور میٹھی شے جس قدر یہاں موجود ہے وجود میں اتار لی جائے، قاسم خان اپنے طور پر مصروف تھا، میں آگے بڑھا اور میں نے ایک تریز کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اچانک ہی میں نے دیکھا کہ تریز میں انسانی نقوش نمودار ہو گئے ہیں، بڑی تفصیل کے ساتھ یہ نقوش ابھرتے چلے آ رہے تھے، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تریز کو دیکھا، تیل میں لگا ہوا تھا، زمیں پر پھیلا ہوا تھا لیکن اس میں نمودار ہونے والے نقوش اس قدر واضح تھے کہ میں حیران رہ گیا، قاسم خان کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اہم بات ہو گئی ہے، مجھے ایک دم خاموش پا کر وہ میرے قریب آ گیا اور بولا۔

”کیا بات ہے؟“

لیکن بات بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ اسے بھی نظر آ رہا تھا اس کے منہ سے تریز کے بکڑے باہر نکل آئے اب جو نقوش نمودار ہوئے تھے وہ ایک شناسائی اختیار کرتے جا رہے تھے، سو فیصدی پروفیسر لنگونا تھا جو اپنے نقوش مکمل کر چکا تھا پھر اس کی آنکھیں کھلیں اور اس کے ہونٹ ہلنے لگے، اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے اب تک جو کچھ دیکھتے آ رہے ہو اسے دیکھ کر بھی اگر کسی اجنبی بات پر تمہارے اندر حیرانی کا تصور پیدا ہو تو میں سمجھتا ہوں یہ ایک انوکھی بات ہے۔“

ہم دونوں کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی تو پروفیسر لنگونا کی آواز ابھری۔

”اور شاید تمہارے ذہن میں یہ تصور نہ ہو کہ تمہاری ہر جنبش ماضی کی تاریخ بدل رہی ہے جو کچھ کر کے آ رہے ہو وہی تو ضرورت ہے اور یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا ایک بھی قدم غلط راستوں کی سمت ہے تم تو اس وقت وادی سحر کی آنکھوں کا تارا ہو، کیا سمجھ۔ بہت ہی اہمیت رکھتے ہو تم اپنے عمل میں اور ایک لمحہ بھی اپنا ضائع مت سمجھنا، تم نے وہی کیا ہے جو میں چاہتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ کرنے جا

رہے ہو وہی حرف آخر ہے بس سدا لیئے جو یہاں اپنا سحر قائم کر رہے ہیں ان کے سحر کو مسلسل ضرپیں لگ رہی ہیں جو بستی جانوروں نے تباہ کی اس کی تباہی نے ان کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہے اور اب وہ منتشر ہو رہے ہیں۔ خوف کے عالم میں اور سنو تمہیں اب اس کے بعد مغرب کی جانب سفر کرنا ہے۔ لیکن اجنبیوں کی طرح نہیں بلکہ ہوش مندوں کی مانند اور دشمن تو تمہارے یہاں پیدا ہو ہی گئے ہیں، ماضی سے لے کر حال تک، اور ہوشیار رہنا بھی ضروری ہے یہ نہ سمجھنا کہ ماضی کا کوئی عمل تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جو تم پر وار کرے اس پر وار کرو اور جو تم سے دوستی کرے تم اس سے دوستی کرو، اور ابھی چند افراد ایسے ملیں گے جن میں سے ایک شاہ رو ہے، دوسرا کاشل اور یہ دونوں تمہیں مدد دیں گے اور تمہارے شناسا بھی ہوں گے یعنی اجنبی نہ ہوں گے وہ یا ان کے ساتھ جو بھی ہوں، وہ سب تمہیں تمہارے نام ہی سے پکاریں گے یعنی شہباز اور قاسم۔ وہ تمہارے مکمل طور پر شناسا ہوں گے اور ہوا یوں ہے کہ کچھ خطرناک جو بعد میں تمہارے سامنے آئیں گے تمہاری طرف سے ہوشیار ہو گئے ہیں اور تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، بس اتنا ہی کہنا چاہتا تھا میں اور جہاں تک تمہاری ضیافت کا تعلق ہے اور ضرورت پوری کرنے کا تو تریز کی یہ بلیں اب تمہیں جگہ جگہ ملیں گی اور دوسرے پھل بھی۔ کیونکہ تم نے ایسے پھل اپنے لئے تلاش کر لئے ہیں، اپنے گھوڑوں پر آگے بڑھو اور مقصد کی تکمیل میں دیر نہ لگاؤ، تو پھر.....“

میں نے قاسم خان کی طرف دیکھا اور قاسم خان نے کہا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور صرف عمل کر رہے ہیں لیکن یہ تو بتا دو کہ آخر مشکلات کی یہ بری گھڑیاں کب تک ہم پر مسلط رہیں گی؟“

تریز کے نقوش غائب ہو گئے۔ قاسم خان نے غصیلی نگاہوں سے اس طرف دیکھا یہ بھی ایک حیران کن بات تھی کہ ایسا ناقابل یقین منظر دیکھنے کے باوجود اب ہم پر خوف کا کوئی تصور طاری نہیں ہوا تھا اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ ہم اس سے زیادہ بھیانک حالات سے گزر چکے تھے۔

تریز کھا کھا کر ہم شکم سیر ہو گئے تو قاسم خان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

ہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور ایک دم خاموشی چھا گئی، گولیاں چلنا بند ہو گئی تھیں اور ایک طویل خاموشی ماحول کو زخمی کر رہی تھی۔ دھننا، ہی شاہ رو نے کہا۔

”یوں لگتا ہے جیسے کسی کے مرجانے کے بعد ان کی قیادت ختم ہو گئی ہو۔“
”ہو سکتا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاموش رہ کر یہ انتظار کر رہے ہوں کہ ہم چٹانوں کی آڑ سے نکل آئیں۔“

”میں اس سے انکار نہیں کرتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ دیر اور انتظار کر لیا جائے اس کے بعد دیکھیں گے۔“

پھر ہم کافی دیر تک چھپے بیٹھے رہے تھے اور کچھ لمحوں کے بعد آخر کار ہم وہاں سے نکل آئے مجھے سب سے زیادہ تجسس اس بات کا تھا کہ میں نے جس شخص کو ہلاک کیا ہے اس کی لاش ہے یا نہیں۔ یا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا، بہرحال چاروں طرف دیکھتا ہوا میں وہاں پہنچ گیا اور پھر میں نے اس جگہ نگاہ دوڑائی، جہاں میں نے فاز کیا تھا اور ایک زخمی لاش کو وہاں ہونا چاہئے تھا، میرا اندازہ بالکل درست نکلا، چٹانوں پر ایک لاش اوندھی پڑی ہوئی تھی جس کی کھوپڑی اڑ گئی تھی لیکن اس کا چہرہ صاف ظاہر تھا۔

”سندالی۔“ شاہ رو نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”لیکن وہ فرار کیوں ہو گئے؟“

”پتہ نہیں، البتہ مجھے حیرانی ہے کہ انہوں نے جم کر مقابلہ کیوں نہیں کیا، ممکن ہے ان کی تعداد بہت کم ہو۔ اور ہماری تعداد کے بارے میں وہ صحیح اندازہ نہ لگا سکے ہوں۔“

”خیر اب جو کچھ بھی ہے ہمیں اپنے گھوڑوں کو تلاش کرنا چاہئے ورنہ انہی چٹانوں میں سر پھوڑتے پھوڑتے مرجائیں گے اور اس بات کا امکان بھی ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش حاصل کرنے کے لئے کچھ وقفے کے بعد یا رات کو کسی وقت دوبارہ آئیں۔“

”میرے ذہن میں تو صرف ایک تصور آتا ہے۔“ شاہ رو نے کہا۔

”اگر تم اجازت دو تو میں اس تربوز کو بھی کھا جاؤں۔ تاکہ جھگڑا ختم ہو۔“ میں ہنس پڑا۔ پھر میں نے کہا۔

”بے کار ہے قاسم خان، ظاہر ہے پروفیسر لنکونا کوئی تربوز نہیں ہے۔“ پھر دوسری صبح ہم نے وہاں سے سفر کا آغاز کر دیا اور زیادہ فاصلہ نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص ہمیں ملا اور اس نے اپنا نام شاہ رو بتایا اس نے کہا کہ وہ اس بستی کا مختصر ترین راستہ جانتا ہے جہاں انہیں جانا ہے اور اگر اس بارے میں لنکونا تصدیق نہیں کر دیتا تو یقینی طور پر ہم اس شخص کی جانب سے مشکوک ہو جاتے اس نے کہا۔

”میں بستی کرامہ کا راستہ اس طرح جانتا ہوں کہ دوسرے نہیں جانتے۔“

”ٹھیک ہے چلو آگے چلو۔“ میں نے کہا لیکن قاسم خان بدستور اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہا، جس راستے سے ہم اس وقت گزر رہے تھے وہ بے حد خطرناک، پتھریلا راستہ تھا، چکنی چٹانوں پر گھوڑوں کے سم پھسل رہے تھے یہ تو اچھی بات تھی کہ یہ گھوڑے انہی علاقوں میں چلنے کی عادی تھے اور ان چکنے پتھروں پر چلنا جانتے تھے لیکن ان کی رفتار بہت سست تھی، پھر ہم ایک ایسے علاقے پر آ گئے جسے عبور کر کے ہمیں دوسری طرف نشیب میں اترنا تھا۔ شاہ رو کے بارے میں چونکہ بتا دیا گیا تھا اس لئے ہم اس کی رہنمائی میں سفر کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کر رہے تھے ابھی گہری کھائی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک کسی جانب سے ایک فاز ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی قاسم خان کے سر سے گزر گئی۔ ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے، گھوڑوں کی رفتار چونکہ سست تھی اس لئے ایک لمحے کے اندر اندر قاسم خان نے گھوڑے کی پشت چھوڑ دی، میں نے اور شاہ رو نے بھی یہی کیا تھا، جان بچانے کے لئے یہی ترکیب سب سے بہتر تھی کہ گھوڑوں کی آڑ سے لی جائے، چند ہی لمحوں کے بعد گولیاں تڑا تڑا برسنے لگیں لیکن اب ہم نے ایسے مورچے بنا لئے تھے کہ یہ گولیاں ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ البتہ گھوڑوں کو چھوڑنا پڑا تھا ورنہ گھوڑوں کی موجودگی ہمارے لئے خطرات کا باعث بن سکتی تھے، گھوڑے بھی جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے میں شاہ رو اور قاسم خان اپنی بندوقیں تان کر بیٹھ گئے اچانک ہی مجھے ایک طرف ایک سر نظر آیا اور میں نے انتہائی احتیاط سے گولی داغ دی۔ ایک ازیت ناک چیخ کی ساتھ

”کیا؟“

”ہو سکتا ہے وہ اس علاقے میں اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں۔“
”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اگر ایسا ہوتا تو وہ پوری کوشش کر کے یہ لاش یہاں سے لے جاتے۔“

”ہو سکتا ہے، لیکن اب مجھے تم اجازت دو تو میں گھوڑے تلاش کر کے لاؤں۔“

شاہ رو واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا تھا، پھر تیل، تندرست اور مستعد، کچھ دیر کے بعد وہ گھوڑے پکڑ لیا اور ہم نے ان گھوڑوں پر سواری کی اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

شاہ رو ہمارا راہبر تھا۔ اگر پروفیسر لنگونا نے اس کی نشاندہی نہ کر دی ہوتی تو شاید اتنی آسانی کے ساتھ ہم اسے قبول نہ کرتے۔

رات ہو گئی۔ آگے برف کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ درخت سفیدی میں نہائے ہوئے کھڑے تھے۔ اور شاہ رو کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی تھی۔

اچانک قاسم خان نے سرگوشی کی۔

”شہباز!“

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ قاسم خان کے لمبے کی تشویش بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔ لیکن کیا!



”یہ شخص یا تو فراڈ ہے..... یا“

”یا..... یا؟“

”خود کسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہے۔“

”کیسی مشکل؟“

”یہ تو وہی بتا سکے گا۔“

”تمہاری ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”کاش میں خود سمجھ سکتا۔“ قاسم خان کے لمبے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ اس

قتل وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”قاسم خان! کیا اس وقت بھی تم مذاق کر سکتے ہو؟“

”یقین کرو۔ میں بالکل مذاق نہیں کر رہا۔“

”پھر کچھ تو بتاؤ..... کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”اسے غور سے دیکھو۔“

”ہاں، انہی کی بات کر رہا ہوں۔“

”اب کیا کریں؟“

”ہمیں تھوڑا سا رخ بدلنا ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور یہ بھی بتا دوں تمہیں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں... میری موت کے بعد... تم سے پہلے مرنا میری زندگی ہے... ورنہ۔۔۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم اس کی بات سے متاثر تھے۔

اندھیرے گہرے ہو گئے تھے۔ مگر ہم ابھی تک اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ تاریکی کی وجہ سے ہمارے گھوڑے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اندھیرا اس قدر ہو گیا کہ اب ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ برف کا طوفان سر پر پہنچ گیا ہے اور اب بھی ہم نے سفر جاری رکھا تو دوسرا دن نہیں دیکھ سکیں گے۔

”شاہ روا!“ میں نے نرمی سے اسے پکارا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ اس کی آواز میں شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا ہم اب بھی آگے بڑھتے رہیں؟“

”میں کیا بتاؤں؟“

”کوئی جگہ ذہن میں ہے؟“

”کیسی جگہ؟“

”جہاں ہم قیام کر سکیں۔“

”آہ! اب تو یہ اندازہ بھی نہیں ہو رہا کہ گھوڑے کون سے راستے پر جا رہے

ہیں۔“

”وہ کسی گہرے کھڈ میں بھی گر سکتے ہیں۔“

”شاید ایسا نہ ہو۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”جانو ہم نے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اور میں خاموش ہو

گیا۔ قاسم خان کی صورت تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کے سانسوں کی پھنکار

”کسے؟“

”افوہ۔ شاہ رو کے سوا ہمارے پاس اور کون ہے۔“ وہ بولا اور میری نظریں شاہ رو کے چہرے پر جم گئیں وہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”شاہ روا!“ میں نے اسے آواز دی اور وہ چونک پڑا۔

”کیا بات ہے؟“

”میں کچھ محسوس کر رہا ہوں۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”یوں لگتا ہے جیسے ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ میرے لمبے میں غراہٹ پیدا ہو گئی۔

”نہیں... اپنے لمبے کو نہ بگاڑو... ان پر اسرار جنگلوں میں اچھے اچھے راستہ بھٹک

جاتے ہیں میں کیا چیز ہوں؟“

”مگر تم تو ہماری راہبری کر رہے تھے؟“

”شرمندگی کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں... ادھو... دیکھو... تیز ہوائیں چلنے لگیں

اور اب...“ اس نے اہملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اب کیا؟“ قاسم خان غرایا۔

”شاید برف کا طوفان آ رہا ہے۔“

”ہم تمہیں اس طوفان میں غرق کر دیں گے۔“ قاسم خان نفرت بھرے لمبے میں

بولا۔

”اس طرح اگر طوفان کو روک سکتے ہو تو ضرور ایسا کرو۔ ویسے اب میرے ذہن

میں ایک بات اور آ رہی ہے۔“

”وہ بھی بک دو۔“

”ان لوگوں نے ہمیں جان بوجھ کر اس طرف دھکیلا ہے۔ ادھو... ضرور انہوں نے

ایسا ہی کیا ہے۔ ہم پر حملہ صرف اسی وجہ سے ہوا تھا اور اس کے بعد وہ خاموشی سے

اپنے ایک آدمی کی زندگی کا نقصان اٹھا کر واپس چلے گئے ہیں۔“

”سندالی؟“ میں نے سوال کیا۔

اور درحقیقت مشعل کی روشنی اس کے چہرے کی رنگت کے سامنے ماند پڑ رہی تھی اس کی چمکدار آنکھیں ہم تینوں کا جائزہ لے رہی تھیں، نجانے کیوں ایک دم ایسا احساس ہوا جیسے طبیعت پر ایک ہشاش سی کیفیت پیدا ہو گئی ہو سوئے ہوئے دماغ جیسے جاگ اٹھے تھے میں نے لڑکی کے ساتھ کھڑے ہوئے بوڑھے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”محترم بزرگ، اس برف کے طوفان میں اگر ہمیں کچھ دیر کے لئے پناہ مل جائے تو موسم کی تیزی ختم ہوتے ہی ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے، ساتھ ہی یہ بھی یقین دلاتے ہیں ہم کہ اپنے میزبان کے لئے کسی تکلیف کا باعث نہیں بنیں گے۔“

”معزز مہمانوں کو میں خوش آمدید کہتا ہوں، تمہارے لئے جگہ موجود ہے، آداب میرانی کچھ ہوتے ہیں، لیکن آداب مہمانی بھی کچھ ہوتے ہیں۔ اگر تم ان کا خیال رکھو گے تو ہمیں بے انتہا خوشی ہوگی۔“

”آپ کا کہنا بالکل درست ہے لیکن یوں لگتا ہے معزز بزرگ جیسے آپ اپنے مہمانوں سے کچھ نقصان اٹھا چکے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہے، میں نے اپنی میزبانی کی خاطر بڑے بڑے دکھ جھیلے ہیں اور اب میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ ہمدردی کر کے نقصان اٹھاؤں۔“ بوڑھے شخص نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”معزز بزرگ! رب عظیم کی قسم ہم آپ کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بنیں گے۔“ اس دوران لڑکی اور بوڑھے کے دوسرے ساتھی بالکل خاموش کھڑے تھے انہوں نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکی کی چمکدار نگاہیں پرشون انداز میں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ بوڑھے نے اپنے ساتھی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا۔

”گھوڑوں کو بہتر جگہ باندھ دو اور ان کے لئے چارہ میا کرو، جانوروں کی ذمہ داری میں تمہارے سپرد کرتا ہوں، مہمانوں کے جانوروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔“ چنانچہ ہم سب گھوڑوں سے اتر آئے، نوجوان نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کی لگائیں تھام لیں اور اس عمارت کے ایک حصے کی جانب چل پڑا تو بوڑھے نے کہا۔

بتاتی تھی کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ اور اس کا بس نہیں چل رہا کہ شاہ رو کو گولی مار دے۔ لیکن میں اس قدر برگشتہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم خاموش رہے تھے۔

پھر اچانک شاہ رو چیخا۔

”وہ دیکھو.... وہ دیکھو۔“

لیکن جو کچھ وہ دکھا رہا تھا وہ ہمیں نظر نہیں آیا تو میں نے کہا۔

”کیا ہے؟“ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”افسوس میں نہیں جانتا کہ ہمارا رخ کس طرف ہے، لیکن چاروں طرف نگاہیں گھما کر دیکھو کیا تمہیں کسی سمت سے روشنی کی ایک کرن نہیں دکھائی دیتی۔“ میرے بجائے قاسم خان نے کہا۔

”ہاں وہ اس طرف روشنی ہے دیکھو۔“ اور پھر مجھے بھی وہ روشنی نظر آ گئی۔

”یہ کیسی روشنی ہو سکتی ہے؟“

”جیسی بھی ہو، لیکن روشنی تو ہے۔“ قاسم خان بولا۔

”کیا کہتے ہو شاہ رو، کیا ہم اس کی طرف چلیں؟“

”ہاں کیوں نہیں؟ آخر یہ روشنی کہیں نہ کہیں سے تو آ رہی ہوگی اور اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ شاید وہ ہمارے لئے ایک پناہ گاہ ہی ثابت ہو، گھوڑے پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے، ہم نے بڑی احتیاط سے اس سمت کا رخ اختیار کر لیا تھا، روشنی کے فاصلے کم ہوتے چلے گئے پھر یوں لگا جیسے روشنی لہرا رہی ہو، پتہ نہیں کیا قصہ تھا لیکن جیسے ہی آہستہ آہستہ ہم قریب پہنچتے گئے ہمیں اس روشنی کے نیچے انسانی سایوں کی موجودگی کا احساس ہوا، یہاں تک کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے جو کوئی قدیم خانقاہ تھی اندازہ یہی ہوتا تھا، ممکن ہے ہمارا خیال غلط ہو، ایک پختہ اور وسیع و عریض عمارت تھی اور اسکی یہ دنی اٹھلان میں تین افراد کھڑے برف باری کا نظارہ کر رہے تھے، ان میں سے ایک، کے ہاتھ میں جلتی مشعل تھی جو دور سے ہم کو امید کی کرن نظر آتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ مشعل ایک دراز قامت دوشیزہ کے ہاتھ میں تھی جس کی دراز قامتی ہی بے مثال تھی لیکن اس کا حسن اس سے بھی زیادہ بے مثال تھا

”آؤ معزز مہمانو! اندر آگ روشن ہے اور تمہیں اس وقت سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔“

ہم سب آگے بڑھ گئے واقعی بوڑھے کا کہنا بالکل درست تھا، وسیع و عریض کرب، آتش دان میں سلگتی ہوئی آگ سے روشن ہو رہا تھا، اور خاصا گرم تھا جبکہ باہر کی سردی ہماری ہڈیوں میں داخل ہو گئی تھی، بوڑھے نے ہم سب کو گہری نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

”وقت نے مجھے اس قدر بد حال کر دیا ہے کہ اب میں کبھی اپنے دروازے پر آنے والوں کو خوش آمدید نہیں کہتا لیکن یہ خوفناک برف باری ہم نے بہت دور سے تمہیں دیکھ لیا تھا، میرا دل نہیں مانا اور میں نے کہا کہ تمہیں اشارہ کر دوں، تب ہم مشعل روشن کر کے تمہیں اس طرف آنے پر دعوت دیتے رہے، ویسے شاید تم لوگوں کے آنے سے پہلے کچھ لوگوں کا ایک گروہ ادھر سے گزرا تھا، میں اپنے تجربے کی روشنی میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کہیں حملہ کرنے جا رہے تھے یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے خادموں کو ہوشیار کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ یہاں رکنا چاہیں تو انہیں یہاں نہ رکنے دیا جائے۔“

بوڑھا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا اس گروہ کے بارے میں سن کر میرے ذہن میں لاتعداد خیالات پیدا ہو گئے تھے پھر بوڑھے نے کہا۔

”آہ کہیں تم وہ لوگ تو نہیں ہو جن پر وہ حملہ آور ہونے گئے تھے؟“

”آپ کا کہنا بالکل درست ہے محترم بزرگ!“ میں نے کہا۔

”لیکن لیکن.... وہ کون تھے؟“

”شاید سندالی؟“ میں نے بوڑھے کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ

میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بوڑھا سندالیوں کا حامی ہے یا نہیں، بوڑھے کے چہرے، ایک لمحے کے لئے دہشت سی پھیل گئی تھی پھر میں نے اس سے سوال کیا۔

”کیا آپ نے یہ اندازہ نہیں لگایا محترم بزرگ کہ وہ سندالیئے ہیں؟“

”غور کیا تھا میں نے۔“

”تو پھر؟“

”سندالیوں کا نام اتنی آسانی سے نہیں لیا جاسکتا۔“

”کیا سندالیوں کی کارروائی ادھر سے ہوتی رہتی ہے؟“ اس بار شاہ رونے پوچھا۔
”میں نہیں جانتا۔“ بوڑھا اس طرح بولا جیسے بات کو ٹالنا چاہتا ہو، وہ کہہ چکا تھا کہ سندالیوں کے نام سے خوفزدہ ہوتا ہے ویسے اس نے اپنے ملازموں کا نام بھی لیا تھا اس کا مطلب تھا کہ یہاں اور بھی لوگ موجود ہیں پھر بوڑھے نے کہا۔

”لیکن تم لوگ کہاں جا رہے تھے؟“

ایک لمحے کے لئے ہمیں خاموش ہونا پڑا تھا اور بوڑھا چند لمحے ہمیں سادہ سی باتوں سے دیکھتا رہا، میں نے کہا۔

”لیکن محترم ابھی تک آپ سے تعارف نہیں ہو سکا۔“

”تعارف!“

”ہاں، اس ویرانے میں آپ کا قیام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”نام کی حد تک اگر تم مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ میرا نام اشل ہے، کاشل منگانو۔“

”کیا آپ کا قیام یہیں ہے؟“

”ہاں، ان آبادیوں کے لوگ مجھے حکیم کہتے ہیں اور میں برسوں سے ان جنگلوں میں آباد ہوں، ان جنگلوں میں طے والی جڑی بوٹیاں بہت سوں کو زندگی دیتی ہیں اور مانوں کے لئے زندگی تلاش کرنا میرا مشغلہ ہے، یہ میری بیٹی سیگا ہے اور یہ دواؤں کی ادوی میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔“

”مگر تم کون ہو؟“

”ایک اجنبی دنیا سے آنے والے جن کے سپرد سندالیوں کی سرکوبی کی گئی ہے، ہم سندالیوں کی جڑیں کاٹنے کے لئے ان علاقوں میں سرگرم ہیں۔“

”صرف دو افراد؟“

”ہاں، صرف ہم دو مل کر سندالیوں کو شدید نقصان پہنچا چکے ہیں۔“

”نوجوان بچو تم نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے میں الفاظ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے میرے سینے میں کیسی روشنی کر دی ہے، تم نے اپنے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک اجنبی دنیا کی لوگ ہو، مجھے اس بارے میں تھوڑا بہت علم ہوا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو سندالیوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ اور جانتا چاہتا ہوں دیکھو وہ جو کہتے ہیں ناکہ دودھ کا جلا چھاپھ پھونک کر پیتا ہے بے شک تم نے جو کچھ کہا میرے لئے وہ بہت قیمتی ہے لیکن میں اگر تم سے دل کی بات کہہ دوں اور ممکن ہے وہ تم نہ ہو، برا نہ ماننا تم نے سندالیوں کے ایک آدمی کو مار گرایا اور تم لوگوں کو ان کے حملے سے ایک خراش بھی نہیں آئی اگر تم مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے اپنے بارے میں مطمئن کر دو۔ برا مانے بغیر، کیونکہ اگر تم ٹھنڈے دل سے غور کرو گے تو میرا یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے کوئی راز آشکارا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جسے رازدار بنایا جا رہا ہے وہ کون ہے۔“

میں گہری نگاہوں سے بوڑھے کا جائزہ لینے لگا آخر بوڑھے کے پاس ایسا کون سا راز ہے جسے وہ بتانے سے گریز کر رہا ہے اور میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتا ہے، پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

”دیکھو بزرگ جو کچھ ہم ہیں تمہیں بتا چکے ہیں اگر اس کے باوجود تم اپنے بارے میں کچھ بتانے میں مشکل محسوس کر رہے ہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے تم نے اس برے وقت میں ہماری مدد کی ہے، ہمارے محسن ہو تم، اپنے محسن کو اس کی خواہش کے بغیر کسی بات پر مجبور کرنا ہمارے لئے ایک افسوس ناک عمل ہو گا اور میں تمہیں کبھی مجبور نہیں کروں گا۔“

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اس کے چہرے سے صاف احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک شدید اندرونی کشش کا شکار ہے میں بھی جانتا تھا کہ بوڑھا اس وقت کس کیفیت میں ہے لیکن بہر حال میں نے سنجیدگی سے اس سے اپنی بات کہہ دی تھی ویسی بات ذرا پریشان کن بھی تھی اس دور دراز علاقے میں یہ عمارت اور پھر یہاں کا شاندار معیار زندگی بہر حال اس نے ایک ویرانہ آباد کر رکھا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ یہاں بیرونی دنیا سے سب کچھ لیکر آنا ان دشوار گزار راستوں سے گزرنا سب کچھ ایک مشکل کام

”اوہ تو کیا تم..... اوہ.....“ بوڑھا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں.... کچھ نہیں! رب عظیم تمہاری حفاظت کرے۔“ بوڑھے کے چہرے پر فکر کے آثار نظر آنے لگے تھے، میں نے کہا۔

”ضرور کوئی ایسی بات ہے محترم بزرگ جو تمہیں سوچ میں مبتلا کر رہی ہے۔“

”میں تمہیں کیا بتاؤں اس بارے میں؟“

”کیا کوئی ایسی اہم بات ہے جو آپ ہمیں بتانا نہیں چاہتے۔“ میں نے کہا اسی وقت

ملازم قہوے کے برتن لے آیا جو ہمارے سامنے سجا دیے گئے، قاسم خان نے پرشور انداز میں قہوہ انڈھلتے ہوئے کہا۔

”کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کچھ دیر پہلے کیا ہو رہا تھا اور کچھ دیر کے بعد کیا ہو جائے گا، ہم برف کے طوفان میں گھر کر یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں ہماری تقدیر آئندہ ہمیں کیا وقت دکھاتی ہے، لیکن اس وقت ہم ایک محفوظ پناہ گاہ میں بیٹھ کر گرم قہوہ پی رہے ہیں۔“ کسی نے قاسم خان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں پوری طرح بوڑھے کا شل کی جانب متوجہ تھا جو گہری سوچوں میں مبتلا تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تمہاری باتوں سے مجھے بڑا سہارا ملا ہے میرا خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں اپنے آپ کو برف کے اس خول سے نکالوں اور اپنی اس پوشیدہ تپش کو صرف کر لوں، جس نے میرے پورے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں بغور اس کا جائزہ لینے لگا اس بوڑھے وجود میں بھی کوئی کمائی پوشیدہ ہے کچھ لمحوں تک وہ خاموش رہا اس دوران میں محسوس کر رہا تھا کہ قاسم خان کی نظریں سیگا کی جھیل جیسی اور شفاف آنکھوں میں گڑھی ہوئی ہیں اور سیگا کے دیکھنے کا انداز بہت خوبصورت ہے لیکن یہ بات بھی میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی کہ سیگا میری جانب متوجہ ہے جبکہ قاسم خان اس بات پر مدھم مدھم انداز میں مسکرا رہا ہے، قاسم خان کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی بھی بات سے حسد کا شکار

کہ دفعتاً "شی.... شی کی ایک آواز ابھری، جیسے کوئی کسی کو مخاطب کر رہا ہو، میری نگاہیں بے اختیار اس کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں جو میری داہنی سمت تھی، کھڑکی پر ایک سایہ سا لہرا رہا تھا، میں بری طرح چونک پڑا، کچھ لمحوں کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ شی.... شی کر کے ہمیں ہی مخاطب کیا جا رہا ہے۔



تھا۔ بوڑھے کاشل کی شخصیت بے حد پراسرار تھی پھر اچانک ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا اور ہم چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"میں تم لوگوں کے آرام کے لئے انتظام کرنے جا رہا ہوں اس سفر میں تمہیں کافی مشکل پیش آئی ہے، آرام کرو باتیں کرنے کے لئے بہت وقت ہو گا۔"

بوڑھے کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی بھی اٹھ گئی تھی۔ ہم خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے نے واپس آ کر کہا۔

"آؤ چلو، میں نے تمہارے آرام کا بندوبست کر دیا ہے۔" جس کمرے میں ہمیں آرام کے لئے بھیجا گیا تھا بے حد وسیع تھا وہ اور شاید اس میں ابھی ابھی آتش دان روشن کیا گیا تھا، زمیں پر نرم گھاس کے ڈھیر تھے جنہیں جانوروں کی کھال میں چھپا دیا گیا تھا یہ ان کے بستر تھے، باقی ضروریات زندگی بھی موجود تھیں، لیکن بوڑھے کے جانے کی بعد قاسم خان نے کہا۔

"شہباز، کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں...."

میں نے چونک کر قاسم خان کی طرف دیکھا، شاہ رو واقعی تھک گیا تھا اور اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں، میں نے قاسم خان سے کہا۔

"میرے قریب آ جاؤ، کیا سوچ رہے ہو تم؟"

"یار ہر چند کہ ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں

میرے ذہن میں اک شبہ سر ابھار رہا ہے۔"

"کیا؟"

"نجانے کیوں میری چھٹی حس آہ وہی چھٹی حس، جس کا میں تم سے بار بار تذکرہ کرتا ہوں اس وقت بھی میری کھوپڑی پر ڈنک مار رہی ہے، مجھے یوں احساس ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی گڑبڑ ہے یہ شخص وہ نہیں جو نظر آتا ہے، ضرور کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے اور ہو سکتا ہے برف باری سے بچنے کے باوجود ہم کسی اور مشکل کا شکار ہو جائیں۔"

میں خاموشی سے قاسم خان کو دیکھتا رہا پھر کافی دیر اس خاموشی سے گزر گئے، قاسم خان بھی کسی سوچ میں تھا اور میں بھی، ابھی ہم لوگ دوبارہ بولنے بھی نہیں پائے تھے

اگر کاشل نے دیکھ لیا تو صورت حال خاصی گڑبڑ ہو جائے گی۔

”کیا تم نہیں آنا چاہتے؟“ وہ بولی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”میں نے تم جیسا آدمی نہیں دیکھا۔“

”کیوں؟“

”میں ایک لڑکی ہو کر اتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہوں اور تم....“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ میری غیرت پر ایک ضرب سی پڑی اور پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ کچھ لمحوں کی بعد میں سیگا کے سامنے موجود تھا، کالے لباس میں لپٹی لڑکی چاند زادی معلوم ہو رہی تھی اور میں اس وقت اس کے حسن سے مسحور ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”جو بات تمہیں کرنی تھی کیا اس کے لئے صبح کا انتظار نہیں کیا جاسکتا؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ یہ انتظار خطرناک ہوتا۔“ وہ بولی۔

”خطرناک ہوتا؟“

”ہاں۔“

”تم نے مجھے سنسنی کا شکار کر دیا ہے۔“

”اور تم مجھے خاصے بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔“ وہ بے جلابی سے بولی۔

”ہوں، چلو ٹھیک ہے، ایسا ہی سہی، کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”تمہیں ہوشیار کرنے آئی ہوں۔“

”ہوشیار۔“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔ کاشل جو کوئی بھی ہے میرے اس کے درمیان کے رابطے کے بارے میں

تم نہ پوچھو، لیکن میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟“ میں حیرت سے بولا۔

”تم اس پر بھروسہ نہیں کرو گے۔“

اندھیرے میں اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آواز کس سمت سے آئی ہے لیکن تھوڑا سا اندازہ لگانے کے بعد مجھے کھڑکی کی دوسری جانب ایک سایہ سا نظر آیا، میں چونکا ہوا گیا، اور ایک بار پھر وہی سرگوشی سنائی دی، کچھ لمحوں کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کی جانب چل پڑا۔ لیکن میں پوری طرح محتاط تھا، کھڑکی کی دوسری جانب مجھے سیگا نظر آئی اس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ایک سیاہ رنگ کے لباس میں چھپا رکھا تھا صرف چہرہ کھلا ہوا تھا اور کالے بالوں کی آغوش میں یہ چہرہ سو فیصدی چمکتا ہوا چاند ہی معلوم ہو رہا تھا، میں نے آہستہ سے کہا۔

”سیگا تم؟“

”ہاں باہر آؤ۔“

”خیریت؟“

”باہر آؤ، کیا باہر آتے ہوئے خوف محسوس کر رہے ہو۔“ وہ بولی۔

”نہیں لیکن، کیا اس طرح؟“

”کیا فضول باتیں کر رہے ہو، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”دیکھو، سیگا ہم ایک شریفانہ ماحول میں شرافت سے رہنا چاہتے ہیں اگر کوئی جذباتی

قدم اس کے لئے مجبور کر رہا ہے تو تم اپنے آپ کو سنبھالو۔“

”تم مجھے پاگل معلوم ہوتے ہو، کیا ان فضول باتوں کی بجائے تم باہر نہیں آ

سکتے۔“ میں نے پلٹ کر سونے والوں کو دیکھا وہ بے خبر سو رہے تھے حالانکہ ایسی کوئی

بات نہیں تھی، مجھے اپنے آپ پر بھی اعتماد تھا اور ماحول پر بھی، لیکن کاشل جس طرح

میرے ساتھ پیش آیا تھا اس کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ اس بوڑھے سے کوئی دشمنی

مول لی جائے یا وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے اپنے ساتھیوں پر مجھے اعتبار تھا، قائم

خان زیادہ سے زیادہ یہ کہ میرا مذاق اڑا لے گا، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن

”نہیں، جب تم نے اتنی مہربانی کی ہے تو کیا اتنی مہربانی مزید نہیں کر سکتیں کہ مجھے اس سازش کے بارے میں بتا دو۔“

”بس اتنا ہی کہوں گی کہ تم لوگوں کا یہاں سے جلد از جلد چلے جانا تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“

”کیا بابا کاشل وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے؟“

”ہاں، بابا کاشل وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔“

”میں تمہاری اس محبت اور تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکوں گا سیگا لیکن اگر تم؟“

”تم مجھے بھی مروانا چاہتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں دیکھو میں....“ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا جملہ پورا کرتا وہ وہاں سے آہستہ آہستہ چلی گئی، میں کچھ دیر کھڑا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا، بہت عجیب انداز تھا اس لڑکی کا، اور بڑا ہی عجیب رویہ تھا یہ، وہ اپنے باپ کے خلاف ہو گئی تھی، کیوں آخر کیوں۔ اس نے اپنے باپ کے خلاف یہ بات کیوں کہی تھی، ابھی میں باہر کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ قاسم خان نے کہا۔

”ظاہر ہے جوانی رنگ رلیاں چاہتی ہے لیکن اب بہتر ہی کہ اندر آ جاؤ۔ وہ واپس چلی گئی ہے۔“

میں چونک کر پلٹا یہ آواز مجھے کھڑکی سے سنائی دی تھی، وہی کھڑکی جس سے میں نے سیگا کی آواز سنی تھی، اب میرے کمرے میں اس کھلنے والی کھڑکی میں قاسم خان کھڑا ہوا تھا اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، میرے ذہن میں جھلاہٹ پیدا ہو گئی پھر میں پلٹ کر واپس آیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

”وہ بہت خوبصورت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“

”اور تمہارے سر میں شاید کھلبلی ہو رہی ہے۔“

”نہیں.... نہیں میرے سر میں کھلبلی نہیں ہو رہی بلکہ میرے دل میں کھلبلی ہو

رہی ہے جل رہا ہوں میں تم سے۔“

”گلدھے ہو۔“

”میرے خدا، یہ تم اپنے باپ کے بارے میں کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔“

”لیکن؟“

”پوی بات نہیں سنو گے؟“

”اچھا ٹھیک ہے، میں خاموش ہوں بتاؤ۔“

”تم اس سفر کا آغاز فوری طور پر کر دو، یا اگر نہیں کر رہے تب بھی تم کاشل کی ہدایت پر عمل نہیں کرنا، اور اپنا یہ سفر جاری رکھنا اور سفر کے مقصد کو کبھی ذہن سے اونچھل نہ ہونے دینا۔“

”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”اگر ان الفاظ کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا تو عقل کا ماتم کرنے کے علاوہ

میں اور کیا کر سکتی ہوں۔“

”کیا تم مسلسل میری توہین نہیں کر رہی ہو سیگا؟“

”اگر تم میری ہمدردی کو توہین سمجھ رہے ہو تو کیا کہہ سکتی ہوں اس بارے

میں؟“

”لیکن براہ کرم مجھے کچھ تو بتاؤ۔“

”کیا میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ تم خطرے میں ہو اور کاشل تم سے جو کچھ

کہہ رہا ہے وہ سچ نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ کچھ اور ہے۔“

”وضاحت نہیں کرو گی؟“

”نہیں۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔“

”ہاں پوچھو۔“

”کیا کاشل ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”لیکن کیا سازش؟“

”کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو۔“

”کچھ بھی ہے لیکن بہر حال واقعی وہ خوبصورت ہے۔“

”دیکھو قاسم خان بکواس مت کرو۔“ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ویسے کہہ کیا رہی تھی؟“ قاسم بدستور شریر انداز میں بولا۔

”جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ بڑا خطرناک تھا۔“

”عشق و محبت کی باتیں خطرناک تو نہیں ہوتیں ان میں تو رومانیت ہوتی ہے۔“

قاسم خان نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے بکواس کرتے رہو، میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”خیر ٹھیک ہے، مجھے بھی اگر کوئی مل گئی تو میں بھی تمہیں بتانا پسند نہیں کروں

گ۔“ قاسم خان نے کہا۔

مجھے واقعی غصہ آگیا تھا میں منہ موڑ کر لیٹ گیا تو قاسم خان میرے قریب آیا۔

”یار کیا ان حالات میں بھی تم مجھ سے روٹھ سکتے ہو؟“

”میں کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا۔“

”اچھا چلو۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیا وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لئے کہہ رہی تھی۔“

”میں نے کہا تھا جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ بہت خطرناک تھا۔“

”یار تو مجھے بھی بتا دو نا۔“

”وہ کہہ رہی تھی کہ کاشل ہمارے خلاف سازش کر رہا ہے۔“

”کاشل۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہاں۔“

”یعنی اس کا باپ؟“

”ہاں۔“

”لیکن وہ تو یار۔۔۔“

”بیٹی کہہ رہی ہے اب یا تو باپ غلط ہو گیا بیٹی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ نہیں ہے۔“

”سو فیصدی۔“

”اور جڑی بوٹیوں کی تلاش کے سلسلے میں وہ کچھ نہیں کر رہا، بلکہ اس ویرانے

میں اس کا کوئی خاص مقصد ہے۔“

”ظاہر ہے۔“

”اور اس کی بیٹی اس کے خلاف ہے۔“

”ممکن ہے ورنہ مجھے خبردار کیوں کرتی۔“

”حالانکہ اسے کچھ اور کرنا چاہئے تھا۔“

”کیا؟“

”وہ تمہیں یہاں سے جانے کے لئے منع کرتی۔“

”کیوں؟“

”بھئی اس لئے کہ تم بھی خوبصورت ہو اور وہ بھی۔“

”پھر بکواس پر اتر آئے؟“

”ایک بت کہوں؟“

”بولو۔“

”میرا خیال ہی بوڑھا سندا لیوں کا مخبر ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”تو پھر وہ ان لوگوں سے بھی واقف ہو گا جو ہم پر حملہ آور ہوئے تھے؟“

”اب تو اس بات کا امکان ہے۔“

”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بوڑھا یہاں جاسوسی کے لئے مقیم ہے۔ اور سندا لیوں

کو ہمارے بارے میں اطلاع دینے کا کام سرانجام دے رہا ہے۔“

”مجھے بھی ایسی ہی کوئی بات معلوم ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ یہاں ان لوگوں کو

پتہ بھی دیتا ہو گا۔ تم دیکھو اس ویرانے میں اس کے پاس دنیا کی ہر چیز موجود ہے اور وہ

ہر قسم کے عیشیات حاصل کر رہا ہے۔“

”لیکن اس کی بیٹی۔“

”ہاں۔“

”اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ تم سے متاثر ہو گئی ہو۔“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”اس لئے کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی سیگا کی پہل دیکھا لیکن سیگا کا سر جھکا ہوا تھا وہ سر جھکائے بیٹھی رہی بوڑھا پھر بولا۔
”تمہیں ابھی یہاں کچھ انتظار کرنا ہو گا۔“

”مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن اب اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“
”وجہ ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میں تمہیں وہ ساری معلومات فراہم کرنے کے لئے تیار ہوں جن کے جاننے کے لئے تم اب تک کوششیں کرتے رہے ہو۔“

میں نے چونک کر بوڑھے کی طرف دیکھا اور پھر سیگا کی جانب، سیگا بھی اس وقت میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہا کہ میں ہوشیار ہوں لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی تاہم مجھے بوڑھے کی بات نو سنی ہی چاہئے تھی، میں نے خاموشی اختیار کی، جس کا مطلب تھا کہ میں بوڑھے کی بات سننا چاہتا ہوں، پھر جب بوڑھا کچھ دیر تک کچھ نہیں بولا تو میں نے کہا۔

”میں جاننا چاہتا ہوں بزرگ جو کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔“

”میں ہچکچا رہا ہوں۔“

”اگر یہ کوئی گہرا راز ہے تو اطمینان رکھو راز ہی رہے گا لیکن بہتر ہے کہ اب زیادہ وقت صرف نہ کرو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے تم پریشان مت ہو ابھی تمہیں یہاں قیام کرنا ہے۔“

”نہیں ممکن نہیں ہے۔“

”اوہو میری بات مانو میرے بچو۔“

”نہیں بزرگ، اس سے زیادہ ہمارے لئے یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد میں شاہ رو اور قاسم خان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

”تم جلد بازی کر رہے ہو اور جلد بازی تمہیں اندازہ ہے کہ تکلیف دہ ہوتی

اس کے بعد ہم دونوں خاموشی سی اس مسئلے میں سوچنے لگے تھے پھر اس کے بعد میں نے کہا۔

”بہر حال ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ سیگا کی بات مان لی جائے۔“

”آہ کیا وہ تم سے شاہی کی خواہش کا اظہار کر چکی ہے۔“

”نہیں لیکن ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔“

”ہوں، کب؟“

”اس کے بعد یہی فیصلہ کرنا ہے ویسے میرا خیال ہے صبح ہونے میں اب زیادہ دیر

نہیں ہے۔“

”ہاں۔“

”دوسری صبح ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

پھر بقیہ رات جاگتے ہوئے گزر گئی تھی صبح کو سیگا نے بالکل بدلے ہوئے انداز میں ہمیں ناشتے کی اطلاع دی، ناشتے پر ہمارے ساتھ بوڑھا کاشل بھی تھا، میں نے کاشل سے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے بزرگ کاشل کہ ان ویرانوں میں تم ان بھولے بھٹکے مسافروں کے لئے مسجا ہو۔ تمہاری مہمان نوازی نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے اور خاص طور سے ہمارا مسئلہ بالکل الگ ہے جب کہ اس ویرانے میں چاروں طرف دشمن کا خطرہ ہو، تمہارا یہ مکان ایک نعمت سے کم نہیں، ہم تمہاری میزبانی کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن اب ہم تمہیں مزید زحمت نہ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں، چنانچہ اب ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔“

”شرمندہ کر رہے ہو۔“ کاشل نے سر جھکا کر کہا۔

”نہیں واقعی ہم تمہارے احسان مند ہیں۔“

”تو پھر ابھی کچھ وقت یہاں اور گزارو۔“

”ممکن نہیں ہے۔“

”نہیں ممکن ہو یا نہ ہو لیکن ضروری ہے۔“

”کیوں؟“

ہے۔“

”جو کچھ بھی ہو، میں جو فیصلہ کر لیتا ہوں اس پر عمل بھی فوراً ہی کر ڈالتا ہوں، ہمارے گھوڑے منگوا دو اور کچھ لمحوں کے بعد ہمارے گھوڑے ہمارے سپرد کر دیئے گئے، بوڑھا ہمیں رخصت کرنے کے لئے آیا تھا اس کے ساتھ سیگا بھی تھی لیکن بیگا کے چہرے پر صاف اداسی جھلک رہی تھی تب میں نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہم ضرور آئیں گے بزرگ کاشکل، ایک بار ہم ضرور آئیں گے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں ہم تمہارا انتظار کریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں سندالیوں سے بچنا ہے۔“

”بچیں گے۔ کوشش کریں گے۔“

”آہ کاش تم اس کوشش میں کامیاب ہو سکو۔“ بوڑھے نے پراسرار لہجے میں کہا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کے بعد ہم نے وہاں سے اپنے گھوڑے آگے بڑھائے تھے۔



”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا وہ لڑکی تمہیں پسند آئی ہے؟“

”قاسم خان یہ واقعی بکواس کا موقع نہیں ہے۔“

”میں صرف اپنی بات کا جواب چاہتا ہوں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر مجھے کہنے دو۔“

”کیا؟“

”یہی کہ وہ مجھے پسند آئی ہے۔“ قاسم خان نے کہا اور میں اسے گھورنے لگا۔

”جب تمہیں پسند نہیں آئی تو مجھے پسند آنے دو۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟“

”تم نے کام کی بات کو ٹل دیا ہے۔“ میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر ایسی بات ہے تو میں خاموش ہوئے جاتا ہوں۔“

ہماری رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور ہم گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے میں نے مت غور کرنے کے بعد کہا۔

”قاسم خان ایک دفعہ میں یہاں واپس ضرور آؤں گا۔“

قاسم خان کے بجائے شاہ روبرول پڑا۔

”کیوں، معزز دوست؟“

”شاہ رونی الحال میں اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتا۔“

”میں بیان کر سکتا ہوں۔“ قاسم خان نے کہا۔

”تم بکواس بند کرو گے یا نہیں؟“

”نہیں، مجھے کہنے دو یا پھر ایک بات تسلیم کرو۔“ قاسم خان شرارت کے موڈ میں

”تم مجھے بتاؤ شہباز، کیا بات ہے؟“ شاہ رو نے کہا۔

”میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ بوڑھا کاشل یہاں کوئی بہت اہم کام کر رہا ہے اور اس نے ہمیں بھی فریب دینے کی کوشش کی ہے۔“

”کیسا فریب؟“ شاہ رو کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مثلاً کل کی طرح آج بھی ہم پر کوئی حملہ ہو سکتا ہے۔“

”اگر ایسی بات تھی تو پھر ہمیں وہاں سے نہیں آنا چاہئے تھا۔ بلکہ اس سے پہلے ہمیں اس بورے کاشل سے نمٹ لینا چاہئے تھا۔“ اس بار قاسم خان نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ ہمارے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہو سکے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم حملے کی توقع رکھتے ہو تو یہ حملہ آور بوڑھے کاشل کے اشارے پر ہم تک پہنچیں گے، ایسی صورت میں ہم اگر کاشل کو قابو میں رکھتے تو وہ ہمارے خلاف سازش میں شریک نہ ہو پاتا۔“

”حملہ کرنے والے کاشل کے خادم نہیں ہوں گے بلکہ اس کے دوست ہوں گے“ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمارا کسی دشمن سے سامنا ہونے والا ہے۔“ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”آہ تم نے مجھے ایک عجیب سی سنسنی کا شکار کر دیا ہے۔“ شاہ رو کہنے لگا، لیکن اس کے بعد ہم تینوں ہی خاموش ہو گئے تھے اور اچانک ہی ہمیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہمارے ساتھ ساتھ کوئی خطرہ سفر کر رہا ہے اس لئے ہم پوری طرح محتاط ہو گئے تھے۔ گھوڑے میدانِ راستے عبور کر کے ایک تنگ چٹائی راستے سے گزر رہے تھے کہ اچانک میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی، ابھی ہم یہ تنگ راستہ عبور بھی نہیں کر پائے تھے کہ اچانک ہی فائروں کی آواز سنائی دی، یہ علاقہ بہترین تھا حملہ آوروں کے لئے اور بدترین تھا ان کے لئے جو اس کھلے علاقے میں سفر کر رہے ہوں۔ ہم پر بدو قوں کے دہانے کھول دیئے گئے تھے ویسے میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ جب بھی حملہ کرتے ہیں چھپ کر کرتے ہیں اور سامنے آنے سے گریز کرتے ہیں۔

شاہ رو نے سب سے پہلے اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور ایک پتھر کے پیچھے چھپ گیا پھر ہم سب نے بھی یہی عمل دہرایا اور گھوڑوں سے کود گئے لیکن اچانک ہی ہرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں، میں دوسروں کی طرح گھوڑے سے کودا تھا لیکن دوسرے لمحے میں نے پلٹ کر دوبارہ گھوڑے کی پشت پر سواری گھانٹ لی اور گھوڑے کو برق رفتاری سے آگے دوڑا یا میں اس تنگ راستے کو عبور کر لینا چاہتا تھا اور کوئی ایسی پوزیشن لینا چاہتا تھا جہاں سے میں ان کی گولیوں کا جواب دے سکوں اور ایسا ایک ٹیلہ مجھے نظر آگیا، یہاں پہنچ کر میں نے پوزیشن لی اور اس کے بعد میں خود بھی فائر کرنے لگا لیکن ساری صورت حال انتہائی سنسنی خیز تھی، اصل میں، میں انہیں جوابی حملہ کر کے فائرنگ سے روکنا چاہتا تھا تاکہ میرے دونوں ساتھیوں کو بہتر پوزیشن حاصل کرنے کا موقع مل جائے جس پتھر کے پیچھے انہوں نے پناہ لی تھی وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ وہاں محفوظ رہ سکیں پھر اچانک ہی مجھے اپنے عقب میں ایک سرسراہٹ سنائی دی اور میں فوری طور پر کسی سانپ کی طرح پلٹ پڑا اور یہ سرسراہٹ صرف میرے اعصاب کا کارنامہ تھی اگر اس وقت میں نہ پلٹتا تو اس سندالی کا شکار ہو گیا ہوتا جو اپنے خنجر سے مجھے نشانہ بنانے ہی والا تھا اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور میں نے فضا ہی میں اسے سنبھال لیا، میں نے اپنی بددق کی لاشی تیزی سے گھمائی، نشانہ سندالی کی کھوپڑی تھی اور راتقل کا بٹ اس کی کھوپڑی پر لگا اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ سر کے بل ہی زمیں پر آ کر گرا، نیچے ایک نوکیلے پتھر نے اس کا استقبال کیا اور یہ بھی ایک انتہائی حیرت ناک اور سنسنی خیز واقعہ تھا جو میں نے دیکھا پھر اس طرح اس کے سر میں گھس گیا کہ اس کا سر ہی غائب ہو گیا۔ دوسرے لمحے ایک گولی مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر کر ایک پتھر پر لگی اور فضا میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں میں فوراً بیٹھ گیا تھا اور پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں ہو گیا، یہ بھی ایک انتہائی برق رفتار فیصلہ تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی بے شمار گولیاں عین اس جگہ پر آ کر لگیں جہاں میں ایک لمحے پہلے موجود تھا، میرا گھوڑا بھی اس وقت میرے ساتھ ہی جنگ کر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ بھی ایک ماہر جنگ جو ہو، جیسے ہی گولیاں چلتیں وہ جگہ بدل لیتا اور کیا

لڑا ہوا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس سے منٹے کی کوشش کروں میں نے برق رفتاری سے نیچے بیٹھ کر اس کے پیٹ لائے ماری وہ اونڈھا ہوا تو میں نے اپنی رائفل کے بٹ سے اس کے شانے پر حملہ کیا اور کامیابی سے اس کے بائیں بازو کو نشانہ بنا لیا اس نے پھرتی سے اپنے لباس سے بک چوڑا کلباڑا نکالا اور پوری قوت سے اسے گھما دیا، بڑا خونخوار حملہ تھا اگر تقدیر ہاتھ نہ دیتی تو گردن شانوں سے اچھل کر دور جاگری ہوتی، ہم لوگ اتنے قریب تھے کہ ایک دوسرے پر رائفل استعمال نہیں کر سکتے تھے اور اس وقت اسے اس بات کی نیت حاصل تھی کہ اس کے ہاتھ میں قریب سے حملہ کرنے کا ہتھیار موجود تھا چنانچہ اس نے پے در پے مجھ پر حملے کئے اور میں اچھل اچھل کر اس کے یہ حملے بچاتا رہا پھر یک بار مجھے موقع ملا اور میں نے رائفل پھر اس کے ہاتھ پر لائن کی طرح ماری اور اس کے ہاتھ سے کلباڑا گر گیا۔ دوسرے لمحے میں نے رائفل کی نال اس کے سینے پر لکھ دی تھی وہ پیچھے ہٹا ہوا چٹن سے جا لگا، عجیب سی نگاہوں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں میرے دوست سب سے پہلی بات یہ بتاؤ کہ یہاں تمہارے آس پاس کتنے زرا موجود ہیں؟“

”میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”اگر ہے بھی اور کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کرتا ہے تو تم پورا اطمینان رکھو کہ

ب سے پہلے میں تمہیں تو جہنم رسید کر ہی دوں گا۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”خوب، اب ذرا تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟“

”دیکھو میں شاید تم پر غلطی سے حملہ کر بیٹھا ہوں مجھے شبہ باز کی تلاش ہے۔“ اس نے کہا اور ایک لمحے کے لئے تو میں چکرا گیا تھا، بہت کم لوگ میرا نام اس طرح لے لیتے تھے وہ بھی مقامی، بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن میں نے سوچا کہ یہ بھی کوئی چال ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا۔

”شبہ باز!“

”ہاں، نئی دنیا کا نوجوان جو ان علاقوں میں ہے۔“

شانداز کارنامہ انجام دے رہا تھا وہ اس وقت کے مجھے گولیوں سے بچا رہا تھا، میں نے سنبھلتے ہی اس چٹن کو اپنا نشانہ بنا لیا جس کی اوٹ سے مجھے نشانہ بنایا جا رہا تھا یہ ایک دلچسپ بات تھی کہ دوسری جانب سے قاسم خان اور شاہ رو نے بھی سنبھل کر اس چٹن کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رکھا تھا، اچانک ایک گولی بالکل میرے قریب آ کر چٹن میں لگی، ایک عجیب سی قوت ہماری مدد کر رہی تھی ورنہ اس گولی کا شکار ہو جانا کوئی اہم بات نہیں تھی البتہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ گولی کسی اور سمت سے چلائی گئی ہے اب یہ پورا علاقہ میدان کارزار بنا ہوا تھا لیکن قاسم خان اور شاہ رو بھی اس بے جگری سے گولیاں چلا رہے تھے کہ یقین نہیں آ رہا تھا وہ جانتے تھے کہ بچنے کا راستہ صرف یہی ہے، دشمن کا زور جلدی ٹوٹ گیا، مجھے اندازہ ہوا کہ اب گولیوں کی جو بوچھاڑ ہو رہی تھی وہ خود بخود کم پڑتی جا رہی ہے ویسے ان تمام ہنگاموں کے دوران میں نے یہ اندازہ سب سے پہلے لگایا تھا کہ سندالی جو کچھ بھی ہیں بزدل ہیں اور سامنے آ کر کبھی مقابلہ نہیں کرتے۔

پھر رفتہ رفتہ ان کی طرف سے خاموشی طاری ہوتی چلی گئی اور کچھ دیر کے بعد دوسری طرف سے گولیاں چلنا بالکل ہی بند ہو گئیں میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں دھوکا دے کر یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں تاکہ ہم ان کے نشانے پر آجائیں، چنانچہ میں نے چیخ کر کہا۔

”اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش مت کرنا کیا سمجھے۔“

”ٹھیک ہے فکر مت کرو۔“ دوسری جانب سے قاسم خان کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے بھی خاصا وقت خاموشی سے گزارا تھا اور انتظار کرتا رہا تھا کہ کسی طرف سے کوئی عمل ہو تو اس کا رد عمل ظاہر کروں، ان لوگوں کی زندگی کا رسک میں نہیں لینا چاہتا تھا لیکن جب کافی دیر فضا میں خاموشی طاری رہی تو میں نے اپنی جگہ سے نکل کر آگے قدم بڑھا دیئے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آس پاس کوئی بھی موجود نہ ہو، قاسم خان اور شاہ رو بدستور پوشیدہ تھے اور شاید انہوں نے مجھے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ان کا رخ کسی اور طرف تھا، میں چٹنوں کی آڑ میں ہوتا ہوا آگے بڑھا لیکن جیسے ہی میں نے ایک چٹن کے عقب میں قدم رکھا اچانک ہی ایک تو منہ فحش اپنی جگہ سے اٹھ

”کیا کلم ہے اس سے؟“

”بس میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اس کے لئے میرے پاس ایک اہم اطلاع ہے۔“

”کیا تم نے پہلے اسے کبھی دیکھا؟“

”نہیں۔“

”کیا اطلاع ہے اس کے لئے؟“

”وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

”میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تمہارے بارے میں؟“

”ہاں۔“

”تم.... تم بہت پھرتیلے ہو، بہت شاندار لڑاکے، تم نے جس برق رفتاری سے میرے حملوں کو ناکام بنایا ہے اس کے لئے میں حیران ہوں اور تمہاری قدر بھی کرتا ہوں، ایک لڑاکے کو دوسرے لڑاکے کی قدر کرنی چاہئے میری بستی کے لوگوں کا خیال ہے کہ میں ایک بہت ہی طاقتور اور بہترین جنگجو ہوں لیکن ایک لمحے کے اندر اندر تم نے میرے تمام حربوں کو ناکام بنا دیا یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ میں تم پر قابو ہی نہیں پاسکا۔“

”مجھے غور سے دیکھو کوئی اور تبدیلی پاتے ہو مجھ میں۔“ میں نے کہا اور وہ مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”تمہارے نقوش، تمہاری شخصیت بتاتی ہے کہ تم آہ کیس.... اوہ.... رب عظیم کی قسم، کہیں مجھ سے ایک بدترین گناہ سرزد نہیں ہو گیا۔“

”کیسا گناہ؟“

”کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گے دوست؟“

”ارے واہ اب میں دوست بھی ہو گیا۔“

”اگر میرا خیال غلط ہے تو مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے لیکن اگر میں جو سوچ

رہا ہوں وہ سچ ہے تو پھر تم میرے بہترین دوست ہو۔“

”کیا سوچ رہے ہو تم؟“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”شہباز!“ میں نے کہا اور وہ سنائے میں رہ گیا، میرے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی وہ خاصی دیر تک ایسے کھڑا رہا پھر بولا۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں میں شہباز ہوں۔“

”لیکن؟“

”لیکن تم یقین کرو گے کیسے، یہی کہنا چاہتے ہو نا۔“ میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے کہا۔

”ہاں۔“

”نہ کرو، میری بات کا جواب دو کہ تم کون ہو؟ اور اگر میرے اوپر یقین آجائے تو وہ اطلاع مجھے فراہم کر دینا جسے مجھ تک پہنچانے کے لئے تم میری جان لے رہے تھے۔“

”کیا تم واقعی شہباز ہو؟“

”کمال کرتے ہو یار، کتنی باریہ سوال کرو گے۔“

”تم نے صحیح انداز میں جواب نہیں دیا۔“

”میں نے تم سے کہہ دیا کہ میں شہباز ہوں۔“

”ہاں، تمہیں دیکھ کر مجھے یقین آ چلا ہے کہ تم ہی شہباز ہو۔“

”ٹھیک ہے اگر یقین آ گیا ہے تو میرے سوالوں کا جواب دیتے رہو، پہلا سوال یہ ہے کہ تم کون ہو؟“

”میں کرامہ سے آیا ہوں شار، شار ہے میرا نام۔“

”ادھر آنے کی وجہ؟“

”میں تمہارے سوال کا کیا جواب دوں؟“

”یہ آخری سوال ہے اس کے بعد میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا اور

غلاموشی سے واپس مڑ جاؤں گا۔“

”میں ایک سردار کی تلاش میں نکلا تھا، غلطی سے ادھر آ گیا۔“

”کرامہ میں وہ ایک خطرناک آدمی تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات بہت عرصے سے بستیوں میں گردش کر رہی ہے کہ سروبا غدار ہے۔ میں تمہیں تفصیل کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک ایسی شخصیت سے تمہارا نام میرے علم میں آیا ہے۔ جو ہمارے لئے بڑی معزز اور قابل احترام ہے۔ کاش میں تمہیں تفصیل بتا سکے۔“

”تمہارے خیال میں وہ بوڑھا جس کا نام تم کاشل منگانو لے رہے ہو۔“ ان سازشوں میں کوئی خاص حیثیت رکھتا ہے۔“

”ہاں! کیوں نہیں خیر اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”بس یہ سمجھ لو کہ میں کسی طور تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ بلکہ تمہیں ہوشیار کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے لوگ مل کر ہماری ان معصوم اور پرسکون بستیوں کے خلاف بدترین سازشیں کر رہے ہیں۔ اصل میں وہ سندالیوں سے مل گئے ہیں اور سندالی ہم میں سے نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں یہ سنا گیا ہے کہ وہ مختلف بستیوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ دور دراز کی ایسی بستیوں سے جن میں نہ سچائی ہے اور نہ نیکیاں۔ وہ ہماری ان آبادیوں پر اپنا قبضہ جما کر یہاں کی تاریخ بدل دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ یہاں کی تاریخ میں نیکیاں اور سچائیاں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایک عظیم راہنما کی راہنمائی میں ان کے خلاف نکلے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہم جگہ جگہ ان کے ہاتھوں پٹ رہے ہیں۔ بے شک ہماری پوری آبادیاں سندالیوں سے نفرت کرتی ہیں لیکن یہ کہنا چاہئے کہ ہم ان کے مقابلے میں بہت پسماندہ ہیں۔ اور کوئی صحیح قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ویسے کاشل منگانو کے بارے میں اتنا بتا دوں کہ وہ ایک سانپ ہے۔ ایک ایسا سانپ جس کا کاٹنا ہوا پانی نہیں مانگتا۔“ میں بڑی پریشانی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”کاشل منگانو کی ایک بیٹی بھی ہے سیگا۔“

”ہاں!“

”میرا مطلب ہے کیا وہ منگانو کے ساتھ شریک ہے؟“

”میں اتنا نہیں جانتا؟“

”چلو اگر ایسی بات ہے تو ہمیں واپس کاشل منگانو کے مکان پر چلنا چاہئے۔“

”کون تھا وہ؟“

”وہ سروبا تھا۔“

”کون سروبا؟“

”ایک خطرناک آدمی۔“

”کیا وہ تمہیں مل گیا؟“

”ہاں۔“ شار نے کہا پھر بولا۔

”میری طرف سے اپنے دل سے ہر برا خیال نکال دو، میں اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”اؤ میرے ساتھ۔“ میں نے کہا اور وہ آہستہ آہستہ میرے پیچھے چل پڑا، اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ جو لوگ ہم پر حملہ آور تھے اب وہ یہاں موجود نہیں تھے اور صورتحال میں کوئی خرابی نہیں تھی، یقیناً اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے ان لوگوں کو آواز دی اور وہ سب باہر نکل آئے، یعنی شاہ رو اور قاسم خان وہ بھی حیرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ شار نے چند لمحات کے بعد کہا۔

”وہ لوگ جو تم پر حملہ آور تھے کیا تم انہیں جانتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”میں بلندی سے انہیں دیکھ رہا تھا وہ فرار ہو گئے۔“

”کون تھے وہ؟“

”کاشل منگانو کے آدمی۔“ اس نے کہا اور ہم سنسنی کا شکار ہو گئے۔ کچھ لمحے کے لئے ہماری زبان بند ہو گئی تھی۔ پھر قاسم خان نے کہا۔

”کیا تم سچ بول رہے ہو؟“

”ہاں! اس کے پس منظر میں ایک کہانی ہے۔“

”کیسی کہانی؟“ میں نے سوال کیا۔ ہم لوگ بڑی دلچسپی سے شار کی باتیں سن رہے تھے۔

سروبا کون تھا؟ شار کیا چاہتا تھا؟ اس بارے میں معلوم کرنا بے حد ضروری تھا۔ کیونکہ ان واقعات سے ہمارا گہرا تعلق تھا۔

”سروبا کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“

”کیا؟“ قاسم خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ شاہ رو بھی مجھے دیکھنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔

”یہ ضروری ہے میں اس کے اطراف میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کے پاس کتنے افراد ہیں۔ اور اگر ضرورت پڑی تو پھر کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ کیا تم ہمارے ساتھ آنا پسند کرو گے شار؟“

”میں تمنا نہیں ہوں۔ کچھ اور افراد بھی میرے ساتھ ہیں۔“

”کیا تمہاری طرح صحیح حیثیت کے مالک۔“

”اگر تم یقین کرو۔“

”میں نے یقین کر لیا ہے۔“ پھر ہم نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ تو راستے میں قاسم خان نے مجھ سے کہا۔

”ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔ وہ لڑکی سیگا بھی کسی معمولی حیثیت کی مالک نہیں معلوم ہوتی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ ہمارے حق میں ہوگی تو بے عقلی کی بات ہے۔ کیونکہ ہر حال وہ اسی باپ کی بیٹی ہے۔“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”نہیں میں کہتا ہوں تم سے۔ کاشل منگانو جیسے ضمیر فروش سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنی بیٹی کی خوبصورتی کو اس نے اپنے لئے سود مند بنا لیا ہے وہ ایک بے غیرت انسان ہے اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ سندالیوں نے سب سے بڑی کوشش ہماری غیرت چھیننے کی کی ہے۔ کیا سمجھے۔“ شار نے کہا۔ دو آدمی ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ اس لئے مجھے بھی اس سلسلے میں ذرا غور کرنا پڑا۔ ہر حال اب دیکھنا تھا کہ حقیقت کیا کہتی ہے۔



ہم اسی جانے پہچانے راستے پر سفر کر رہے تھے۔ اور کلنی دیر کے بعد ہمیں کاشل منگانو کا پراسرار مکان دور سے نظر آنے لگا۔ لیکن ابھی ہم عمارت سے کلنی دور تھے کہ فضا گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ اور ہم سب چوکنے ہو گئے۔ شار نے حیرانی کے ساتھ کہا۔

”یہ کیسی آوازیں ہیں؟“

”گولیوں کی آوازوں کا رخ کسی مکان کی طرف سے آ رہا ہے۔“ قاسم خان نے کہا۔

”منتشر ہو جاؤ۔ ہماری تعداد زیادہ نہیں ہے کہ اگر وہ بہت زیادہ ہوئے تو ہم ان کا مقابلہ کر سکیں ویسے تم سب لوگ مسلح ہو نا۔“

”تقریباً“ شار نے جواب دیا ہمارا ساتھی شاہ رو خاموش تھا۔ اس نے ابھی تک اپنی کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر میرے اشارے پر ہم سب دور دور تک منتشر ہو گئے۔ لیکن فاصلہ اتنا اختیار کیا تھا کہ ایک دوسرے پر نگاہ رکھ سکیں۔ اشارے بھی کر رہے تھے۔ ویسے قاسم خان میرے قریب تھا۔ آہستہ آہستہ ہم لوگ اس عمارت کی جانب بڑھ رہے تھے اور پھر کچھ دیر کے بعد گولیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ہم خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے آہستہ آہستہ ہم کچھ اور قریب پہنچے اور اس کے بعد میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ تو وہ لوگ رک گئے پھر میں نے انہیں اپنے قریب بلا لیا تھا۔

”گولیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ اور ایک بھی گولی ہماری طرف نہیں آئی۔ اس کا مقصد ہے کہ ان کا شکار ہم نہیں تھے۔“

”جو کچھ ہوا ہے عمارت کے اندر ہی ہوا ہے۔“

”لیکن ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”کون تھے؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”وہ.... وہ.... سردہا.... سردہا.... بوڑھے نے جواب دیا۔
 ”کتنے افراد تھے؟“

”میں نہیں جانتا۔ انہوں نے میرے آدمیوں کو قتل کر دیا پھر جب میں نے سیگا کو بچانے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ میں ان کا راستہ نہیں روک سکا۔“

”کیا وہ سندالی تھے؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”ہاں! ہاں“ ان کے درمیان سروہا بھی تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ آہ! میں تم سے اور بھی کچھ کتنا چاہتا ہوں اور بھی کچھ کتنا چاہا ہوں میں تم سے....“
 ”ہاں ہاں“ بولو۔ کاشل بولو۔ یہ تمہارا آخری وقت ہے، آخری وقت میں ہر انسان بچ بولتا ہے۔“ قاسم خان نے اسے بدستور جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”وہ سندالی تھے۔ سروہا بھی سندالیوں کے لئے کام کر رہا ہے اور میں.... میں نے بھی ان کے لئے کام کیا تھا۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں نے اپنے لوگوں سے اپنے آدمیوں سے اپنی زمین سے اپنی قوم سے غداری کی جس کی مجھے سزا ملی ٹھیک ہے۔ لیکن سیگانے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی رہی کہ سندالی قابل بھروسہ نہیں ہیں۔ میں ان پر بھروسہ نہیں کروں۔ لیکن میں نے اپنی بیٹی کا کہا کبھی نہیں مانا۔ میرے ساتھ کچھ بھی ہو جاتا لیکن سیگا.... سیگا.... سیگا۔“ اس کی زندگی کا چراغ بجھنے لگا تو میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

”تم بتا سکتے ہو کہ وہ سیگا کو کدھر لے گئے ہیں؟“

”کرامہ۔“ اس نے کہا اور اچانک ہی اسے زور کی پٹکی آئی۔ اور اسکے منہ سے خون کی پھوار ابل پڑی۔ پھر ہماری کوئی کوشش اسے زندگی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ قاسم خان نے ہونٹ سکڑے اور آہستہ سے بولا۔

”اتنی مختصر زندگی کے لئے لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں؟“ میں نے اس کی آنکھیں بند کیں پھر قاسم خان سے کہا۔

”جنگلی جانوروں کی طرح فوراً عمارت میں نہیں گھسنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں نے ہمیں یہ گولیاں چلا کر متوجہ کیا ہو۔ اور اندر وہ سب ہماری ٹاک میں بیٹھے ہوئے ہوں۔“

”تو پھر کیوں نہ انتظار کر لیا جائے۔“ پہلی بار شاہ رو نے کہا۔
 ”ہاں! یہی زیادہ بہتر ہے۔ پھر تھوڑی دیر تک انتظار کیا گیا لیکن کچھ نہیں ہوا۔ تب میں نے کہا۔

”کیا خیال ہے۔ میں عمارت کے اندر جاتا ہوں۔ تم لوگ باہر رہو۔ اندر اگر خطرہ محسوس ہو تو فائر کر کے اطلاع دے دوں گا۔“

”کیا گھوڑے پر بیٹھ کر جاؤ گے؟“ قاسم خان نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ قاسم خان اپنے گھوڑے سے اتر گیا۔ میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا بہر حال وہ میرا اچھا ساتھی تھا۔ اور صحیح معنوں میں سچا ساتھی تھا۔ باقی لوگ جو کچھ تھے۔ ان کا تعلق ہمیں سے تھا۔ ہم نے ان پر بھروسہ تو بے شک کیا تھا لیکن مکمل بھروسہ نہیں کر سکتے تھے جبکہ قاسم خان کی بات ہی کچھ اور تھی ہم نے اپنے دونوں گھوڑے شار کے حوالے کئے اور آہستہ آہستہ عمارت کی جانب بڑھنے لگے۔ عمارت میں ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ ہم عمارت کے اندر داخل ہو گئے اور ہمیں کوئی آواز نہ سنائی دی تو میرے اشارے پر قاسم خان نے آوازیں دیں۔

”کوئی ہے یہاں؟ کوئی ہے تو جواب دو۔“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ پھر ہم دونوں اندر داخل ہو کر اس کمرے کی جانب بڑھے جہاں ہم نے قیام کیا تھا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم چونک پڑے۔ بوڑھا کاشل کمرے کے فرش پر زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اس کا خون زمین پر بہہ رہا تھا میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اسے ہلا جلا کر دیکھا تو اس میں زندگی کے آثار باقی تھے۔ لیکن وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ میں نے اسے زور زور سے ہلایا تو کاشل نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہلے اور پھر بمشکل تمام اس کے منہ سے آواز نکلی۔

”وہ.... وہ درندے سیگا کو اٹھا کر لے گئے۔“

کوئی اور ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔“
 ”تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“
 ”کرامہ کی جانب سفر۔“
 ”کیا وہ لڑکی کو لے کر وہیں جائے گا؟“
 ”اگر اس نے اسے اغوا کیا ہے تو۔“
 ”تو پھر چلیں۔ یہاں رکنا تو بے کار ہی ہے۔“
 ”ایک مشورہ دوں۔“ قاسم خان نے کہا۔
 ”کیا؟“

”یہاں ہمیں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرنی چاہئیں۔ ان کا ذخیرہ ہمارے پاس ہو تو اس سفر میں آسانی رہے گی اور ہم ذرا زیادہ احتیاط سے یہ سفر کر سکیں گے۔“
 ”بہت مناسب، لیکن زیادہ نہیں۔ ویسے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو سردہا سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ میں ان سے بھی سردہا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”آؤ پھر ہم خوراک تلاش کریں۔“ اور خوراک کا ذخیرہ جمع کرنے میں ہمیں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں میں نے شار سے پوچھا۔

”ہم کتنے عرصے میں کرامہ پہنچ جائیں گے۔“

”سفر کی رفتار اگر مناسب رہے تو سورج غروب ہونے سے پہلے۔“

”ٹھیک۔“ اور اس کے بعد ہمارے گھوڑے دوڑنے لگے۔ شار ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تین اور بھی افراد موجود تھے۔ جن کے رویے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر حالت میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ شار اس وقت ہمارے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر چل رہا تھا۔ ویسے قاسم خان اس سے باتیں کرتا جا رہا تھا یہ باتیں بے شک میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ قاسم خان خاصا چالاک آدمی ہے۔ یہ طویل سفر اس وقت ختم ہوا جب فضا میں شام کے سائے اتر رہے تھے۔ ہمیں دور سے عظیم الشان بستی کرامہ نظر آ رہی تھی۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ کرامہ میں کون

”اب کیا کریں؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کتا ہے کہ یہاں اس کے آدمی موجود تھے۔“

”ہاں! گولیوں کی آوازوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب قتل ہو چکے ہیں اور اگر ہم تلاش کریں تو ہمیں یہاں کچھ لاشیں مل جائیں گی۔ تو پھر اب کیا کیا جائے؟“
 ”بے کار ہے آؤ باہر چلیں۔“ میرے اوپر نہ جانے کیوں ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی حالانکہ کاشل مگناؤ کے بارے میں مجھے یہ علم ہو چکا تھا سیگا کی زبانی کہ وہ سندالیوں کا آلہ کار بن گیا ہے لیکن بہر حال اس وقت اس بوڑھے کی موت نے مجھے بد دل کیا تھا باہر شاہ رو، شار وغیرہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں اندر کی کہانی سنائی تو شار نے کہا۔

”اس کا کہنا یہ ہے کہ سردہا اس کی بیٹی کو اغوا کر کے کرامہ لے جانا چاہتا تھا۔“

”ہاں! اس نے یہی کہا۔“

”لیکن مجھے یقین ہے کہ سردہا سندالیوں کے ساتھ کرامہ کی جانب کبھی سفر نہیں کرے گا۔“

”کیوں؟“

”اس طرح اسے پہچان لئے جانے کا خطرہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کرامہ کے لوگ سبھی سندالیوں کے حق میں نہیں ہیں۔ سردہا کے بارے میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ وہ سندالیوں کا آلہ کار بن گیا ہے۔“

”اوہ۔ گویا سردہا کی بستی کے دوسرے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔“

”شدید نفرت۔“

”لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے سیگا کو کیوں اغوا کیا ہے؟ ویسے یہ بڑی تعجب کی بات ہے۔“

”میرے لئے بھی۔“ شار نے کہا۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ سردہا سب کچھ ہے، لیکن اس طرح کا آدمی نہیں ہے۔ مجھے تو یہ

”بببا دارم کیا سروبا کے بارے میں کوئی نئی بات بتا سکتے ہو۔“ بببا دارم نے چونک کر شار کو دیکھا پھر بولا۔

”کیا تم میں سے کوئی شہباز ہے؟“ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت سے انوکھے واقعات ہوئے تھے۔ یہاں بہت سے معاملات پر میں حیران رہا تھا۔ لیکن میرا نام ان لوگوں تک کیسے پہنچ گیا ہے۔ یہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ میری بجائے شار نے کہا۔

”حیران نہ ہو نوجوان دوست! بڑے عجیب ذرائع سے شہباز کا نام ہمارے درمیان پہنچا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو اس نام کے بارے میں معلوم ہے۔ انہیں یہ ہدایت ہے کہ کسی اجنبی کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اور جو کچھ انہیں معلوم ہے۔ اسے اپنے آپ تک ہی محدود رکھیں۔“

”بببا دارم سروبا اس وقت کہاں ہے؟“

”ایک اور بستی میں جس کا نام زراٹا ہے۔ سروبا اس وقت تمہیں زراٹا بستی میں ملے گا اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے جو بڑا حیران ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تمہیں بتاؤں اگر تمہارے سامنے میں اس کا نام لوں گا تو تم بھی حیران رہ جاؤ گے۔“

”کون ہے وہ؟“

”رنگ۔ وہ رنگا ہے۔“ درحقیقت اس نام کو سن کر شاہ رو اور شار دنگ رہ گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ رنگا کون ہے؟ ایک رنگا پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ لیکن وہ مرچکا تھا۔ اب یہ دوسرے رنگا کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے یہاں نام اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔

”یہ لوگ کیا کرتے پھر رہے ہیں بببا دارم۔“

”یقین کرو میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں سروبا کی تلاش ہے؟“

”شدت سے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں کہ شاید کوئی نہ جانے۔ کیا تم لوگوں میں

کون سے ہنگامے ہمارے منتظر ہیں۔ شار نے بستی کا رخ سامنے کی سمت سے نہیں کیا اور کافی فاصلے پر جنگل میں رک کر کہا۔

”سورج تھوڑا سا ڈوب جائے تو ہم بستی میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ ہم سامنے سے نہیں جائیں گے۔ میں ایک ایسا راستہ جانتا ہوں جس سے ہم آسانی سے بببا دارم کے گھر پہنچ سکیں گے۔“

”بببا دارم کون ہے؟“

”سندالیوں کا سب سے بڑا دشمن۔ سروبا پر نظر رکھنے والا اور بستی کرامہ کا ایک معزز آدمی۔“ پھر ہم نے اسی وقت دوبارہ سفر شروع کیا تھا۔ جب رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ اور ہم اس مکان پر پہنچ گئے تھے جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور بستی کے عام مکانوں سے ذرا الگ ہٹ کر تھا۔ چند لمحوں کے بعد شار نے دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھا آدمی دروازہ کھولنے آگیا۔ اس نے شار کو فوراً پہچان لیا تھا اور اس کے لہجے میں مٹھاس گھل گئی تھی۔

”ارے بیٹا شار۔ تم آؤ اندر آ جاؤ۔“

”بببا دارم۔ میرے ساتھ کچھ مہمان بھی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ مہمانوں کے لئے تو دل کشادہ ہوتے ہیں۔ انہیں اندر لے آؤ۔ تمہیں معلوم ہے کہ دارم کا دل کتنا وسیع ہے۔“ ہم سب اس قوی ہیکل بوڑھے کو دیکھ رہے تھے جو کافی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بہترین صحت کا مالک تھا۔ بوڑھے نے اپنے گھر کے وسیع احاطے میں ہمارے لئے انتظام کیا۔ میں اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ تب بوڑھا کہنے لگا۔

”ان لوگوں سے میرا تعارف کراؤ کون ہیں۔“

”بببا دارم آپ کا تعارف تو ہم سے ہو چکا ہے۔ ہم آپ کے لئے بالکل اجنبی لوگ ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ زبردستی آپ کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور یہاں کام کر رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں میں ہر طرح سے تم لوگوں کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ بتاؤ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔“ وہ قریب ہی بیٹھ گیا تو شار نے کہا۔

سے کسی کو یہ بات معلوم ہے۔ شاید شار کو بھی نہیں کہ بہت عرصہ گزرا وہ مجھے زخمی حالت میں ایک دریا کے کنارے بے ہوش پڑا ملا تھا۔ میں صرف انسانی ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اسے اپنے ساتھ لے آیا اور اس کا علاج کیا حالانکہ وہ شدید زخمی تھا لیکن بہت ہی سخت جان تھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ وہ ایک گوشے میں میرے پاس ہی پڑا رہتا تھا وہ اس طرف۔" بوزے دارم نے ایک طرف اشارہ کیا پھر بولا۔

"کیس نہیں آتا جاتا تھا۔ کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ کوئی صحیح جواب نہیں دے سکا۔ پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ کئی دن تک واپس نہیں آیا۔ لیکن جب واپس آیا تو اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ دولت کہاں سے آئی۔ اس نے اسے چھپا کر رکھا تھا۔ شار جانتا ہے کہ میں مختلف قسم کا آدمی ہوں۔ مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ وہ مجھ سے کتنی غرض رکھتا ہے یا میں کسی کے کتنا کام آسکتا ہوں۔ دل تو چاہا تھا کہ اس سے دولت کے بارے میں پوچھوں۔ لیکن اگر اسے بتانا ہوتا تو وہ خود ہی بتاتا۔ پھر وہ ایک معزز شخص کی حیثیت سے کرامہ کا باشندہ بن گیا۔ دولت میں اتنی ہی قوت ہوتی ہے کہ وہ باآسانی کسی کو بھی عزت دار بنا دیتی ہے۔ جب کہ سروہا کوئی عزت دار آدمی نہیں تھا۔ ایک برا انسان تھا۔ وہ اب میرے گھر سے چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے لئے جگہ بنالی تھی اور بہت سے لوگ اس کے ارد گرد پھیل گئے تھے۔ بہت سے معاملات میں اس کے بارے میں عجیب و غریب کیفیتیں محسوس کرتا تھا۔ لیکن اپنی طبیعت کے مطابق خاموش ہی رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں مجھے معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے نوجوانوں کو اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ اور ایک عجیب و غریب کہانی انہیں سنائے لگا تھا وہ کہتا تھا کہ ان آبادیوں میں بڑا انتشار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر طاقت ور شخص نے اپنی قوت جمع کر کے اس آبادی کو ٹکڑوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے اور اس طرح وہ قوت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ اگر اس قوت کو کسی ایک طاقتور ہاتھ میں دے دیا جائے تو ان علاقوں کی تقدیر بدل جائے اور یہاں وہ ہو جائے جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ کہتا کہ کاش ایک بڑا علاقہ اسے حاصل ہو جائے۔ اور وہاں وہ وہ سب

کچھ کر کے دکھائے جس کے نتیجے میں ان علاقوں میں اس کے مجتے بنائیں جائیں۔ لوگ اس کی پوجا کریں۔ اس کے ساتھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس سے بہت کچھ ملتا تھا۔ وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور پھر اس نے بہتی میں اور بہتی کے باہر ایسے لوگوں سے ملاقاتوں کے سلسلے شروع کر لئے جو دولت کے لئے اپنا سب کچھ بیچنے پر آمادہ ہوں۔ سروہا کو میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سروہا کوئی خطرناک کام کر ڈالے۔ ایسی صورت میں اسے ہم بہتی کے لئے خطرناک بھی کہہ سکتے تھے۔ وہ بہتی کے مظلوم لوگوں کی فریاد پر اپنے آپ کو ایک بڑا آدمی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن میرا اپنا یہ اندازہ تھا کہ وہ سندالیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ پھر ایک دن میں نے اسے کچھ پریشان دیکھا اور اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن اس نے ٹال دیا تھا۔ وہ مجھے کافی بے چین نظر آتا تھا اور اس کے بعد مجھے شار سے حقیقت حال معلوم ہوئی۔ شار اسے صورت سے نہیں پہچانتا تھا اتفاقاً ایک بار اس نے سروہا کو ایک خانقاہ میں دیکھا اور اس خانقاہ میں وہ سندالیوں سے کچھ سودے بازی کر رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سندالی جنوب کے علاقوں میں جو ویران پڑے ہوئے ہیں جمع ہو رہے ہیں اور کسی بہتی پر حملہ کر کے اپنے ناپاک مقاصد پورے کرنے والے ہیں۔ میں نے اس کے باوجود شار کو سروہا کی بارے میں تفصیل نہیں بتائی۔ یہ خاموشی اختیار کر کے میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اسے سمجھاؤں گا۔ اس سے کہوں گا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس سے اس کی جان بھی جاسکتی ہے کیا سمجھے۔ بس مجھے اس کے ذریعے جو معلوم ہوا وہ اتنا ہی تھا کہ سندالی کوئی طلسمی چکر چلا کر یہاں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس طلسمی چکر کے بارے میں آپ کو کچھ تفصیلات معلوم ہیں بابا دارم۔" میں نے سوال کیا۔ بابا دارم کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ایک بہتی ہے جسے ہم دلارام کے نام سے جانتے ہیں۔ دلارام کے جنوب میں ایک گھاٹی ہے اس گھاٹی کو سرخ پتھروں کی گھاٹی کہا جاتا ہے۔ سرخ پتھروں کی گھاٹی سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ وہ لوگ میرا مطلب ہے قرب و جوار

اس بستی میں ہم نے کئی دن قیام کیا۔ شاہ رو، شار اور بقیہ دوسرے افراد بھی پرسکون طریقے سے وقت گزار رہے تھے۔ ہمارے باؤفا گھوڑے بھی تازہ دم ہو گئے تھے۔ البتہ اب قاسم خان بہت بے چین نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”کیا سمجھتے ہو تم کیا ہم یہاں سے کبھی زندہ واپس اپنی بستی میں جا سکیں گے۔“

اس کا لہجہ کسی قدر ناخوش گوار تھا۔ نہ جانے کیوں میرا بھی پارہ چڑھ گیا۔ میں نے سکون سے کہا۔

”شاید نہیں۔“

”تو پھر تم اس کے لئے تیار کیوں ہوئے تھے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے غصیلی نگاہوں سے قاسم خان کو دیکھا۔

”دولت دولت دولت۔ اس دولت کو ہم بھاڑ میں جھونکیں گے۔ جو ہمارے کسی کام نہ آ سکے۔“

”شاید وہ دولت ہمیں کبھی حاصل ہی نہ ہو۔“

”پھر تم یہاں کیوں آئے تھے؟“

”اور تم یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔“ میں نے خونخوار نگاہوں سے قاسم خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے چہرے کے نقوش بدلے اور اس نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

”یار میری بے وقوفی کی باتوں کو محسوس مت کرو۔ درحقیقت میں بہت پریشان ہوں۔“

”اور میں بھی خوش نہیں ہوں۔ کیونکہ اس وادی میں زندگی کی تلاش ایک مشکل کام ہے۔“

”ہاں! لیکن کیا ہی افسوس کی بات ہے کہ ہم ایک بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو

کی بستی والے اس گھاٹی کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ وہ دیوتاؤں کا مسکن ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سرخ چمکدرا پتھر چمکتے ہیں سورج کی روشنی سے یا چاند کی چاندنی سے تو ان کی شعاعیں آگ کا منظر پیش کرتی ہیں۔ یہاں سے خاصا فاصلہ ہے اس گھاٹی کا۔ سرخ پتھروں کی گھاٹی کا خاص طور سے ان معاملات سے گہرا تعلق ہے۔ ویسے بھی وہاں خشک پہاڑوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے بارہا یہ سنا کہ سردہا اس گھاٹی کی طرف جاتا ہے۔ اور گھاٹی کی طرف جانے کے لئے دریا یہیں سے عبور کیا جاتا ہے۔ وہ دریا کے بہاؤ کے خلاف کنارے کنارے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اور گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے بھی وہ گھاٹی یہاں سے دو دن کے فاصلے پر ہے۔“

”کیا ایسا تو نہیں ہے بابا دارم کہ سرخ پتھروں کی اس گھاٹی پر سندالی اپنا قبضہ جماتا چاہتے ہوں۔ کیونکہ سرخ پتھر بے حد قیمتی ہوتے ہیں۔ ہماری زبان میں انہیں یا قوت کہا جاتا ہے۔“

”اگر تمہیں وہاں کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں اور زرا نا بستی کے آس پاس تم اس جانب قدم بڑھاؤ تو وہاں تم شانم سے ضرور ملنا۔ شانم زرا نا بستی کا سردار ہے۔ وہ وطن پرست ہے۔ اور اس سلسلے میں تمہاری بڑی مدد کر سکتا ہے۔“

”سردہا کے بارے میں بتاؤ۔“

”میں تمہیں بتاؤں۔ اگر سردہا کو تلاش کرنا چاہتے ہو تو زرا نا بستی کی جانب سفر کرو۔“

”آہ! وہ ایک ایسی لڑکی لے کر فرار ہوا ہے جو ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی کاشل منگانو کی بیٹی سیگا۔“ اور اس کے بعد ہم نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔



”نہیں ہمیں اس برق رفتاری سے ادھر نہیں دوڑنا چاہئے۔“
”کیوں؟“

”یہ ہمارے دشمنوں کا علاقہ ہے۔ کہیں ہمارے لئے کوئی جال نہ بچھایا جا رہا ہو۔
سندالی ایسے کاموں کے ماہر ہوتے ہیں۔“
”لیکن ہم انہیں نظر انداز بھی تو نہیں کر سکتے۔“
”تو پھر؟“

”ہوشیار رہو۔ آگے بڑھ کر دیکھنا ضروری ہے۔“ بہر حال کوئی بھی انہیں نظر انداز
کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ان کے قریب پہنچ گئے اور وہاں
ہم نے جو منظر دیکھا وہ ہمیں حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ شار کے منہ سے ایک تعجب
بھری چیخ نکلی۔

”آہ! رب عظیم کی قسم یہ تو سروہا اور رنگا ہیں۔“ ہم گھوڑوں سے اتر پڑے اور
ہم نے جھک کر ان لاشوں کو دیکھا۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے اور ان کے
اطراف میں پڑا ہوا خون سوکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کی لاشیں کئی دن سے
یہاں پڑی تھیں۔ چونکہ سخت دھوپ اور گرمی تھی اس لئے ان پر ایک عجیب رد عمل
ہوا تھا۔ یعنی یہ لاشیں سڑی نہیں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں شاید مردہ خور
ہندے بھی موجود نہیں تھے۔ ورنہ ان کے اعضا بکھرے پڑے ہوتے۔ ہم انہیں خوف
اور دہشت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ شار کے ساتھ آئے ہوئے لوگ رانٹلیں
بدھی گئے ادھر ادھر نگاہیں جمائے دیکھ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔
”انہیں ہلاک کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ اگر یہ سروہا ہے تو اس کے ساتھ سیگا کو
بھی ہونا چاہئے تھا۔“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کے ایما پر ان کا خاتمہ کیا
گیا ہو کیونکہ یہ دونوں اب سندالیوں کے لئے بیکار ہو چکے تھے۔“
”میرا بھی یہی خیال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سندالیوں نے انہیں راستے سے ہٹا
لہنا راستہ صاف کیا ہے۔“

”مگر یہ یہاں تک کیسے پہنچے؟“

گئے۔ خیر زندگی تو ویسے بھی دلچسپ نہیں تھی۔ بس یوں سمجھ لو کہ گزارا کر رہے تھے
اور وقت گزر رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے دولت حاصل ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن سب کچھ
چھین گیا۔ افسوس افسوس۔“

”جب کوئی قدم اٹھا لیا جائے تو پھر اس کے نتائج کے لئے بھی اپنے آپ کو تیار
رکھنا چاہئے۔ مجھے بالکل پرواہ نہیں ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہماری اپنی دنیا میں بھی
ہمارے جرائم کے سلسلے میں کسی بھی وقت کہیں سے چلنے والی کوئی گولی ہماری زندگیوں
کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اگر یہاں ہمیں کوئی ایسا خطرہ پیش آ جاتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی
بات نہیں ہوگی۔“ قاسم خان ایک بار پھر ہنس پڑا۔ اس نے کہا۔
”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں پیش آ سکتا۔“
”جب تم یہ بات جانتے ہو تو پھر مجھ سے فضول باتیں کر کے میرا دماغ کیوں
خراب کرتے ہو۔“

”یار بس کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی ہوتا ہے۔“
”نہیں میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسی کوئی بات دوبارہ نہ کہنا۔ میرا اپنا
ذہن بھی خراب ہوتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں ان ساری ہنگامہ آرائیوں سے خوش
ہوں۔ لیکن ٹھیک ہے ہم نے خود یہ سب کچھ خریدا ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں کہہ
سکتے۔“ پھر چوتھے دن ہمارے گھوڑے بستی زارنا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل
کر کے چل پڑے۔ وہ سب ہمارے ساتھ تھے۔ شار راہنمائی کر رہا تھا۔ شاہ رو ہمارا
ساتھ دے رہا تھا اور باقی افراد بھی تمام ضروری اقدامات کر کے نکلے تھے۔ ہماری خواہش
تھی کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے خاصا سفر طے کر لیا جائے۔ تاکہ قیام کے لئے کوئی
عمدہ جگہ تلاش کر لی جائے۔ چنانچہ یہ سفر بڑی مستعدی سے کیا جا رہا تھا۔ ہم سب
خاموش تھے۔ قاسم خان مجھ سے بات کرنے کے بعد کافی محتاط ہو گیا تھا اور یہ ایک
اچھی بات تھی۔ کیونکہ خود میرا ذہن بھی صاف نہیں تھا۔ بلاوجہ کی تلخی ہو جاتی ہمارے
درمیان بہر حال ہمارا پہلا دن تھا اور اس وقت ہم ایک سنگلاخ چٹانی راستے سے گزر
رہے تھے کہ ہم سبھی نے دور سے ان دو انسانوں کو دیکھا جو زمین پر پڑے ہوئے تھے
اور ہم بری طرح چونک پڑے۔ اچانک ہی شاہ رو نے کہا۔

چرے پر افسوس کی ایک رمت بھی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ انہیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ شام موجود ہے اور اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ پورا گروہ ان لاشوں کو لے کر سردار کے جھونپڑے کے سامنے پہنچ گیا۔ میرے اشارے پر یہ لاشیں نیچے اتار دی گئیں۔ بستی کے بہت سے لوگ ہمارے پیچھے پیچھے ہو لئے تھے۔ انہوں نے بھی سردار اور رنگا کی لاشیں دیکھیں۔ لیکن کوئی کچھ کہنے پر تیار نہیں تھا۔ البتہ شام نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”سردار بہت اچھا انسان تھا۔ اس کے پاس جتنی دولت موجود تھی اس کے بعد اسے دولت کے جال میں نہیں گرفتار ہونا چاہئے تھا۔ لیکن افسوس! اس نے دولت کی ہوس میں موت کو اپنا لیا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ سندالیوں کو اس کی ضرورت کیوں باقی نہ رہی تھی؟“

”میں اس سلسلے میں جانتا ہوں۔ کہ کون اس کے پس منظر میں ہے۔“

”ٹھیک ہے اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔“

”ہمیں راہنمائی کی ضرورت ہے سردار شام۔“

”تم لوگ قیام کرو۔ ان لاشوں کو میرے حوالے کر دو۔ میں ان کی تدفین کئے دیتا ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر مجھے خوشی ہو گی۔ ویسے شام تم نے ان کا تعارف نہیں کرایا مجھ سے۔“

”سردار شام یوں سمجھ لو یہ ہماری بستیوں کے لئے نجات دہندہ کا نام رکھتے ہیں۔“

”آہ! کیا شہباز۔“ شام نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں! یہ شہباز ہے۔ اور یہ اس کا ساتھی قاسم خان۔“ پھر اس نے تمام لوگوں کا تعارف کرایا اور ہمیں ایک بہت بڑے احاطے میں پہنچا دیا گیا جس کے بعد فوری طور پر بکری ذبح کر کے بھونے جانے لگے ان میں ہم بھی شامل تھے۔ کیونکہ ان جنگیوں کے ہاتھوں کا گوشت ہم نہیں کھا سکتے تھے ہم کچھ بھی تھے لیکن اپنے مذہب سے بیگانہ نہیں تھے۔ شام کی خوراک کے بعد قاسم خان نے میرے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔ لیکن افسوس کاشل کی بیٹی سیگا پتہ نہیں کس مشکل کا شکار ہے۔“ قاسم خان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سیگا تمہارے ذہن پر بری طرح سوار ہے۔“

”ہاں! اس نے میری مدد کی تھی۔ میرے لئے اس نے اپنے باپ کے مقاصد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے اس کی بے حد فکر ہے۔“

”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سندالی اسے اپنے ساتھ لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“ اشارہ روئے کہا۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ کاشل مگنا کو بھی سندالیوں کے لئے کام کر چکا ہے اور اگر بستی والوں کو مطلب یہ کہ ان لوگوں کو جو سندالیوں کے لئے کام کر رہے ہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ سندالی کسی کے ساتھ بھی غداری کر سکتے ہیں تو پھر سندالیوں کو وہ سب کچھ نہیں ملے گا جو وہ چاہتے ہیں۔“

”بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔“

”اب کیا کیا جائے؟“

”ہم ان لاشوں کو یہاں تو نہیں چھوڑیں گے۔“

”تو پھر؟“

”بستی والوں کے لئے یہ لاشیں ایک تحفہ ثابت ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”کیس ہمارے لئے ہی مشکل نہ بن جائے۔“

”نہیں ہم زرا نا کے سردار شام کو یہ لاشیں پیش کریں گے۔“ میں نے فیصلہ کن

لہجے میں کہا۔ پھر ہم نے یہ لاشیں گھوڑوں پر ڈالیں اور زرا نا کی طرف تیز رفتاری سے سفر کا آغاز کر دیا۔ جس وقت ہم بستی زرا نا میں داخل ہوئے شام ڈھل چکی تھی۔ اور بستی میں روشنیاں جل چکی تھیں۔ بستی میں داخل ہوتے ہی جس کی نظر بھی ان لاشوں پر پڑی وہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔ سنجیدہ فکر کے لوگوں نے ان لاشوں کو دیکھا تو کوئی تعجب نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ہوا کا رخ دیکھ چکے تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ دونوں افراد دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر چکے ہیں اور غداری کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی کے

نے دیکھا کہ ہندانہ نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا ہے اور اس کے بعد خاموشی سے اٹھ کر غار کے آخری سرے کی جانب چل پڑا ہے۔ یہ ایک رسم ہے ہمارے ہاں کی کہ جب کسی بڑے آدمی کو اس طرح غاروں میں رکھ دیا جاتا ہے تو پھر دور دور تک کوئی پلٹ کر اسے نہیں دیکھتا اور لوگ وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جاتے ہیں۔ ہندانہ غار کے آخری سرے پر پہنچ کر میری نگاہ سے روپوش ہو گیا تھا اور میں شدت حیرت سے بیٹھا اپنا کانٹا نکالنا بھی بھول گیا تھا۔ پھر بہت دیر کے بعد جب نہ ہندانہ واپس آیا اور نہ اور کوئی تحریک ہوئی تو میں نے غار کے آخری سرے کو جا کر دیکھا۔ ہندانہ موجود نہیں تھا وہ اپنے جادوئی عمل سے باہر نکل گیا تھا۔ اس طرح مجھے اس کی زندگی کے بارے میں علم ہے۔ پھر مختلف ذرائع سے مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ ہندانہ کو جگہ جگہ دیکھا گیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو خاموش کر دیا جنہوں نے یہ اطلاع مجھے دی تھی۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہندانہ اس وقت سندالیوں کا راہنما ہے۔ سندالی بذات خود وحشیانہ فطرت اور وحشیانہ عقل کے مالک ہیں۔ لیکن انہیں تمام صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لئے ہم میں سے ایک شخص درکار ہے اور وہ ہندانہ سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔“

بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا میں اور قاسم خان بڑی دیر تک شام کو دیکھتے رہے پھر میں نے کہا۔

”سردار شام مجھے یاقوت کی وادی کے بارے میں بتاؤ۔“

”بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں میں کہ وہ سندالیوں کا آخری مسکن ہے اور شاید اس وادی طلسم کا سب سے آخری مرحلہ۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ۔۔۔۔۔۔“

”ہاں! میرا یہی خیال ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ ہمارا اگلا قدم وادی یاقوت کی جانب ہی ہو گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

قاسم خان گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا اور یہی کیفیت کچھ شام کی بھی تھی۔ شام نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن تم یہ سمجھ لو کہ سندالی اس وادی کی حفاظت اپنی زندگی سے زیادہ کرتے ہیں

”ویسے ایک بات کہوں شہباز! اس سے پہلے ہم نے جادو کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا یہ تو ایک الگ ہی دنیا ہے۔ جس کے دائرہ کار کی وسعت کا کوئی حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ تم کیا کہتے ہو اس بارے میں۔“

”نہیں بالکل ٹھیک کہتے ہو تم اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اگر کہیں اتفاق سے ان سارے معاملات سے بچ گئے تو یہ ہمارے لئے ایک بہت بڑی بات ہو گی جسے ہم کسی بھی طور نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

”بے شک۔“ رات کو جب ہم کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر چکے تو سردار شام ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ہم لوگوں کو بڑا اعزاز دیا اور کہنے لگا۔

”قابل احترام ہیں وہ جو ہمارے لئے اپنی آبادیوں کو چھوڑ کر یہاں تک آئے ہیں اور ہمارے لئے کام کر رہے ہیں۔ آہ! کاش اس کا بدلہ ہم بہتر انداز میں دے سکتے۔“

”شام تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”جو کچھ بھی مجھ سے درکار ہو مجھے بتا دینا۔ میں پورے خلوص سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ میں ان وطن پرستوں میں سے ہوں جو ان آبادیوں کو سندالیوں کی غلامت سے بچانا چاہتے ہیں۔ کاش اس سلسلے میں میری جان بھی کام آ جائے۔“

”تم نے ایک نام کا تذکرہ کیا تھا سردار شام اور اس کے بارے میں کہا تھا کہ تم ہمیں اس کے بارے میں بعد میں بتاؤ گے۔“

”اس نام کو اپنے آپ تک محدود رکھنا۔ یہ ان علاقوں کا سب سے بڑا جادوگر ہے۔ اس کا نام ہندانہ تھا۔ ہندانہ نے عین اس وقت اپنے آپ کو موت کا شکار کیا جب سندالیوں نے اپنے ناپاک عزائم کا آغاز کیا تھا۔ اور ہندانہ موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ لیکن یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا صرف میں جانتا ہوں کہ ہندانہ اصل میں مرا نہیں تھا وہ جس دم کا ماہر تھا۔ اور سانس روک کر اپنے آپ کو مرہ ظاہر کر سکتا تھا۔ اس وقت اس نے یہی کیا تھا۔ کیونکہ جب اس کی لاش تھوڑی دیر کے بعد پہاڑی غار میں رکھی گئی تھی اور عقیدت مند وہاں سے واپس پلٹے تھے تو اتفاق سے میرے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا اور شدید تکلیف تھی۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ کر اپنا یہ کانٹا نکال رہا تھا تو میں

کے انبار لگے ہوئے ہیں۔" یا قوت کوئی معمولی حیثیت تو نہیں رکھتہ ذرا غور کرو۔ ایک ایسی کھائی جس میں تاحد نظر ہیرے ہی ہیرے بکھرے ہوں۔ سرخ ہیرے جن کی روشنی چاند یا سورج کی روشنی سے منعکس ہو کر آگ کے شعلے بکھیر دیتی ہے۔ اگر ہم وہاں سے ایک گٹھڑی باندھ کر یا قوت اپنی دنیا میں لے جائیں تو ذرا غور کرو ہماری حیثیت کیا ہو گی۔" قاسم خان کی اس معصوم بات پر میں بے اختیار ہنس پڑا میں نے کہا۔

"قاسم خان اب یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان کس قدر ناپائیدار چیز ہے۔ ساری باتوں پر غور کر رہے ہو تم ایک بات پر تم نے غور ہی نہیں کیا۔"

"کوئی بات؟"

"تمہیں بار بار یہ بات کیوں بھول جاتی ہے کہ ہم ماضی میں ہیں۔"

"اس۔" قاسم خان نے پر خیال نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"اور یہ جتنے کردار ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ حال کے نہیں ماضی کے کردار ہیں۔ شاید وہ جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کیسے کیسے زبردست لوگ ہیں۔ لیکن تم نے دیکھا کہ وہ دنیا چھوڑ چکے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم بھوتوں کی وادی میں ہیں۔"

"تو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو۔"

"شہباز یہ فیصلہ تمہارا ہے میرا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کتنی عجیب بات ہے۔ تمہارے خیال میں کیا بھتیاں عشق کر سکتی ہیں۔" میں قاسم خان کے سوال پر ہنس پڑا میں نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"چلو۔ ہم دوسرے کی بات نہیں لیتے ایلاہ اور ایرا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ ماضی کا قصہ بن گئیں۔"

"اور یہ لڑکی سیگا۔ جس کی تلاش میں تم بھاگ رہے ہو۔"

"وہ بھی ماضی کی ہی کہانی ہے۔"

کیونکہ وہی ان کا مرکز ہے۔"

"کچھ بھی ہو سردار شانم۔ ہمیں یا قوت کی وادی میں جانا ہی ہو گا۔" سردار شانم پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر اس نے کہا۔

"بستی زرانا میں تمہیں کوئی مایوسی نہیں ہو گی۔ عزیز دوست تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنے کے ہم ذمے دار ہیں۔ کیونکہ تم اپنی دنیا سے دور صرف ہمارے لئے یہاں سرگرم عمل ہو۔ لیکن بہتر یہ ہو گا کہ میں اور بھی افراد تمہارے حوالے کر دوں تاکہ تمہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔" میں نے شکرگزاری کے انداز میں سردار شانم کو دیکھا اور کہا۔

"سردار شانم ہم اپنی حکمت عملی تیار کریں گے اور اسی کے تحت سارے کام کرنا چاہیں گے۔ بات اصل میں یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی افرادی قوت وہ کام نہیں کرتی جو عقل کی قوت کر جاتی ہے۔ بے شک تمہارا خلوص اور تمہاری محبت ہمارے لئے مشعل راہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کسی مقصد کی تکمیل میں تم جیسے محبت کرنے والے دوست شامل ہو جائیں تو پھر اس مقصد کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔" سردار شانم جذباتی انداز میں ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"آہ! تم نہیں جانتے تم نہیں سمجھ سکتے۔ سندالیوں نے ہمیں کس قدر مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب تو ہم ایک دوسرے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ سوچتے ہیں کہ کہیں وہ بھی سندالیوں کا آلہ کار نہ ہو۔ جب صورت حال ایسی کیفیت اختیار کر جائے تو پھر ہٹاؤ کیا کیا جاسکتا ہے۔ نہ کوئی اپنی سرداری کو سرداری کا درجہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی عمل کر سکتا ہے۔ تاہم میں تمہارے لئے ہر خدمت انجام دینے میں فخر محسوس کروں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" بہر حال ہم نے شانم کی ان پیش کشوں کو مسترد کر دیا تھا ہم اپنے طور پر مطمئن تھے کہ جو کچھ بھی کریں گے وہ اپنی مرضی سے کریں گے۔ یا قوت کی وادی اب ہمارے لئے کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ رات کو اپنی قیام گاہ میں قاسم خان نے مجھ سے کہا۔

"کیسی عجیب بات ہے شہباز کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر موجود ہیں جہاں دولت

”تو پھر اس کی تلاش میں بھاڑ میں کیوں اترا جائے۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ اپنے آرام کی زندگی ترک کر کے اس کے پیچھے بھاگیں۔“

”تو پھر کیا کو گے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”بھئی نکل چلو یہاں سے۔“

”راستہ معلوم ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”خدا کی قسم۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی پتھر اٹھا کر اپنے سر پر ماروں۔ اتنے الجھاوے ان الجھلوں میں ہماری کاوشیں آخر یہ سب کیوں ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہو چکا ہے۔“

”یہ انوکھا سحر جو ہمیں جکڑے ہوئے ہے۔ قاسم خان! پروفیسر لنگوتا ہمیں یہاں کئی روپ میں مل چکا ہے۔ کوئی ایسی گرہ بندھی رہ گئی ہے ماضی کی اس کہانی میں جسے وہ ہمارے ذریعے کھولنا چاہتا ہے۔ میں نے بس یہی اندازہ لگایا ہے۔“

”چاہے ہماری کمر میں اتنی گرہیں لگ جائیں کہ ہم انہیں ساری زندگی نہ کھول سکیں۔“

”ماضی کی یہ کہانی کسی انجام تک تو پہنچانا ہی ہوگی۔ اس کے بغیر ہمیں گلو خلاصی نہیں حاصل ہو سکتی۔ اگر تم سمجھتے ہو تو یہ بات سمجھ لو۔ ورنہ تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا اور قاسم خان برا سامنہ بنا کے بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یار زمانہ جدید کی گالیاں تو ماضی کی اس داستان میں بھی ناقابل فہم ہوں گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ میں گالیاں دینے کی بجائے سو جاؤں۔ وہ لیٹا اور اس نے کروٹ بدل لی۔ میں مسکرا کر آئندہ آنے والے واقعات کے خیالات میں گم ہو گیا تھا۔



دوسرے دن صبح کو سردار شانم نے ہمارے لئے بہترین ناشتے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ ہماری جتنی خاطر مدارات کر رہا تھا ہم اس کے لئے اس کے بے حد شکر گزار تھے۔ پھر ہم نے اپنے گھوڑے سنبھالے۔ سردار شانم نے ہمارے لئے راستے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ ہمارا رخ وادی یا قوت کی جانب تھا اور ہم نہ جانے کیسے کیسے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں سیگا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک کردار تھی جس نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے قاسم خان کو بتایا کہ ماضی کا ایک کردار جسے حل میں حاصل کرنے کا تصور بھی مذاق کی مانند تھا۔ صبح سے شام تک یہ سفر بغیر کسی دقت کے جاری رہا۔ جب اندھیرا ہوا تو شار نے دبی آواز میں مجھ سے کہا۔

”شہباز کیا یہ سفر جاری رکھو گے۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور کہا۔

”ارے شام ہو گئی۔“

”تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔“

”ہاں! میں سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یقین کرو مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے سفر کا آغاز کیا ہو۔“ شار ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔

”تم جذباتی بھی ہو اور ہوش مند بھی۔ لیکن اگر تم نے اندھیرے میں بھی یہ سفر جاری رکھا تو کل ہمارے گھوڑے تھکن کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس کے علاوہ اندھیری راتوں میں پہاڑوں کے درمیان سفر کرنا کسی حادثے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔“

”گھوڑے جس طرح سے سفر کرتے رہے ہیں اور اب تک جس انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ نہ تو یہ تھکے ہوئے ہیں اور نہ آگے سفر

معلوم کر سکتے یا جو ہمارا راستہ روکتا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار شاہ رو پر کیا۔ اور شار پر بھی لیکن ان میں سے کوئی بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا تھا۔ پھر ہم غار میں داخل ہو گئے۔ چونکہ رات ہو چکی تھی اس لئے غار کے اطراف کا جائزہ نہیں لے سکے تھے۔ گھوڑوں کو ہم نے یہ احساس دلایا تھا کہ جب وہ اپنی شکم سیری کر لیں تو غار کے بیرونی حصے میں آ سکتے ہیں اور کیا ہی زبردست جانور ہوتے ہیں یہ گھوڑے بھی۔ انہوں نے جیسے ہمارا مقصد بھی سمجھ لیا تھا اور ہماری بات بھی۔ چنانچہ وہ سب غار کے بیرونی حصے میں آ گئے۔ جب کہ ہم گرم غار میں آرام کی نیند سو گئے اور ایسے سوئے کہ کسی کو ہوش نہ رہا۔ ویسے چوکیداری کے لئے گھوڑے موجود تھے۔ اگر کوئی بیرونی ذریعے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا تو یقینی طور پر گھوڑے اس کا راستہ روک سکتے تھے۔ صبح کو جب ہم جاگے تو طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم مکمل طور پر تازہ دم ہو گئے ہوں۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اور ہم سوچ رہے تھے کہ جلد از جلد صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر ہم پھر سفر کا آغاز کر دیں۔ اور سورج کی سنہری کرنوں سے اپنے جسموں کو تازگی بخشیں۔ چنانچہ جلدی جلدی تیاریاں کی گئیں۔ اور ایک بار پھر راستے کا تعین کر کے ہم گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور آگے کی جانب کا فاصلہ طے کرنے لگے۔ شار ان راستوں پر ہماری بہترین راہنمائی کر رہا تھا۔ آج کا دن بھی پورا سفر میں گزر گیا۔ اور آخر کار شام ہونے تک ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کچھ عجیب و غریب کیفیات کا اظہار ہو رہا تھا۔ یعنی بہت پر اسرار علاقہ تھا یہ درختوں کے درمیان ایک معمولی سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ جس کے اطراف میں ایک بڑی سی جھیل بن گئی تھی۔ جھیل کے چاروں طرف درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ اتنے گھنے تھے کہ اگر سینکڑوں آدمی ان میں پوشیدہ ہونا چاہیں تو ان کا پتہ نہ چلے۔ اس کے پیچھے پہاڑی ٹیلوں کا طویل سلسلہ تھا اور شاید گہرائیوں میں ہیروں کی وہ وادی جس کا ابھی ہم اس لئے نظارہ نہیں کر سکے تھے کہ نہ تو اس وقت سورج بلند تھا نہ چاند نکلا تھا۔ قاسم خان نے بولنے میں پل کی۔

”میرے خیال میں یہ جگہ ہمارے آج کے قیام کے لئے بہترین ہے۔“

”ہاں! جگہ تو اچھی ہے کیوں شار! ویسے یہاں پوشیدہ رہنے کے لئے تو بڑے آرام

کرنے کے ناقابل۔“ قاسم خان نے کہا۔

”لیکن یہ جاندار ہیں۔ انہیں بھی ہماری طرح خوراک اور آرام کی ضرورت ہے۔ اگر میری بات مانو تو قیام کا انتظام کرو۔ اگر ہمارے گھوڑے ناکارہ ہو گئے۔ تو ہمارے لئے آگے سفر جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے تم مالک ہو۔ ہم صرف تمہارے احکامات کی پابندی کریں گے لیکن یہاں ہم سب کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔“ میں نے واقعی غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ جانور تو خیر اپنے احساس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ لیکن انسان ذرا مشکل محسوس کر رہے ہیں۔ البتہ جس طرح سے کہ یہاں کا موسم تھا اس کے مطابق آرام کرنے کے لئے ہمیں کسی پہاڑی غار کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ ورنہ سردی سے مر جاتے۔ میں نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی کہ کوئی محفوظ جگہ مل جائے ایسی جگہ جہاں انسانوں کے لئے ہی نہیں گھوڑوں کے لئے بھی آسانی کا بندوبست ہو۔ شار نے میری یہ بات محسوس کر لی اور بولا۔

”وہاں ایک سمت جو پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا ہے میں سمجھتا ہوں ہمارے اس مقصد کی لئے کافی ہے۔ اس کے دامن میں دیکھو۔ گھاس بھی موجود ہے اور وہ سامنے جو جگہ نظر آ رہی ہے۔ اس میں ایک کالا دھبہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ پہاڑوں میں بڑی بڑے غار موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں کوئی ایسا گرم غار مل جائے جو ہمارے آرام کا بندوبست کر سکے۔“

”آؤ۔“ میں نے کہا۔ ہم نے اپنے گھوڑے اس طرف دوڑا دیئے۔ گھوڑے بڑے سمجھ دار جانور ہوتے ہیں۔ اب تک وہ ہمارے اشاروں پر سفر کرتے رہے تھے لیکن اب جو انہوں نے پہاڑوں کے دامن میں ہری ہری گھاس دیکھی تو انہیں بھی یہ امید ہو گئی تھی کہ شاید ان کے مالکان ان پر رحم کرنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ رفتار تیز کر کے بہت جلد وہ جگہ پائی۔ جہاں ہم جانا چاہتے تھے۔ یہ ایک عظیم الشان پہاڑی غار تھا جس کے ڈھلانوں پر اتنی گھاس موجود تھی کہ آسانی سے گھوڑوں کا پیٹ بھرا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی غار کے بیرونی حصے میں گھوڑے آرام سے وقت گزار سکتے تھے۔ ابھی ہم نے اس پورے علاقے کو نہیں دیکھا تھا۔ ویسے اتنا طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی ہمیں کوئی ایسا فرد یا گروہ نہیں ملا تھا جس سے ہم کچھ

سے بندوبست کیا جا سکتا ہے۔“

”ایک بات کہوں۔“ شار نے کہا اس کے لمبے میں کچھ ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے شار کو دیکھا۔ لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا جیسے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے کہنے کے لئے اس کے پاس مناسب الفاظ نہ ہوں۔ کچھ لمحے انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا۔

”کیوں کوئی ایسی بات ہے شار جو تمہیں کہتے ہوئے دقت محسوس ہو رہی ہے۔“

”بات اصل میں یہ ہے شہباز کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ ذہین ہو۔ تم مجھ سے کہیں زیادہ اعلیٰ کارکردگی کے مالک ہو۔ تمہارے سامنے کچھ کہتے ہوئے مجھے ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ میں تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ لیکن ہم انہی جنگلوں کے رہنے والے ہیں۔ ہم وہ بات صحیح انداز میں نہیں کہہ سکتے جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ یہ جگہ مجھے کافی خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔ اور نہ جانے میرا دل کتنا ہے کہ اس جگہ قیام کرنا ہمارے لئے مناسب نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو شار۔ لیکن میری ایک بات کا جواب دو۔“ میری بجائے قاسم خان بول اٹھا اور شار اسے دیکھنے لگا۔

”یہاں ہم کسی دعوت یا شادی میں شرکت کے لئے نہیں آئے۔ بلکہ ہمارا مقصد ہی اپنے دشمنوں سے ٹکرانا ہے۔ یعنی سندالیوں سے اور کہیں کسی نہ کسی جگہ ہمارا ان کا بہر حال سامنا ہو گا۔ اگر ہم اس لئے اس جگہ کو خطرناک کہتے ہیں کہ یہاں ہمیں سندالیوں کے حملے کا خطرہ ہے تو یہ تو ہر جگہ ہو گا ہمیں اگر وہ ہم پر حملہ نہیں بھی کریں گے تو ہم آگے بڑھ کر خود ان پر حملہ آور ہوں گے۔ ہم صرف ان جنگلوں میں بھٹکنے کی لئے تو نہیں آئے۔“

”ایک بات بتاؤ شار۔ کیا تمہیں کسی خطرے کا احساس ہو رہا ہے۔“ اس بار شاہ رو نے سوال کیا تھا۔

”یہ گھنی جھاڑیاں اور درختوں سے لٹکتی ہوئی لمبی شاخیں دشمن کو ہم پر شب خون مارنے میں آسانی پیدا کر سکتی ہیں۔“ شار نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”پھر تو ہمیں قیام کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہندانہ کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آ

سکتے گا۔ اور ہم اسے وادی یا قوت میں ہی خوش آمدید کہیں گے۔“ شاہ رو نے کہا۔

یہاں تک کہ ہم ابھی کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ ہمیں دور سے کہیں گھوڑوں کی ہیناٹ سنائی دی اور ہم چونکے ہو گئے۔ چونکہ اس وقت ہم سب ایک ہی جگہ موجود تھے اور یہ آواز ہم میں سے کسی کے گھوڑے کی نہیں تھی۔ اس لئے یقینی طور پر کچھ اور لوگ تھے جو گھوڑوں پر آ رہے تھے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی اور یہ ایک دلچسپ اتفاق تھا کہ جن جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں ہم دشمنوں کے پوشیدہ رہنے کے خوف کا اظہار کر رہے تھے وہی ہماری پناہ گاہ بن گئیں اور ہم سب برق رفتاری سے ان میں داخل ہو گئے۔ ہم گھوڑوں سمیت ان گھنی جھاڑیوں میں گھس گئے تھے۔ لیکن ہم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہم ادھر نظر رکھ سکیں جدھر سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی تھی۔ اور پھر اچانک ہم نے ایک ٹیلے کی اوٹ سے چار گھوڑے سواروں کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ آبشار سے بننے والی جھیل سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر گھوڑے دوڑاتے ہوئے شمال کی چٹانوں کی طرف چل پڑے تھے۔ اور شمال میں چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔

”کیا خیال ہے، ان کا پیچھا کریں؟“ شاہ رو نے کہا۔

”آؤ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ چھپے رہنے سے تو بہتر یہ ہے کہ فاصلہ رکھ کر

تعاقب ہی کیا جائے۔ یہ اندازہ تو ہو یہ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟“

”کیوں نہ ہم انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیں۔“ قاسم خان نے کہا۔

”نہیں اگر ہم نے جلد بازی کی اور ان لوگوں کو نشانہ بنا لیا تو ہندانہ ہوشیار ہو

جائے گا اور اسے ہماری طاقت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اسی لئے ہمیں صرف خاموشی

سے اس کا سراغ لگانا چاہئے۔“ میری بات کو سب نے پسند کیا۔ اور پھر ہم نے آہستہ

سے اپنے گھوڑے درختوں کے جھنڈ سے نکالے۔ اور ان کا پیچھا کرنے لگے لیکن ایک

ایک قدم پھونک پھونک کر رکھا جا رہا تھا۔ اور ہم اس بات کا پورا پورا خیال رکھ رہے

تھے کہ گھوڑے سوار ہمارے تعاقب سے واقف نہ ہونے پائیں۔ آگے جا کر وہ چٹانوں

کے درمیان اچانک غائب ہو گئے تھے ایسا لگا تھا جیسے دور چٹانوں کے سلسلے نے انہیں

گھل لیا ہو ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ اچانک قاسم خان نے کہا۔

”شاید تم ہی ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ہم نے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے اس جھیل کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ اور گھوڑوں کو گھنے درختوں سے باندھ دیا۔ رات لمحوں میں سر پر آگنی تھی۔ موسم معمول کے مطابق سرد تھا۔ قاسم خان نے کہا۔

”خشک لکڑیاں جلا کر ہم سردی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔“

”اور یہ بے وقوفی کی دوسری بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”آگ کی روشنی ان لوگوں کو ہماری جانب متوجہ کر دے گی۔“

”ایک بات اور کہوں میں۔“ قاسم خان جھلا کر بولا۔

”جی فرمائیے۔“

”جھاڑیوں میں سانپ اور بچھو بھی ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن حشرات الارض ان درندوں سے زیادہ خوفناک نہیں ہیں جو انسانوں کی

شکل میں سامنے والے چٹانی سلسلے میں چھپے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ پھر مناسب جگہ منتخب کر کے کھانے پینے کا

بندوبست کیا گیا۔ اور اس دوران بہت سے فیصلے بھی کئے گئے۔ شار نے کہا۔

”وادی یا قوت کے گرد ان لوگوں کا گھیرا یہ بتاتا ہے کہ یہ اس وادی میں بھرپور

طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ اور ممکن ہے وادی کے ہیرے اپنے قبضے میں کر رہے

ہوں۔ سرخ پتھروں کا کاروبار بڑا منافع بخش ہو سکتا ہے اور باہر کی دنیا میں ان کی بڑی

عزت ہوتی ہے۔“

”تمہاری معلومات تو ہر سلسلے میں بہترین ہیں۔“ قاسم خان نے کہا۔

”ہونی چاہئیں۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”یہ کہ میرے اپنے خیال میں یہ ہماری آخری جگہ ہے۔ اور ہمیں سے ہم بہت

سے کام کر سکتے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”یہ کیا ہوا آؤ آگے بڑھیں۔“

”نہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں رک جانا چاہئے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ لوگ

چٹانوں میں کس جگہ گم ہوئے ہیں۔ اگر ہم ان کی زد پر آگئے تو۔“

”ہاں! بات درست ہے۔“

”ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہ علاقہ سندالیوں کا مکمل علاقہ ہے۔ اور یقینی طور پر

یہاں وہ اپنی کارروائیوں کو موثر طریقے سے سرانجام دے سکتے تھے۔ کیونکہ ادھر عام

لوگ نہیں آسکتے۔“

”اور ہمیں یہ اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہاں ان کی تعداد کتنی ہوگی۔“

”تب تو پھر واپسی کا سفر ہی زیادہ مناسب ہے۔“

”درختوں کے یہ جھنڈ جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے لئے خطرناک تھے۔ اب میں یہ

سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے بہتر ہیں۔ یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ ان علاقوں میں آزادانہ

نقل و حرکت کر سکتے ہیں۔ پھر چھپ کر کوئی کارروائی کرنے کی انہیں ضرورت نہیں ہو

گی۔“

”بالکل ٹھیک۔“

”تو پھر آؤ واپس چلیں۔“ میں نے اپنا گھوڑا واپسی کے لئے موڑ لیا اور سب نے

میری تقلید کی۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے قاسم خان کو میرا یہ قدم پسند نہیں آیا ہو۔ اس

بات کو سبھی نے محسوس کیا اور شار ہنس کر بولا۔

”جوانی میں بلا کا جوش و خروش ہوتا ہے، لیکن جوش عقل کا قاتل ہوتا ہے۔“

”اپنی عقل کو قتل کرو اور بہت زیادہ بڑھ بڑھ کر نہ بولو۔“ قاسم خان نے غصیلی

آواز میں کہا۔

”قاسم خان جو فیصلہ میں نے کیا تھا وہ درست ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم مصلحت کے بیٹے ہو۔“

”ہاں! میں ہر قیمت پر تم سب کی زندگی چاہتا ہوں۔ اور تمہارے ساتھ اپنی

بھی۔“

”بزدل سورما!“ قاسم خان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مثلاً یہ کہ ہم یہاں چھپے رہ کر سندالیوں کی پوری نقل و حرکت کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں اور اپنے لئے کام کا طریقہ کار بھی منتخب کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک پھر۔“

”ہم یہاں خاموشی سے وقت گزاریں گے۔“ رات کو قاسم خان میرے پاس ہی موجود تھا۔ وہ کہنے لگا۔

”ایک بات بتاؤ مجھے شہباز۔“

”پوچھو۔“

”یہ سرخ پتھروں کا کاروبار کیا ماضی میں بھی ہوتا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم تو ماضی میں ہیں۔ سرخ پتھروں کا کاروبار کتنا پرانا ہو سکتا ہے۔ اور ہم ماضی کے کون سے دور میں ہیں۔ کیا تم اس کا تعین کر سکتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ہو سکتا ہے پانچ دس سال پرانی ہی بات ہو۔ بہر حال یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ سیگا کا خیال دل میں تھا لیکن بات وہیں آ جاتی ہے۔ ماضی کی کہانیوں میں تبدیلی کس طرح ممکن ہے۔ کون جانے سیگا کس کیفیت کا شکار ہو گی۔ یہ تو بعد میں ہی پتہ لگ سکتا ہے۔ غالباً اڑتالیس گھنٹے گزر گئے تھے اور اس دوران یہاں ان اطراف میں مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔ یہاں تک کہ جھیل پر کوئی جانور تک پانی پینے نہیں آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب کو ہوشیار کر دیا گیا ہو اور بتا دیا گیا ہو کہ اس طرف نہ جانا۔ ہمیں سیگا کے ساتھ ساتھ ہی ہندانہ کا بھی خیال تھا۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ہندانہ نظر آ جائے۔ سبھی اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ گزرنے والا وقت بے کار جا رہا ہے۔ شاہ رو نے کہا۔

”میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے شہباز۔“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”جتنا وقت ہم یہاں گزار چکے ہیں اور جو یہاں کے حالات ہیں ان کی مطابقت یہاں رکنا اب بے مقصد ہے۔“

”وجہ؟“

”میرے خیال میں اس طرف کوئی نہیں آتا۔“

”لیکن وادی یاقوت تو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”بے شک لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ وہ لوگ نہ جانے کب سے یہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے یقینی طور پر وادی یاقوت میں داخل ہونے کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کر لیا ہو گا۔“ ہم سوچ میں ڈوب گئے۔ قاسم خان نے بھی شاہ رو کی بات کی تائید کی اور کہا۔

”وہ زندگی بھر یہاں نہیں آئے گا۔“

”کون؟“

”میں ہندانہ کی بات کر رہا ہوں۔“

”کیوں شار تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں ابھی کچھ الجھا ہوا ہوں۔ ویسے اس سلسلے میں اگر اب نیا منصوبہ ترتیب دیا جائے تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں سے نکل کر اس علاقے میں چلیں جدھر وہ گھوڑے سوار غائب ہوئے تھے۔“ اس بار قاسم خان نے کہا۔

”یعنی تمہارا مطلب ہے؟“

”میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہاں جائے بغیر ہمیں کامیابی نہیں حاصل ہو گی۔ اس تمام قیام کے دوران آپ لوگوں نے اندازہ لگا لیا ہو گا۔“ میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

”کسی بھی سلسلے میں ایک آدمی کی رائے آخری نہیں ہوتی۔ اور پھر میں لیڈر بھی نہیں بننا چاہتا۔ اگر سب کی رائے ہے تو ٹھیک ہے۔“

”میں بزدلوں کی طرح درختوں کے درمیان بیٹھا دشمنوں کے نشانے پر آنے کا انتظار نہیں کرتا۔ بلکہ آگے بڑھ کر حملہ کرتا ہوں۔“ قاسم خان اکر کر بولا۔ اور میں مسکرا دیا۔ اس کے بعد جب سب کی یہی رائے تھی تو میں بھی بھلا کیوں انکار کرتا۔ چنانچہ ہم جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس دوران ہم باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

”واقعی ہم لوگ ان علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ لیکن ہم نے ایسا عجیب علاقہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“ شاہ رو نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ ہم سب ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے ان چٹانوں کی طرف چل پڑے تھے جنہیں پہلے ہم نے غیر

محفوظ قرار دیا تھا۔ شار کئے لگا۔

”اور ابھی تو نہ جانے کتنے ایسے علاقے ہوں گے جو ان سندالیوں نے تلاش کر لئے ہیں۔ اسی وجہ سے تو وہ اب تک محفوظ طریقے سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ویسے انہیں مقامی بستیوں کا بھی تعاون حاصل ہے۔“

”اصل کام تو یہی ہوتا ہے۔ باہر کے دشمن سے زیادہ اندر کا دشمن خطرناک ہوتا ہے۔ غدار اور لالچی اگر سندالیوں کو موقع فراہم نہ کریں تو ان کی مجال نہیں کہ ہماری بستیوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔“

”ہاں! گھر کے چراغ ہی اپنا گھر پھونک رہے ہیں۔“ شار نے کہا۔

”لیکن یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ آخر بستی کے لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ اپنا ضمیر بچ رہے ہیں۔“ یہ باتیں کرتے ہوئے سب آگے بڑھ رہے تھے میں اور قاسم خان خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ دیکھیں آگے اب کیا ہوتا ہے۔



جس چٹائی سلسلے کی جانب ہم بڑھ رہے تھے وہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے میں یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے عبور کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کی دوسری طرف کیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا یہاں تک کہ شار کو بھی نہیں۔

”کبھی سنا بھی نہیں تم نے اس بارے میں؟“

”سننے والا کون ہوتا۔ ویسے تمہیں خود بھی اندازہ ہو رہا ہو گا شہباز! کہ یہ چڑھائیاں اتنی آسان نہیں۔ عام لوگ ان کے دوسری طرف نہیں جاسکتے۔“

”میرا خیال ہے انہی چٹانوں میں کوئی ایسا راستہ ضرور موجود ہے جو آنے جانے والوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس بات کی تائید کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ گھوڑے سوار یہیں غائب ہوئے تھے۔ ظاہر ہے جب ہم ان چٹانوں پر نہیں چڑھ سکتے تو ان کا چڑھنا بھی آسان نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے ان چٹانوں میں غاروں کے دہانے ہوں۔“

”ہاں اسی کے امکانات ہیں۔ ویسے یہ بات تو طے ہے کہ ان کے آنے جانے کا راستہ کہیں نہ کہیں تو ہو گا۔“

”یہ بات میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہ ان چٹانوں پر چڑھے نہیں تھے۔ اگر چڑھتے تو ہمیں ضرور نظر آتے۔“ شاہ رونے لگا۔

”پھر تو ہمیں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔“

”کونسا؟“

”چٹانوں پر چڑھ کر ہمیں خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ بلکہ ان چٹانوں کے نیچے ہی کوئی راستہ تلاش کرنا چاہئے۔ وہ راستہ قدرتی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

کی بجائے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے مشترکہ انتظام کریں۔“ میں ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اور دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ واقعی وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے بالکل درست تھا۔ جدید و قدیم میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ایک ہی انداز میں سوچا جاتا تھا۔ ایک ہی انداز میں عمل کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی توجہ ان کی باتوں پر لگا دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اور کون کہہ سکتا ہے کہ سرحد پار کے جادوگر کونسا جادو لے کر آئیں اور ہماری ان بستیوں کو اپنے قبضے میں کر لیں۔“

”میں بتاؤں وہ جادو کونسا ہو سکتا ہے؟“ اچانک ہی قاسم خان نے کہا اور سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”حسن کا جادو۔ یہ حسن نازنین لڑکیوں کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور دولت کے انبار کی شکل میں بھی۔ جو لوگ ان کا شکار ہو رہے ہیں وہ یقیناً غربت کے مارے ہوں گے۔“ بہر حال کیا کہا جاسکتا ہے۔ وہ سب اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ لیکن چٹانوں میں ایک ایک رخنہ کا جائزہ لینے کی باوجود ابھی تک وہ راستہ دریافت نہیں ہوا تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ نہ ہی کوئی ذی روح وہاں نظر آیا تھا۔ پھر کسی نے کہا۔

”وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ چٹانیں جہاں سے عبور کرنے کے قاتل ہوں انہیں عبور کر کے دوسری طرف کا راستہ اختیار کیا جائے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ کہاں ہیں ہو سکتا ہے ان کی نگاہیں اب بھی ہمارا جائزہ لے رہی ہوں۔“

”آہ! ہاں وہ..... وہ۔“ اچانک ہی قاسم خان نے ایک طرف اشارہ کیا اور سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سب نے اپنی رائیوں اتار لی تھیں۔ لیکن قاسم خان نے اپنے گھوڑے کو اس دراڑ کی جانب بڑھا دیا تھا جو دور سے نظر آ رہی تھی۔

”کون ہے قاسم خان، رکو، رک جاؤ۔“ میں نے کہا اور قاسم خان نے اشارہ کیا۔

”دراڑ، دراڑ۔“

”کہاں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ ہے اس طرف۔“ قاسم خان اشارہ کر رہا تھا اور آگے بڑھ رہا تھا چند لمحوں

ذہن سندالیوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو۔“ شاہ رو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور قاسم خان شارے سے باتیں کرتا ہوا۔ قاسم خان ایک دلیر آدمی تھا اور کسی بھی وقت خوفزدہ نہیں ہوتا تھا چاہے حالات کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں۔ اس وقت بھی وہ شار کے ساتھ کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ لیکن میں پوری سنجیدگی کے ساتھ سامنے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ چٹانیں بڑی عجیب و غریب تھیں۔ دیکھنے میں تو یوں لگتا تھا جیسے ان کا فاصلہ بہت کم ہو۔ لیکن جب ہم سفر کر کے ان کے قریب پہنچے تو وہ بہت دور ثابت ہوئیں۔ ان کے ارد گرد کی زمین البتہ صاف شفاف تھی اور گھوڑوں کو چلنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ ان تک پہنچتے ہوئے ہمیں کافی وقت صرف ہوا۔ لیکن آخر کار ہم ان چٹانوں تک پہنچ ہی گئے۔ اونچی اونچی چٹانیں سینہ تانے ہمارا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں یہ چٹانیں تو چٹانوں سے زیادہ پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد ہم رکے۔ ہم میں سے ہر شخص ہوشیار تھا اور ذرا سی آہٹ پر چونکا ہو جاتا تھا۔ آخر کار ہم نے پھیل کر وہ راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا جو ہمیں دوسری طرف پہنچا سکے۔ شاہ رو کا خیال تھا کہ وہ کوئی درہ ہو گا یا کوئی دراڑ۔ جسے آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہو۔

”شاہ رو یہ بات تو طے ہے کہ سندالیوں نے ہر علاقے میں ایسے ہی ٹھکانے دریافت کئے ہیں۔ جو برابر کی سرحدوں سے ملتے ہوں اور چٹانی ہوں۔ ہماری سرحدیں انہوں نے بالکل غیر محفوظ کر دی ہیں اور سندالی جہاں سے راستہ ملتا ہے ہماری آبادیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔“

”سرحدیں طویل ہیں اور پہاڑی سلسلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ پتہ چلانا بہت مشکل ہے کہ کہاں کہاں درے ہیں اور کہاں ایسے رخنے موجود ہیں جو سندالیوں کے کام آسکیں۔“

”اصل میں سارا نظام ہی غلط ہے۔ سردار اپنی اپنی بستیوں کو مضبوط کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ بلکہ بستیوں سے زیادہ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ حالانکہ انکی ذمہ داری ہے کہ سرحدی بستیوں کو خاص طور سے حفاظت مہیا کریں۔ اور آپس میں اپنی طاقت بڑھانے اور ایک دوسرے پر رعب ڈالنے

آ جاتی تو ہم کیا کرتے۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہے جو کچھ بھی ہوتا ہے ساتھ ہی ہو گا۔ چنانچہ ہم ایک قطار کی شکل میں چلے آ رہے ہیں۔“

”اور گھوڑے؟“

”گھوڑوں کو اسی طرف چھوڑ دیا گیا ہے اور اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔“ میں خاموش ہو گیا ان لوگوں پر مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ اور پھر قاسم خان نے یہ فیصلہ میری محبت میں کیا تھا اس محبت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہم سب قطار کی شکل میں آگے بڑھنے لگے تھے اور سب نے پیچھے کی طرف مڑ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا کافی دور تک ہم یونہی چلتے رہے۔ یہ شکاف کیا تھا بلکہ اسے ایک سرنگ کہا جاسکتا تھا۔ اور اندازہ یہ تھا کہ یہ سرنگ ہمیں چٹانوں کے دوسری طرف لے جائے گی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے جا کر راستہ بند ہو جائے بہر حال تقدیر کے فیصلے آخری فیصلے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ چلتے رہے شکاف کافی طویل واقع ہوا۔ ہمیں اس کی توقع نہیں تھی۔ اندھیرے میں چلتے چلتے ہم سب تھک گئے۔ پھر قاسم خان نے کہا۔

”اور اگر راستہ بند ہوا تو یقین کرو یہ واپسی بڑی عجیب لگے گی۔“ لیکن کسی نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اور ہم سب خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ لیکن چند لمحات کے بعد شاہ رو بولا۔

”میرا تجربہ کہتا ہے کہ راستہ بند نہیں ہو گا۔ ورنہ جتنا راستہ ہم طے کر چکے ہیں یہ اتنا نہ ہوتا۔“ اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ آگے چل کر یہ شکاف چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو اس کی اطلاع دی اور سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ البتہ اس وقت ہم حیران رہ گئے تھے جب اچانک یہ شکاف ایک غار کے دہانے پر جا کر ختم ہوا۔ یہ لمبی سرنگ ایک عظیم الشان غار میں جا کر نکلی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر ہم سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ غار نہ زیادہ اونچا تھا اور نہ اتنا کہ چٹان کے نشیب میں کہا جائے۔ غار کے دہانے سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں ہمیں یہ احساس دلا رہی تھیں کہ دوسری طرف کھلی جگہ موجود ہے۔

”لیکن یہ راستہ وہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“

کے بعد وہ اس جگہ کے قریب پہنچ گیا جو اسے چٹانی دیواروں میں نظر آئی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ ایک چٹان میں شکاف کی شکل رکھتا تھا میں نے کہا۔

”کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس شکاف کے اندر جانے کا راستہ ہے یا بس یونہی یہ چٹان کسی زلزلے وغیرہ سے پھٹ گئی ہے؟“ شار بولا لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم سب اس جگہ پہنچ گئے۔ شکاف کافی تنگ تھا اتنا کہ ایک آدمی بمشکل تمام اندر داخل ہو سکے۔ لیکن اس سے آنے والی تیز ہوا اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ اس کی کوئی حیثیت ضرور ہے۔ آخر کار ہم لوگ گھوڑوں سے اتر گئے اور اس کے لئے سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

”میں شکاف سے اندر داخل ہو کر صورتحال کا جائزہ لیتا ہوں اور اس کے بعد تمہیں بتاؤں گا۔“ ان سب نے خاموشی سے گردنیں ہلا دی تھیں میں نے اپنے گھوڑے کی لگام قاسم خان کے ہاتھ میں دی اور اس کے بعد شکاف میں داخل ہو گیا۔ اندر سخت اندھیرا تھا۔ دراڑ اتنی تنگ تھی کہ میں بمشکل آگے بڑھ رہا تھا اور یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آگے یہ دراڑ کتنی طویل ہے۔ البتہ راستہ صاف ستھرا تھا اور نوکیلے پتھر وغیرہ نہیں تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ راستہ کہاں جا کر نکلے گا۔ پھر اچانک مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور میں سم کر رک گیا۔ گزیر ہو گئی شاید۔ کہیں راستے سے کوئی اور ایسی جگہ ہے جدھر سے وہ لوگ نکل کر میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ لیکن کیا کیا جاسکتا تھا سوائے اس کے کہ پلٹ کر راتقل سیدھی کر لوں۔ میں نے ایسا کیا ہی تھا کہ قاسم خان کی آواز سنائی دی۔

”نہیں کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو خطرناک ہو۔ یہ ہم ہیں۔“ میں حیران ہو گیا تھا یہ لوگ.... یہ لوگ کیسے آگئے۔ میں نے دل میں سوچا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ قاسم خان نے کہا۔

”ان میں سے کسی کا قصور نہیں ہے۔ میں ہی انہیں لے آیا ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس کیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ باقی لوگوں کی بات میں نہیں جانتا لیکن میں تمہارے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر کے نکلا ہوں۔ اگر تم تنہا ہوتے اور کوئی مشکل پیش

سکیں گے۔ ہم صرف ایک بات جانتے ہیں کہ واقعات جو بھی پیش آئیں ایک ساتھ ہی ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔“ قاسم خان نے کچھ اس طرح ضد کی کہ سب کو ماننا پڑا۔ اور اس کے بعد ہم سب غار کے دہانے کی جانب چل پڑے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم دہانے کے باہر تھے لیکن اس طرف ہم نے جو کچھ بھی دیکھا اس نے ہمیں شدید حیران کر دیا۔ ہم سب منہ پھاڑے کھڑے رہ گئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم کافی بلندی پر کھڑے ہیں اور نیچی نشیب میں بے شمار افراد ایک چٹان کو توڑ رہے ہیں۔ ان کے اوزاروں سے نکلنے والی آواز فضا میں پھیل رہی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں اس منظر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے پیچھے ہٹ گیا کیونکہ نیچے سے ہمیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کام بند ہو گیا۔ ہم نے کچھ سندالیوں کو دیکھا جو ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے ایک بڑی چٹان کی آڑ سے نکلے تھے اور جو لوگ چٹان توڑ رہے تھے انہیں کام بند کرنے کی ہدایت کر کے جدھر سے آئے تھے اودھر ہی چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کی بعد سب کام کرنے والوں نے اپنے اوزار وہیں پھینکے اور پھر ایک پہاڑی غار کی جانب چل پڑے۔ جو سامنے کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں تھا اور اس کا دہانہ کوئی بیس فٹ اونچا تھا۔ لیکن اس دہانے تک پہنچنے کے لئے پتھروں میں بیڑھیاں تراشی گئی تھیں۔ ہم سب یہ تمام منظر سنسنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور پھر ہم پیچھے ہٹ آئے۔ چونکہ یہاں رکنا خطرناک تھا ابھی ہمیں اس تمام صورت حال کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ لوگ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ بہر حال ہم اپنے غار میں داخل ہو گئے۔ اندر پہنچ کر ہم اس سلسلے میں گفتگو کرنے لگے۔

”کیا اندازہ لگایا؟“

”اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو انہوں نے مقامی آدمیوں کو قیدیوں کی حیثیت سے یہاں بند کر رکھا ہے۔ یقینی طور پر کچھ محافظ ان کی نگرانی کرتے ہوں گی۔ انہیں سختی کے ساتھ اس کام پر مجبور کیا جا رہا ہے جو وہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی ہاتھوں میں دے ہوئے کوڑوں سے ہوتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

”لیکن ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں ان کی

میں نے پر خیال انداز میں کہا۔
”ہاں! اگر ایسی بات ہوتی تو ہمیں راستے میں کہیں نہ کہیں ایسے آثار ضرور نظر آتے اس کے علاوہ ایک اور بات۔“ شاہ رو بولا۔
”کیا؟“

”وہ لوگ گھوڑوں سمیت گم ہو جاتے ہیں جبکہ اس تنگ دہانے سے گھوڑا تو گھوڑا ذرا تندرست جسامت کا آدمی بھی نہیں داخل ہو سکتا۔“
”بے شک۔ اگر وہ اپنے گھوڑے یہاں چھوڑ جاتے ہیں تو ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی گھوڑا نظر تو آنا ہی چاہئے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ نیا راستہ ہماری اپنی دریافت ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔“

”لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ ان لوگوں کے پاس کوئی دوسرا راستہ موجود ہے۔“

”اب جو کچھ بھی ہے وہ بعد کی باتیں ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اس غار سے ہم کہاں نکلیں گے۔“ شار نے کہا۔

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد ہم سب غار کے اگلے حصے کی جانب بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں غار کا دوسرا دہانہ نظر آ گیا اور میں نے ان سب کو روکتے ہوئے کہا۔

”کیاں یہاں بھی سب لوگ ایک ساتھ ہی باہر نکلیں گے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے شہباز؟“ شاہ رو نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم سب کو اکٹھے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ بقیہ افراد اندر محفوظ رہیں تو بہتر ہو گا۔ نہ جانے حالات کیا رخ اختیار کریں۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس بار باہر میں جاؤں گا۔“ شاہ رو نے کہا۔

”نہیں میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔“ قاسم خان نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”کوئی ایک آدمی اگر کسی حادثے کا شکار ہو گا تو دوسرے وہ حادثہ برداشت نہیں کر

”کیا فیصلہ کیا؟“

”کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہا ہوں۔ اصل میں اس وقت مجھے بابا دارم کی بات یاد آ رہی ہے۔ شائم نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے ساتھ بہت سے افراد لے لوں۔ لیکن بس یہ خیال تھا میرے دل میں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ لوگوں کو دیکھ لیا جائے اور ہماری تعداد ہمارے لئے عذاب بن جائے۔ لیکن اب ہمارے پاس اتنے افراد نہیں ہیں کہ ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔ کوئی ایسی ترکیب اختیار کرنی پڑے گی جو ہمارے لئے کارآمد ہو۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ شہباز۔“

”ہاں!“

”کیا یہ دوسرے لوگ جو ان آبادیوں کے رہنے والے ہیں اپنی خوشی سے یہ کام کر رہے ہیں۔ یہ سوال میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اگر ہم اپنی دانست میں ان کی مدد کے لئے زندگی کی بازی لگائیں تو کہیں یہ ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور وہ الٹا ہم پر ہی نہ ٹوٹ پڑیں۔“

”بظاہر تو ایسا نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے ہم یہ کام کرتے ہیں کہ میں اور شاہ رو ان لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر نیچے اترتے ہیں اور بہتر راستہ تلاش کر کے اس غار میں داخل ہوتے ہیں جہاں ان لوگوں نے اپنی قیام گاہیں بنا رکھی ہیں۔ اس کی علاوہ قاسم خان تم اور بقیہ افراد بڑی ہوشیاری کے ساتھ نیچے پہنچو۔ کام کرنے والے مہوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں شامل ہو جاؤ کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور ایک یا دو افراد کو یہاں گھوڑنے کی نگرانی کے لئے چھوڑ دو اور پھر ان کے درمیان پہنچ کر تم یہ معلومات حاصل کرو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔“ قاسم خان نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”اور اگر پہچان لئے گئے تو پکڑے جائیں گے۔“

”تھوڑا سا حلیہ تبدیل کرو ان لوگوں کو یہاں سے دیکھ لو وہ جس طرح نظر آ رہے ہیں اس طرح تم لوگ اپنا حلیہ بھی بنا لو اپنے ہتھیار احتیاط سے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپا لو۔ بہر حال قاسم خان میں سمجھتا ہوں تم ان جنگلی سندالیوں کو ضرور

تعداد کتنی ہے ویسے ان کے پاس اسلحے کے انبار ہیں اور یہ بھی ایک خطرناک بات ہے۔“

”میرا خیال ہے رات کو غار میں قیام کیا جائے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کیا ماجرا ہے؟“ بہر حال کسی نے اس خیال کی مخالفت نہیں کی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ این کے جسم تھکن سے چور تھے دوسری بات یہ کہ یہ غار ہی ایک محفوظ ترین جگہ تھی اب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ سندالی یقینی طور پر یہ راستے استعمال نہیں کرتے۔ یا تو وہ ان راستوں سے واقف ہی نہیں ہیں یا اگر واقف بھی ہیں تو کسی وجہ سے انہوں نے ان راستوں کو اختیار نہیں کیا ہے اور ٹھیک بھی تھا۔ ان گہرائیوں میں ان راستوں سے جانا آسان بات نہیں تھی۔ بہر حال ہم نے غار میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اب ذرا محتاط ہو گئے تھے اور باقاعدہ پہرہ دیا گیا تھا۔ لیکن رات آرام سے گزری اور کوئی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا جو ہمارے لئے پریشان کن ہوتا۔ سب سے پہلے میں اور شاہ رو جاگے تھے۔ میری اشارے پر شاہ رو نے سب کو بیدار کر دیا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”آؤ ذرا باہر کا جائزہ لیں۔“ ناشتہ وغیرہ کیا گیا۔ تمام لوگ جاگ چکے تھے۔ سبھی نے اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کیں۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ لیکن اس میں ٹھنڈک تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے باہر نکلے اور ہم نے روشنی میں سارے ماحول کا جائزہ لیا ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھورے رنگ کی چٹانیں کیوں کھودی جا رہی ہیں۔ کہیں کہیں سے چٹانیں بالکل کچی تھیں اور صرف ایک ضرب پر ٹوٹ جاتی تھیں۔ غار کے دہانے سے پتھر توڑنے والے مزدور باہر نکل رہے تھے اور ان کے عقب میں سندالی صاف نظر آتے تھے۔ جو ہتھیاروں سے مسلح تھے اور ان کے ہاتھوں میں کوڑے تھے شام کی نسبت اس وقت صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ سندالیوں نے ان بستیوں کے لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ اور زبردستی ان سے یہ کام لے رہے ہیں۔ بہر حال یہ کام کیا ہے۔ چٹانوں کو کیوں ریزہ ریزہ کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ابھی تک صیغہ راز میں تھی۔ ویسے اس وقت ہم سندالیوں کی تعداد کو زیادہ دیکھ رہے تھے۔ اٹھارہ یا بیس کی تعداد میں یہاں تھے۔ قاسم خان نے مجھ سے کہا۔

متاثر تھا اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ جب وہ کام کرنے پر آتا ہے تو وہ کام بے مثال نوعیت کا حامل ہوتا ہے اس وقت بھی وہ اور اس کے ساتھ شہر کے جو افراد موجود تھے وہ بالکل مقامی نظر آ رہے تھے اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ انہی لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ قاسم خان نے کہا۔

”اور تم مجھے اب کوئی ہدایت نہیں دو گے اب میں جو کچھ کروں گا اپنی صلاحیتوں سے کروں گا جا رہا ہوں، خدا حافظ۔“ وہ چلا گیا، ہم دونوں یعنی میں اور شاہ رو ایک جگہ آ بیٹھے تھے، شہر بھی کچھ اور کام کر رہا تھا یہ اس غار کا ایک بیرونی حصہ تھا اور ہم خاموشی سے یہاں بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے لیکن اچانک ہی ہمیں اپنے بائیں سمت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ہم نے چونک کر ادھر دیکھا، یہ شکل ہمارے لئے بالکل اجنبی تھی اس نے سارے جسم کو سفید لبادے سے ڈھکا ہوا تھا اس کا چہرہ بڑا جاندار تھا آنکھیں تو یوں لگتا تھا جیسے دماغ کی ہڈیاں توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گی لیکن اس کا لہجہ بالکل نرم اور بہت ہی میٹھا تھا اس نے گردن خم کر کے کہا۔

”جب ان پتھریلی وادیوں میں کوئی مسافر آ جاتا ہے تو میرے ننھے پرندے شور مچا کر مجھے اس کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں اور پھر وہ سارے خزانے کھل جاتے ہیں یعنی درخت پھلوں کے انبار لگا دیتے ہیں، میری بکریاں دودھ سے برتن بھر دیتی ہیں معزز مہمانوں بوڑھا سلامہ تمہیں خوش آمدید کہتا ہے اور تمہاری مہمان نوازی کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔“

ہم حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے پھر میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔

”مگر بزرگ سلامہ ہم تو اس سے پہلے تمہیں نہیں دیکھ سکے تھے۔“

”قدرت نے پہاڑوں کی وسعتوں میں اپنے بندوں کے لئے نجانے کیا کیا چھپا دیا ہے ان میں غار در غار ہیں اور انہی میں سے ایک غار میں میں رہتا ہوں آؤ میرے ساتھ آؤ میں تمہاری ضیافت کرنا چاہتا ہوں اور سنو یہاں امن ہے میری اس چھوٹی سی ملکیت میں کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے معزز بزرگ لیکن ہم.....“

”نہیں ان سب کو بلا لوجو تمہارے ساتھ ہیں اور بے فکر رہو میری عمر کا اندازہ لگا

دھوکا دے سکو گے کیا سمجھے؟“

”ٹھیک ہے اگر تمہیں یقین ہے تو میں تمہارے اس یقین پر پورا اتروں گا۔“ قاسم خان نے گردن اکڑا کر کہا۔ ویسے اس شخص کی ذہانت پر مجھے پورا پورا یقین تھا ویسے تو بے وقوفی کی باتیں کرتا تھا لیکن اگر کسی کام کو کرنے کا فیصلہ کر لے تو سچی بات ہے کہ مجھے بھی حیران کر دیا کرتا تھا پھر قاسم خان اپنی تیاریاں کرنے چلا گیا۔ شاہ رو میرے پاس تھا وہ پر خیال نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”کیا بات ہے شاہ رو، کیا تم میرے کئے ہوئے اقدام سے مطمئن نہیں ہو؟“

”یہ بات نہیں ہے شہباز۔“

”میں تمہارے چہرے پر کچھ فکر مندی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔“

”اس کی دو وجوہات ہیں۔“

”کیا؟“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم ہندانہ کا نشان نہیں پاسکے درحقیقت ہندانہ روحانی پیشوا ہے اور اس کی صورت حال بالکل مختلف ہے یعنی وہ اگر سامنے آئے گا تو کسی بڑے انسان کے سامنے آئے گا۔“

”لیکن گہرائیوں میں ہم جو کام کرتے دیکھ رہے ہیں ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ یہاں کھدائی کر کے کچھ تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیا یہ یا قوت کی وادی ہے؟“

”نہیں، جہاں تک میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے وادی یا قوت تو دیوتاؤں کا مسکن ہے وہاں لوگ اس آسانی سے نہیں پہنچ سکتے، یہ تو کوئی اور ہی کارروائی ہو رہی ہے۔“

”ہوں، چلو خیر ٹھیک ہے اب جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو، ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ پھر ہم ایک جگہ جا کر بیٹھ گئے تھے لیکن ہم سب نے ایسا طریقہ کار اختیار کیا تھا کہ کسی کی نگاہوں میں نہ آسکیں بعد میں قاسم خان اپنی تمام تر تیاریاں مکمل کر کے ہم سے رخصت ہونے آ گیا تھا، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں اس کی صلاحیتوں سے بے

”معاف کرنا معزز مہمانو اور ابھی تمہارے لئے قہوہ اور خشک میوے آجاتے ہیں ویسے کیا تم لوگ مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟“

”میرا نام شہباز ہے اور یہ شاہ رو ہے۔“

”بس۔“ بوڑھے نے کہا۔

”کیا اتنا کافی نہیں ہے ہم تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے بزرگ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس پتھریلے ویرانے اور ان پہاڑی پتھروں میں تم کیا کر رہے ہو اور یہاں کیوں رہتے ہو؟“

”اتنی جلدی مناسب نہیں ہوتی جن راستوں سے تم گزر کر آئے ہو وہ کس قدر طویل ہوں گے، کتنی پریشانی اٹھائی ہوگی تم نے، کیا مجھے اندازہ نہیں ہے تمہارا یہ بوڑھا میزبان تمہارے ہر سوال کا جواب گردن خم کر کے دے گا وہ شاید قہوہ آگیا۔“ اور پھر غار کی ایک طرف سے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی جو ایک بڑا سا تھال اٹھائے ہوئے تھی، تھال میں قہوے کے برتن اور خشک میوے کے انبار تھے لیکن لڑکی پر نظر پڑتے ہی میں اور شاہ رو بری طرح چونک پڑے تھے اور ہمارے جسموں میں شدید سنسنی دوڑ گئی تھی۔



رہے ہو اب میری عمر جھوٹ کی نہیں ہے۔ آؤ۔“ وہ واپسی کے لئے پلٹا، میں نے شاہ رو کی صورت دیکھی، شاہ رو خود بھی الجھا ہوا تھا لیکن بوڑھے نے ہمیں کچھ اس انداز میں پیش کش کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ چل پڑے اور وہ ہمیں لئے ہوئے ایک وسیع و عریض غار میں داخل ہوا بلاشبہ ہم نے یہ غار ابھی تک نہیں دیکھا تھا یہ بہت ہی کشادہ ہوا دار اور بہت ہی قیمتی اشیاء سے آراستہ تھا بوڑھے نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

”بیٹھو۔“ ہم دونوں بیٹھ گئے تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا لیکن ہمارے چہرے پر پریشانی کے سائے چھوڑ گیا تھا۔ شاہ رو بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”مجھے تو اس بوڑھے کے لہجے میں مکاری کا احساس ہو رہا ہے، پہلی بات تو یہ کہ اس سے پہلے تو ہم نے اس کا نام و نشان بھی نہیں دیکھا تھا اچانک ہی یہ نمودار ہوا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کون ہو سکتا ہے؟“

”وادی سحر کا کوئی جادوگار، شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ سحر کی اس وادی میں تو جادوگروں کی دنیاں آباد ہیں ہر ایک کا اپنا اپنا جادو ہے ہر ایک نئے نئے جادو کے حربے سیکھتا ہے تاکہ اپنے اقتدار کو قائم رکھ سکے۔“

”لیکن مسئلہ وہی ہے کہ جادوگر ہو یا کوئی بھی ہو سب کے راستے ایک ہی سمت ہوتے ہیں، پہلے سونے کی ڈھیری چمکدار پتھر، کیا سارا جادو دولت کے سامنے بے اثر ہو جاتا ہے؟“

”وہ بات جو تم مجھ سے پوچھ رہے تھے اس کا جواب تم نے خود ہی دے لیا سب سے بڑا جادو دولت ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ دولت ہی ”کالا جادو“ ہے نہ ہو تو انسان کو پاگل کر دے ہو تو وہ خود بخود دیوانہ ہو جائے۔ اس سے بڑا جادو کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟“

”ہاں شاید نہیں۔“

ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ بوڑھا سلامہ واپس آگیا اس نے واپس آ کر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کا تعلق کسی بستی سے ہے؟“

”یہ پورا علاقہ ایک بستی ہے، اور یہ بستی میری ملکیت ہے کیا سمجھے؟ اور درحقیقت یہ وادی یا قوت ہے۔ تمہاری دنیا میں ایک ہیرے کا نام سنا ہے اسے ”کوہ نور“ کہا جاتا ہے، یہ ایک اعزازی نام ہے لیکن وادی سحر میں جب تم شعلوں کی بلندی دیکھو گے تو یقین نہیں کر پاؤ گے کہ کوہ نور کتنی روشنی دیتا ہے شاید تمہیں بھی معلوم نہ ہو لیکن یا قوت کی وادی میں سلگنے والی آگ تمہارے تصور سے بھی کئی گنا زیادہ ہو گی۔“

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کے لہجے میں کچھ حقارت سی ہے میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نے میرا ساتھ نہ دیا آواز میرے منہ سے نکل ہی نہ سکی تھی میرا ذہن سوچ سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا لیکن آواز، میری آواز کو کیا ہو گیا، میرا پورا بدن ساکت تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا جسم مفلوج ہو رہا ہو، لیکن دماغ اور آنکھیں مکمل طور پر بہتر حالت میں تھیں میں نے شاہ رو کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن وہ بھی میری ہی طرح ہو گیا تھا بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے کہا۔

”ہاں سلامہ کو سلامہ نہ کہنا چاہو تو ہندانہ کہہ لو، کیا سمجھے۔ اب تم مکمل طور پر میرے قبضے میں ہو اور تم مجھے وہ سب کچھ بتاؤ گے جو تمہاری سمجھ میں اب تک نہیں آیا ہو گا، کیا سمجھے، تم میرے اشارے پر گردش کرو گے صرف میرے اشارے پر، اس وقت تم میری مٹھی میں ہو میں چاہوں تو ابھی تمہیں ہلاک کر دوں لیکن ایسا نہیں ہو گا تمہیں کسی نے میرے لئے حاصل کیا تھا لیکن وہ ہندانہ کی قوت سے واقفیت حاصل کئے بغیر ہندانہ کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا، غلطی اس کی ہے میری نہیں تو اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ یہ جو تمہارے ساتھ ہے اسے میں جانتا ہوں، شاہ رو ہے اس کا نام، ہماری ہی آبادیوں کا ہے اس لئے ہمارے لئے پریشانی کا باعث نہیں، مگر اجنبی دنیا سے آنے والے تم اپنی کہانی سناؤ یہ نہ سمجھو کہ تم سے واقف ہوئے بغیر میں نے تم پر ہاتھ ڈالا ہے نہیں ایسا نہیں، بالکل ایسا نہیں ہے، تمہارے بارے میں تو میں نے اپنے تمام آدمیوں کو لگا دیا ہے اور آخر کار وہ تمہیں گھیر کر یہاں تک لے ہی آئے، تمہاری زبان کو حکم دیتا ہوں میں کہ میرے سامنے کھلے، تم سے سوال کرتا ہوں میں، جواب دو، کیا تم

وہ سیگا تھی، ہماری نگاہیں بھلا کیا دھوکا کھا سکتی تھیں، میں نے سیگا کو دیکھا پھر شاہ رو کی طرف دیکھا اور اس کے بعد سیگا کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا اس نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں نہیں دیکھا تھا اور نظریں جھکائے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھی، میں نے محسوس کیا کہ اس کا سارا رنگ و روپ اس ویران علاقے میں اڑ چکا ہے چہرے پر گہری بنجیدگی اور اداسی چھائی ہوئی ہے پھر اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا ایک لمحے کے لئے اس کے بدن میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی لیکن دوسرے لمحے اس نے پھر نگاہیں جھکا لیں اس وقت سلامہ کی آواز سنائی دی۔

”مہمانوں کو احترام کے ساتھ قہوہ پیش کرو۔“ سیگا نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا، میں نے اب اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا میں نے کہا۔

”کیا آپ ہمارے ساتھ قہوہ نہیں پیئیں گے بزرگ؟“

”تمہارے آنے سے پہلے میں پی چکا ہوں اور پھر میں میزبان ہوں، لڑکی تم جاؤ۔“ اس نے سیگا سے کہا اور سیگا مشینی انداز میں چلتی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ بہترین قہوہ ملا تھا اور مجھ سے زیادہ شاہ رو کو پسند آیا تھا، شاہ رو مصروف ہو گیا لیکن میرے ذہن میں سیگا گردش کر رہی تھی، میں نے نجانے کیا کیا سوچا تھا اس کے بارے میں، اس کا مطلب تھا کہ سیگا یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے وقت گزار رہی ہے، بوڑھا سلامہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا پتہ نہیں شاہ رو اس وقت کیا سوچ رہا تھا لیکن اس وقت میں بدستور سرد ہا، ہندانہ، لنگوٹا اور ان تمام پر اسرار کرداروں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو یہاں وادی سحر میں آکر مجھے ملے تھے، کیا عجیب بات ہے پھر قہوہ ختم ہو گیا، تو میں نے کہا۔

”آپ نے اپنے بارے میں بتایا نہیں بزرگ۔“

”وقت تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتا دے گا نوجوان۔“

ہے؟ وہ کہاں گیا؟“ میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا اس نے مجھ سے پھر پوچھا۔
”وہ دوسرا کہاں گیا؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“

”خیر مجھے اس کی پرواہ نہیں، میں لکھنا کا یہ آخری طلسم بھی توڑنا چاہتا ہوں، آؤ میرے ساتھ آؤ۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ وہ آسمانی دیوتا جو سرخ پتھروں کی شکل میں شعلے اگلے ہیں کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، چلو میرے ساتھ ایک سفر کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

میری اور شاہ رو کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ ہم کچھ کہہ بھی نہیں سکے، ہم تو اس کے سحر میں گرفتار تھے۔ وادی سحر کا ساحر اپنا عمل کر رہا تھا اور ہم صرف اس کے عمل کے زیر اثر اس کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے اس وقت میں قاسم خان کے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شار اس کے ساتھ تھا باقی افراد بھی موجود تھے لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے، بے بس اور بے کس تھے ہم اور یوں اس کے احکامات کے مطابق گھوڑوں کا سفر طے کر کے ہم ایک نامعلوم وادی کی سمت چل پڑے۔

بوڑھا ہندانہ جس کے بارے میں شانم نے بتایا تھا کہ درحقیقت شیروں کا شیر تھا گھوڑے کی پشت پر وہ جس طرح سفر کر رہا تھا بڑے بڑے جوان ایسا نہیں کر سکتے تھے میرا سوچنے والا ذہن سوچ رہا تھا کہ اگر یہ کہانی ماضی سے تعلق رکھتی ہی تو ماضی میں اس کا انجام کیا ہوا تھا اور مجھے جو کچھ کرنا ہے اس کا حال سے کیا تعلق ہو گا، یہ سوچنے ہی سے ایک انوکھا سحر دماغ پر طاری ہو جاتا تھا اور یہی اس کہانی کا سب سے پریشان کن پہلو تھا۔ بے بسی کے جو لمحات اس وقت مجھ پر طاری تھے وہ کچھ عجیب سے تھے اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قدر کمزور نہیں پایا، قاسم خان تو خیر کئی بار ان سارے معاملات سے اپنے آپ کو بیزار ظاہر کر چکا تھا لیکن اب میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آخر کب تک یہ سب کچھ میرے لئے مصیبت بنا رہے گا، ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے ان مشکلات کی انتہا کب ہو گی لیکن بہر حال جس طرح میں ان لوگوں کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا اس کے بعد اپنے طور پر کوئی فیصلہ کئے جانا تو ایک مشکل ہی کام تھا۔ حالات سے سمجھوتہ تو کرنا ہی پڑتا، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وادی سحر کا

جواب دو گئے؟“ اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر سے اس کی بات کا جواب نکل رہا ہے میں نے کہا۔
”ہاں!“

”کون تھا جس نے تمہیں میرے خلاف کام کرنے پر آمادہ کیا؟“

”پروفیسر لکھونا۔“ جواب میں ہندانہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

”پروفیسر وادہ، خوب..... خوب..... خوب، چلو ٹھیک ہے تمہاری دنیا میں جا کر وہ پروفیسر بن گیا، جبکہ اس دنیا میں کسی پروفیسر کا وجود نہیں ہوتا، وہ اپنے آپ کو ان آبادیوں کا سب سے بڑا جادوگر سمجھتا تھا لیکن ایک بار..... ایک بار وہ ان پہاڑوں سے دور ایک اور دنیا کی طرف نکل آیا میں نے اس کی مہمان نوازی کی اور اس کے بعد بات علم پر چلی گئی، میں نے اس سے کہا کہ میں اپنی آبادیوں کا سب سے بڑا جادوگر ہوں لیکن امن پسند ہوں اور اگر میں چاہوں تو ان آبادیوں پر بھی قبضہ کر سکتا ہوں جو سرخ یا قوت کی وادی ہے، کہنے لگا، کہ سرخ یا قوت چمکدار پتھر نہیں بلکہ آسمانی دیوتا ہیں جو رات کی تاریکیوں میں وادی میں گردش کرتے ہیں، میں نے کہا کہ لکھونا ان پتھروں میں سے کچھ پتھر خراج کے طور پر مجھے دو تاکہ تمہارے لئے حفاظت کا بندوبست ہو سکے لیکن اس نے حقارت سے مجھ پر اپنا عمل دوہرایا اور میرے آدھے جسم کو پتھر کا جسم بنا دیا پھر وہ یہاں واپس چلا آیا لیکن بے قوف نے سوچا تھا کہ بہت بڑا جادوگر ہے وہ، میں نے اپنی اصلیت واپس کر لی اس کے بعد میں یہاں واپس آ گیا پھر میں نے یہاں سندالیہ آباد کیا ان کے سینے میں، میں نے ایک خنجر گاڑا اور وہ تڑپ کر رہ گئے، سندالی اصل میں اجنبی آبادیوں کے لوگ تھے جنہوں نے آہستہ آہستہ یہاں اپنا اقتدار قائم کیا اور اس حد تک پہنچ گئے کہ آخر کار یہ سب کچھ ہمارے قبضے میں آنے لگا۔ بہت کچھ ختم کر دیا میں نے، بہت کچھ ختم کر دیا، لیکن لکھونا نے وہی عمل دوہرایا اس نے اپنے طلسم کے تحت اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دیا اپنے جسم کو اس نے زیر زمین کر دیا اور خود اس جسم سے آزادی پا کر میرے خلاف عمل کی تلاش میں نکل گیا، اپنی وادیوں میں تو اسے کوئی نہ ملا جو میرے خلاف کام کر کے کامیاب ہو سکتا، باہر کی دنیا سے تم دو بے وقوف اسے حاصل ہو گئے اور وہ تمہیں یہاں لے آیا، ارے ہاں وہ دوسرا کہاں

”دیکھا یہ دیوتاؤں کی وادی ہے اس کی گہرائیوں میں یا قوت جگمگا رہے ہیں کس کی مجال ہے جو اس وادی میں جھانک کر دیکھے کہ وہاں دیوتا متحرک ہیں لیکن میرے دوستو وہ دیوتا نہیں ہیں پکندار پتھر ہیں۔ ہیرے ہیں اور وہ صدیوں سے بیکار پڑے ہیں ان بستیوں کے رہنے والے اسحق ہیں کہ ان ہیروں کی اصلیت کو نہیں جانتے دیکھنا تم دیکھنا آخر کار سندالی اس وادی پر قابض ہوں گے اور اس کے بعد ہم ایک نئی دنیا تعمیر کریں گے ایک حسین دنیا، ایک انوکھی دنیا، دیکھو متحرک دیوتا آگ اگل رہے ہیں، آگ کے دیوتا، ہیروں کے دیوتا، وادی کے دیوتا۔“ ہندانہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

”لیکن اصل دیوتا کو تم بھول گئے ہندانہ، آؤ ذرا اصل دیوتا سے ملو۔“ اچانک ہی پتھر کی چٹان کے پیچھے سے ایک آواز ابھری اور میں حیرت سے اچھل پڑا، ہم سب ہی چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے، ہندانہ خود بھی حیران رہ گیا، اس نے پلٹ کر کہا۔

”یہ الفاظ کس نے کہے؟“

”ان میں سے کسی نے نہیں جو تمہارے ساتھ تھے۔“ آواز دوبارہ ابھری اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا، یہ آواز قاسم خان کے علاوہ کسی اور کی نہیں تھی، ہندانہ اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گیا لیکن اچانک ہی فائر کی ایک آواز ہوئی اور ہندانہ کی پنڈلی ٹوٹ گئی وہ اوندھے منہ نیچے آگرا تھا اس نے پنڈلی پر اپنا ہاتھ رکھا، پنڈلی سے خون ابل رہا تھا اور شاید اس کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی قاسم خان کے ساتھ شار اور اس کے ساتھی بھی تھے، میرے حلق سے مسرت بھری چیخ نکل گئی۔

”ہاں، میں اس دیوتا کے پٹھے کو سمجھنا چاہتا تھا کہ آگ کے دیوتا نیچے وادی میں ہیں بلکہ یہ میرے ہاتھ میں ہیں یہ زور سے بھونکتے ہیں اور پنڈلی کی ہڈی میں سوراخ کر دیتے ہیں، میرا خیال ہے کہ مجھے اس کی دوسری ٹانگ کو بھی سہلا دینا چاہیے۔“ قاسم خان کا تو نشانہ تھا ہی بہت اچھا اس کی دوسری گولی نے ہندانہ کی دوسری ٹانگ چاٹ لی تھی، لیکن ہندانہ بھی کمال کی چیز تھا وہ چیخا نہیں تھا اس نے دوسرا ہاتھ دوسری پنڈلی پر رکھ لیا اب وہ خاموش تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے قاسم خان کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

”آہ غلطی ہو گئی، بیشک غلطی ہو گئی۔“

ساحر ہندانہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے اور اب اس کے سحر سے آزادی حاصل کرنا ایک مشکل کام ہے، سفر جاری رہا اور اس کے بعد ہم ایک ایسے عجیب و غریب پہاڑی سلسلے کے پاس پہنچ گئے جسے صرف کہانی یا خوابوں میں ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک پیالہ نما وادی تھی اور اس تک پہنچنا انتہائی دشوار گزار تھا۔ اور ہم جس وقت وہاں پہنچے تھے سورج ڈوب چکا تھا تاریکیاں ابھر آئی تھیں اس وقت ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہندانہ اپنے سفر کا اختتام کر چکا ہے ہم ہندانہ کے اشارے پر ایک جگہ رک گئے اس جگہ کے بارے میں تو شاہ رو بھی نہیں جانتا تھا پتہ نہیں ہندانہ کیا کرنا چاہتا ہے اس نے یا قوت کی وادی کے بارے میں کہا تھا لیکن ہیروں کی یہ وادی کہاں تھی اور کس جگہ پر تھی؟ اس کے بارے میں کم از کم مجھے تو نہیں معلوم تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ شاہ رو کو بھی نہیں معلوم، ہندانہ نے وہاں قیام کرنے کے بعد بالکل دوستانہ انداز میں ہم لوگوں کے ساتھ کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا اسے اپنی قوتوں پر یقین تھا اور پھر خاصی رات ہو گئی آرام کے دوران شاہ رو نے مجھ سے کہا۔

”شہباز کیا تم بھی اپنے آپ کو میری طرح مایوس اور بددل پاتے ہو؟“

”ایسا تو نہیں ہے لیکن مجھے سیگا پر حیرت ہے وہ کیا کر رہی ہے؟“

”جس طرح ہم اس کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں بیچاری سیگا بھی اس سحر کا شکار ہے۔“

”ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن اب ہو گا کیا؟“

”دیکھو یہ ہمیں وادی یا قوت تک لے جا رہا ہے دیکھیں وادی یا قوت کا سفر کتنا طویل ہے ہم اس طرح کی باتیں کرتے رہے لیکن پھر اچانک ہی چاند نکلا اور جیسے ہی روشنی کی لکیریں سیدھی ہوئیں اچانک ہی اس پیالہ نما وادی میں آگ بھڑک اٹھی۔ سرخ روشنی کا ایسا طوفان اٹھا کہ ہم سب سہم کر رہ گئے یہ طوفان اس وادی سے بلند ہوا تھا رور دیکھنے والی آنکھ اس حسین نظارے کو دیکھ کر کچھ اور دوبارہ دیکھنے کی توقع نہیں کر سکتی تھی، پیالہ نما وادی کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے لیکن آگ کی تپش کے بجائے ان سے ٹھنڈک پھوٹ رہی تھی ہم سب حیران ہو کر کھڑے ہو گئے اور ہندانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہندانہ بالکل معذور ہو چکا ہے اس کا سحر اس کی تکلیف میں ڈوب گیا تھا اور ہم سب اس کی قوتوں سے آزاد ہو گئے تھے یہاں تک کہ سیگا بھی ایسا ہی نظر آتی تھی، قاسم خان ایک بے رحم انسان تھا اس نے ہندانہ کے لمبے بال پکڑے اور اسے گھسیٹا ہوا پیالہ نما وادی کے آخری کنارے تک لے گیا، یہی کیفیت اس کے ساتھ آنے والوں نے دوسروں کے ساتھ کی تھی، ہندانہ نے یہاں پہنچ کر پہلی بار لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اگر تو میری جاں بخشی کر دے تو میں تجھے.....“ لیکن قاسم خان جو انتہائی بیزار آدمی تھا اس کی پوری بات سننے سے پہلے ہی مصروف عمل ہو گیا اور پھر ہندانہ کی چیخ ایک لکیر بناتی ہوئی دیوتاؤں کے قدموں کی جانب چل پڑی یعنی وادی سحر کی اس پیالہ نما وادی میں ایک گوشت کے لوتھڑے کا اضافہ ہوا جو ہزاروں فٹ کی اس بلندی سے نیچے جا کر گرا تھا اور یہ کیفیت اسی کی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھی بھی اس وادی میں جا کر ہیروں کو سرخ خون بخشے لگے تھے، سیگا کے چرے پر خوشی کے آثار تھے اس نے کہا۔

”اور اب تمہیں وادی سحر کے اصل ظلم سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔ میرا ساتھ دو گے یا میرا مذاق اڑاؤ گے۔“

”نہیں سیگا ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔“

”تو پھر آؤ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر ادھر چلو جہاں میں تمہاری رہنمائی کروں اور اطمینان رکھو، زمین چھوٹی ہو جائے گی اور فاصلے طویل نہیں ہوں گے، لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

”نہیں سیگا، ہم تم پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔“ قاسم خان نے البتہ غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

”اب بھی کیا تم مجھ پر اپنا تسلط جماؤ گے؟“

”نہیں قاسم خان، میں تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں اپنی بات کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ شاہ رو ہے، شار اگر میرے ساتھ جانا چاہے تو وہ بھی جاسکتا ہے، میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔“ قاسم خان نے میری طرف دیکھا پھر بولا۔

”اور جب تم میری کسی بات پر بے بسی سے گردن ہلا کر مجھے اپنی مرضی میں آزاد

”اور تمہارے ساتھیوں نے اگر کوئی اور غلطی کی تو..... تو.....“ اچانک ہی قاسم خان نے ہاتھ اٹھایا، ہندانہ کے ساتھ آنے والے جو واقعی کچھ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جینیں مار مار کر اپنی جگہ سے گرنے لگے اور ہندانہ زور سے دھاڑا۔

”کچھ مت کرو کتے کے بچو..... کچھ مت کرو کتے کی موت مارے جاؤ گے۔“ لیکن وہ کتے کی موت مارے جا چکے تھے، قاسم خان خود بھی شاید ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خواہش مند تھا بہر حال ہم سب ساکت کھڑے ہوئے تھے، سیگا آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے شانوں سے شانہ ملاتے ہوئے میرے پاس کھڑی ہو گئی، اس نے منہ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کا اس طرح میرے پاس آ کر کھڑے ہو جانا اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ اس کے لئے میرے دل میں کیا جگہ ہے، بہر حال میں نے بھی اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا اور پھر قاسم خان کی کارروائی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اس وقت قاسم خان نے اپنے آپ کو اس سچویشن کا ہیرو ظاہر کر دیا تھا اور ویسے بھی یہ حقیقت تھی کہ میں خلوص دل سے یہ بات تسلیم کرتا تھا کہ قاسم خان نے جب بھی کوئی قدم اٹھایا تھا مکمل کا قدم اٹھایا تھا، اور واقعی اس کی وجہ سے ہمیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی پھر قاسم خان نے کہا۔

”ہاں، سندالیوں کے سربراہ میں تجھے ایک بات بتاؤں بہت بڑا کام ہو رہا ہے وہ چٹائیں جو مزدور توڑ رہے تھے اور جنہیں تو اپنے ایک اہم مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا اب نہیں توڑی جا رہیں، بلکہ مزدور تیری کمائیاں لے کر ساری بستیوں کی جانب چل پڑے ہیں وہ بستی کے نمائندوں کو بتائیں گے کہ ہندانہ سندالیوں کو ان کے شہروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد اس علاقے میں خوفناک خونریزی ہو گی سارے انتظامات کر ڈالے ہیں ہم نے اور تیرے لئے ایک بہترین جگہ بھی منتخب کر لی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو تم اگر سندالیوں کو اقتدار مل گیا تو اس کی سربراہی تمہیں دی جاسکتی ہے میرے نائب کی حیثیت سے تم دونوں یہاں سندالیہ پر حکومت کر سکتے ہو، عظیم سندالیہ، عظیم وادی سحر۔“

”ہاں، ہم تمہارے نائب کی حیثیت سے یہاں حکومت کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہمیں یہ حکومت پسند نہیں، تمہارے لئے جو جگہ منتخب کی گئی ہے، دیکھنا چاہتے ہو؟“

چھوڑ دیتے ہو تو مجھے بڑا ہی لطف آتا ہے، تم لوگ سمجھ رہے ہو نا ایک حکمران جب اپنے دور اقتدار میں کسی کو کوئی اجازت دیتا ہے تو اسے کیا محسوس ہوتا ہے بھلا اس بات کو تم کیا سمجھو، لیکن یہ شخص شاید اسے میں زندگی کے آخری سانس تک نہ چھوڑ سکوں۔“ اور اس کے بعد ہم سب گھوڑوں پر بیٹھ کر سیگا کی رہنمائی میں چل پڑے تھے۔

وہیے تو اب تک وادی سحر میں جو کچھ دیکھا تھا وہ سب ہی ناقابل یقین تھا، ہمارے تصورات، ہمارے خیالات ہماری دنیا سے بالکل مختلف، نہ سمجھ میں آنے والا، لیکن یہ پہاڑ تو بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خواب ہی کا کوئی حصہ ہو ایک ایسی چٹان جو ایک اڑدے کے منہ کا ڈیزائن رکھتی تھی، کھلا ہوا منہ، جس کے نچلے حصے میں پتھر کی میڑھیاں بنی ہوئی تھیں سیاہ رنگ کا یہ پتھر ”سنگ موسیٰ“ تھا اور پہاڑی بھی ”سنگ موسیٰ“ کا پہاڑ تھا کالا، دیکھنے کے قابل ہم نے اپنے گھوڑے پیس چھوڑے تھے اور سیگا نے کہا تھا۔

”یہ عظیم خانقاہ لنگونا کی ہے اور لنگونا کے بارے میں تمہیں سب کچھ بعد میں بتاؤں گی۔“

اس نام کو سن کر میں نے قاسم خان کو اور قاسم خان نے مجھ کو دیکھا تھا لیکن ہم نے لنگونا سے اپنی واقفیت کا اظہار نہیں کیا تھا البتہ اپنے گھوڑے وہیں چھوڑ کر ”سنگ موسیٰ“ کی میڑھیاں طے کر کے جب ہم اڑدے کے منہ میں داخل ہوئے اور سرنگ نما جگہ سے گزر کر اڑدے کے پیٹ میں پہنچے تو وہاں ہم نے ایک عجیب و غریب ماحول دیکھا، سیاہ سنگی خانقاہ بڑی پروقار لگ رہی تھی اس کے درمیان ایک تخت پر لنگونا بیٹھا ہوا تھا ایک انتہائی برگ اور برتر شخصیت کے روپ میں، اور ہم اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے، شار، شاہ رو اور اس کے ساتھی، میں اور قاسم خان اور سیگا ہم سب لنگونا کے تخت کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے تو پروفیسر لنگونا نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے اور قاسم خان کو دیکھا پھر بولا۔

”پیارے بچو آخر کار وہی ہوا جس کی پیشگوئی میرے صدیوں پہلے کر دی تھی، بہت پہلے میں نے کہا تھا کہ ہندانہ تو اپنے جادو کو، اپنے علم کو آگ کے ہتھیاروں میں منتقل کر دے، بے شک تو وقت سے بہت پہلے جادو کے دھماکے ایجاد کر لے اور آگ

کی موت چاروں طرف پھیلا دے لیکن ایک دن ایسا ہی ہو گا کہ تجھے اپنے نپاک ارادوں کے ساتھ اپنے انہی آفتیں ہتھیاروں سے مرنا ہو گا، آخر کار وہ وقت آگیا نا اور دیکھ لو کہ ہندانہ دیوتاؤں کی وادی میں جاسویا، حقیقت یہ ہے شہباز اور قاسم خان کہ بہت برس پہلی ماضی میں ایک واقعہ پیش آیا تھا میں لنگوتا بستی کے رہنے والوں کا ادنیٰ سا خادم تھا ان کا وچ ڈاکٹر، میں جڑی بوٹیوں سے ان کا علاج کیا کرتا تھا چھوٹا سا علم تھا میرے پاس اور میں نے اپنے علم کو اپنی بستی، اپنی آبادیوں میں رہنے والوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا، میں بڑا جادوگر بن کر یہاں حکمرانی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے علم کے ذریعے ایک لمبی زندگی ضرور حاصل کر لی تھی پھر ہندانہ جو ہم ہی میں سے ایک تھا سندالیوں کے پاس جا پہنچا جو پہاڑوں کے دوسری جانب رہتے تھے، چالاک سندالیوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ہماری ان آبادیوں میں دیوتاؤں کی ایک آبادی ہے اور اس میں جب دیوتا رقص کرتے ہیں تو آگ کے شعلے بلند ہو جاتے ہیں اس وادی میں بڑے بڑے پتھر ہیں جنہیں سندالی یا قوت کہتے تھے اور ہندانہ نے انہیں بتایا کہ وادی میں یا قوت کے انبار ہیں، لیکن دیوتاؤں کے مال پر کوئی قبضہ جما سکا ہے وہاں تو دیوتا رہتے ہیں لیکن سندالی ان ہیروں کے لالچ میں ہندانہ کے ساتھ ساتھ بہ کثرت یہاں آ کر آباد ہو گئے اور انہوں نے اس بستی کو نحوست کی بستی بنانا شروع کر دیا، ہندانہ کو وہاں پجاری مان لیا گیا اور سازشیں ہونے لگیں، ہندانہ اپنے علم کے ذریعے بستی والوں کو پریشان کرنے لگا اور سندالی اس کے ساتھ تھے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے رہنے والے چالاک سندالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور پھر میں اس دنیا کی تلاش میں چل پڑا جہاں سندالیوں سے زیادہ ذہین لوگ رہتے ہیں، سندالی تو ماضی کے لوگ تھے میں مستقبل کے لوگوں کی تلاش میں نکل گیا اور تم دونوں جس قدر ذہین تھے اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سندالیوں کے مقابلے کے لئے تم سے موزوں اور کوئی نہیں ہے بہت سے افراد کالم کر رہے تھے میرے لئے لیکن وہ سب عقل و دانش میں تم جیسے نہ تھے اور سینگا میری بیٹی میری بچی تو نے دیکھا کہ وہی ہوا جو میں نے تجھ سے کہا تھا، قاسم خان اور شہباز، خبردار واپس مڑ کر دوبارہ وادی سحر میں داخل مت ہونا، بلکہ وہ نے جو ایک سوراخ نظر آ رہا ہے اس میں سیدھے چلے جانا اور آگے جو بھی ہو خود

اس کا نظارہ کرنا، جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو میرے بچو ہم تو ماضی کے لوگ ہیں ہمیں ماضی میں ہی واپس لوٹنا ہے تمہاری دنیا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، کیا سمجھے۔ تو اب رب عظیم سے تمہارے لئے دعاؤں کی التجا سے ہم اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں، لنگوتا نے دونوں ہاتھ اٹھائے، میں اور قاسم خان حیرت سے اسے دیکھتے رہے، ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا پورا وجود پتھرتا جا رہا ہو، پھر اس میں ہلکی ہلکی سفیدی دوڑنے لگی اور اس کے بعد کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کا سارا وجود سانپ کی شکل میں بکھر گیا ایک ایسا ناقابل یقین واقعہ پیش آیا جسے دیکھ کر فوراً اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے اب لنگوتا کی جگہ سفید سفید راکھ اڑ رہی تھی، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مڑ کر قاسم خان کو دیکھا لیکن قاسم خان کی نگاہیں ان سب کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جو اب سفید پڑتے جا رہے تھے اور ان کے جسموں میں زندگی کی رمت نہیں تھی۔ یعنی سینگا، شاہ رو، شار اور وہ تمام لوگ جو اس وقت اس انوکھے غار یعنی اژدہ کے پیٹ میں موجود تھے، تیز ہواؤں کے جھونکے ان سب کو منتشر کر رہے تھے اور اب وہ ماضی کی کہانی بن گئے تھے یعنی فرش پر بکھری ہوئی راکھ، میرا دل چاہا کہ چھین مارتا ہوا بھاگ نکلوں، قاسم خان نے دہشت زدہ ہو کر میرا بازو پکڑ لیا اور بولا۔

”کیا یہ..... کیا یہ سب سچ ہے؟“

”آؤ۔“ میں نے قاسم خان کا ہاتھ پکڑا لیکن لنگوتا کے کہنے کے مطابق پیچھے جانے کے بجائے میں آگے کی سمت بڑھا تھا اور بڑھتا ہی چلا گیا تھا، ہم دونوں دہشت زدہ انداز میں دوڑ رہے تھے یہاں تک کے سانپ کے پیٹ کے آخری حصے میں ہمیں ایک دروازہ نظر آیا، میں نے دروازہ بے تحاشا کھولا تھا دوسری جانب روشنی تھی اور شاید آپ لوگ اسے ایک کہانی سمجھیں، حقیقت نہ سمجھیں، اختراع پردازی سمجھیں، دروازے کی دوسری جانب وہی مکان تھا جس مکان میں ہماری آخری ملاقات پروفیسر لنگوتا سے ہوئی تھی اور ہم اس مکان کے اس دروازے کی دوسری جانب کھڑے تھے جس دروازے سے داخل ہو کر ہم وادی سحر میں پہنچے تھے، قاسم خان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس کہانی کو خاصا وقت گزر چکا تھا لیکن آج بھی میں اور قاسم خان ماضی کے ان واقعات کو یاد کرتے ہیں تو اپنی

ہمیں خود ہنسی آتی ہے۔ وہ سب ایک خواب نہیں تھا آپ جو قسم چاہے ہم سے لے لیں اور پھر خواب یوں بھی نہیں ہو سکتا کہ اس مکان میں جو دولت تھی اور جس کا وعدہ ہم سے لکھونا نے کیا تھا وہ ہماری ہے، ہم لوگوں نے ایک عظیم الشان فیکٹری لگائی ہوئی ہے شادیاں کر لی ہیں، لیکن ایلا، ایرا، سیگا اور وہ ساری لڑکیاں آج بھی جب ہمیں یاد آتی ہیں تو ہمارے دلوں میں ایک کسک سی اٹھ جاتی ہے لیکن ہم نے اس کسک کا اظہار آج تک اپنی بیویوں سے نہیں کیا کیونکہ اس کے بعد مستقبل خطرے میں پڑ جاتا۔

ختم شد

